www.iqbalkalmati.blogspot.com

المیزان

شخصیت

کے

عناصر

اور

ان کا

توازن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

المیزان

مصنّف: رائد افضل

مدیر: یوسف مرزا

سرورق: محمد مدثر

طبع اوّل: January 2008 ، محرم ۱٤۲۹ ھجری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست

۱۔	انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی	۱
۲۔	ذہن کے حدود کار	۸
۳۔	سیکھنا	۱۵
۴۔	مشاہدہ	۲۳
۵۔	تجزیہ	۳۴
۶۔	نتیجہ	۵۱
۷۔	حلقۂ ذہن کی خرابیاں	۶۴
۸۔	حلقۂ قلب	۷۰
۹۔	لذت	۸۰
۱۰۔	غم	۹۷
۱۱۔	اُمیّد	۱۰۹
۱۲۔	خوف	۱۲۱
۱۳۔	انعام	۱۳۵
۱۴۔	رغبتیں	۱۴۶
۱۵۔	جبلی رغبتیں	۱۵۴
۱۶۔	مادی رغبتیں	۱۷۰
۱۷۔	معاشرتی رغبتیں	۱۸۴
۱۸۔	دل ودماغ	۱۹۶
۱۹۔	انسانی ماڈل	۲۱۱
۲۰۔	انسانی ماڈل کے محرکات	۲۱۹
۲۱۔	ابدی جنگ	۲۲۹
۲۲۔	انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ	۲۳۹
۲۳۔	ضمیمہ جات	۲۵۱

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیباچہ

البرٹ کی عمر تقریبا 30 سال تھی۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم، دراز قد اور بھرپور قوت۔ لیکن اُس کی سب سے اہم خوبی تھی اُس کے بھاگنے کی صلاحیت جس کا وہ اکثر مظاہرہ کرتا تھا۔ ٹیکساس (امریکہ) کے کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے ذہنی معذوروں کے اسکول میں اپنے گھر سے بھاگنا البرٹ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا جب وہ اپنے گھر کا دروازہ زور سے کھول کر پچھلی طرف سے جھیل کے کنارے مین ہائی وے پر پہنچنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہاں پر ذہنی معذورین کی تربیت پر مامور تین لوگوں میں سے دو خواتین تھیں اِس لیے چھ فٹ لمبے قوی ہیکل فرد کے پیچھے بھاگنے کا قرعہ ہمیشہ مرد کے نام ہی نکلتا اور وہ مرد تھا میں۔ اب مقابلہ سادہ مگر محنت طلب تھا: البرٹ کو مین ہائی وے پر پہنچنے سے پہلے روکنا۔ ہائی وے پر پہنچنے کا مطلب تھا البرٹ کا سامنا بڑے ٹرک سے، جو یقینی طور پر اُس کی موت کا سبب بنتا۔ اب یہ ایک معمول تھا۔ زوردار آواز کے ساتھ دروازے کا کھُلنا، البرٹ کا بھاگنا، لوگوں کا پردے ہٹا کر اُسے سرپٹ دوڑتے دیکھنا اور پھر میرا تعاقب۔

کوئی چھ ماہ بعد میں اپنے سانس کو قابو کرنے کے قابل ہوا تو جذبات اور سوچ قابو میں آنا شروع ہوئے۔ تب مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہوا۔ میں البرٹ کو مین ہائی وے پر پہنچنے سے پہلے کیسے جا لیتا ہوں۔ اُسکی بھاگنے کی صلاحیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی لہذا ایسا ناممکن تھا۔

اب کی بار البرٹ بھاگا تو میں نے اُس کا بغور مطالعہ کیا۔ اُسے راستہ ازبر تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ کنکھیوں سے بار بار مجھے دیکھ رہا تھا اور اپنی رفتار کو میری رفتار سے ایڈجسٹ کر رہا تھا۔ میں نے اپنے اس مشاہدے کو نتیجے میں ڈھالنے کا فیصلہ کیا اور اپنی رفتار اور کم کر لی۔ البرٹ نے بھی رفتار کم کی میں نے اور کم کر دی البرٹ نے بھی یہی کیا۔ کرتے کرتے ہم مین ہائی وے تک پہنچ گئے۔ البرٹ وہاں پہنچ کر رک گیا۔ سامنے سے تیز رفتار ٹرک گزر رہے تھے اور عام تاثر یہی تھا کہ البرٹ جس دن ہائی وے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا وہ اُس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں غالباً کوئی پندرہ قدم پیچھے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اگر اُس نے چند قدم اور بڑھائے تو یہ اوپر اور میں جیل میں۔ اور ذمہ داری پوری نہ کرنے پر جو سزا ملے گی وہ بڑھاپے میں جا کر ہی ختم ہوگی۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ البرٹ سر جھکائے واپس مڑا میرے پاس آیا۔ گردن میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ کا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا مجھے واپس لے چلو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تب مجھے احساس ہوا کہ البرٹ یہ سب کچھ توجہ حاصل کرنے کیلئے کرتا ہے۔تب سے مجھے یہ احساس ہورہا ہے کہ ہم اور البرٹ میں کچھ فرق ہے تو وہ توجہ حاصل کرنے کے طریقہ کار کا ہے۔ہم سب توجہ چاہتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

خدا کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء اور کتب اس ''بہت کچھ'' چاہنے کا علاج بتاتے ہیں۔اِس علاج کو جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم انسانی شخصیت کو پہچان لیں۔لہٰذا یہ کتاب انسانی شخصیت کا ماڈل پیش کرتی ہے۔ایسا ماڈل جو آج سے پہلے اتنی تفصیل سے کسی اور جگہ دستیاب نہیں۔اِس کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ کو وہ سب کچھ معلوم ہوگا جو خود کو بہتر بنانے اور دوسروں کو بہتر کرنے کیلئے ضروری ہے۔

خودشناسی کے شوقین اور دوسروں کی ذات کے تانے بانے بننے والے،ان صفحات میں وہ معلومات پائیں گے جو آج سے پہلے،اس انداز اور تحقیقی پس منظر کے ساتھ،اُن کی نظر سے نہ گزری ہوں گی۔تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد کے لیے واضح اہداف جن کی مدد سے تعلیم کو بہتر پیرائے میں ڈھالا جا سکے،اور نفسیاتی مسائل حل کرنے والوں کے لئے علاج کا ایک بہتر لائحۂ عمل پیش کیا گیا ہے۔مذہب، سائنس،طب اور نفسیات کی رنگین پٹیوں میں لپٹی یہ تحقیق وہ مقام ہے جہاں زندگی ایک خوشگوار موڑ مڑتی ہے۔

رائد افضل

یکم محرم الحرام ١٤٢٩ھ

١١ جنوری ٢٠٠٨ء

مقدمہ

شاید یہ کتاب دنیا کی واحد کتاب ہو جس کا مقدمہ آپ خود لکھیں گے۔ اس کتاب کو پڑھیے۔ اپنی زندگی اور آس پاس کے لوگوں کے حالات پر غور کیجئے اور اس کتاب کا مقدمہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱. انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی

انسانی شخصیت دو حصوں پر مشتمل ہے انہیں حصے کہنا شاید مناسب نہ ہو کیونکہ اِن دونوں کے دائرۂ کار ایک پیچیدہ نظام کے ذریعہ ایک دوسرے سے مربوط ہونے کے باوجود آزادانہ طور پر بھی محوِ عمل رہتے ہیں۔ یہ دو حصے دماغ اور دل ہیں جو خودمختار بھی ہیں اور ایک دوسرے کے محتاج بھی۔ انسانی شخصیت کو کرۂ ارض تصور کر لیا جائے اور اِس کرۂ ارض پر دو خودمختار مملکتیں قائم ہوں جو مادی وسائل پر برابر تصرف رکھتی ہوں۔ دونوں کی کرنسی، دفاع اور طرزِ حکومت الگ الگ ہو لیکن ایک مملکت تیل کے لیے اور دوسری لوہے کے لیے ایک دوسرے کی محتاج ہو تو اُن کا رشتہ دل و دماغ کی مانند ہوگا۔ انسان کی شخصیت کے ارتقاء میں یہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج رہتے ہیں۔ دماغ کے پاس دیکھنے، سننے اور خیالات کو تشکیل دینے کی صلاحیت ہے تو جذبوں کے خزانہ پر دل کی عملداری ہے۔ دل کے جذبہ کی کارفرمائی کے بغیر دماغ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی عمل سے قاصر رہتا ہے۔

لیکن یہ تو امن کے زمانہ کی باتیں ہیں دو ممالک میں جنگ بھی ہو سکتی ہے اور جب جنگ ہوتی ہے تو اِس کا نتیجہ ایک کی شکست اور دوسرے کی فتح ہو سکتا ہے۔ انسانی شخصیت میں بگاڑ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب دل و دماغ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں۔ ایسے میں دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے پر حاوی ہو جائے۔ اور مغلوب ہونے والا بے چوں و چرا غالب آنے والے کی بات مانے۔ یہ صورتِ حال خطرناک ہوتی ہے ایک کے غلبے کا مطلب ہے توازن کا بگڑنا اور باہمی تعلق میں اعتدال کا قائم نہ رہنا۔ ایسا ہوتے ہی شخصیت میں ایک تبدیلی آتی ہے جو عام طور پر تباہ کن ہوتی ہے۔

انسانی شخصیت کے دونوں اجزائے ترکیبی ایک دوسرے پر نہ صرف اعتماد کرتے ہیں بلکہ مسلسل ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اچھی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے ایک دوسرے پر انحصار کی نوعیت اور طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ اِس کے لیے یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کون کس طرح دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔

بنیادی طور پر تو دل دماغ کو مثبت طور پر کچھ کرنے کا جذبہ مہیا کرتا ہے اور خوف کے زیرِ اثر کچھ نہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مثلاً کسی محفل میں جانے کی خواہش دل کے جذبہ سے عمل میں ڈھلتی ہے جبکہ آگ کا خوف بھی دل کی تحریک کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اگر دل میں آگ کا خوف یا محفل میں جانے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی

کی خواہش موجود ہو لیکن دماغ محفل میں جانے کا طریقہ یا آگ سے بچنے کی تدبیر اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے تو خواہش اور خوف کے باوجود کچھ نہیں ہو سکتا۔ اِس کے برعکس محفل میں جانے کے تمام وسائل میسر ہوتے ہوئے بھی اگر خواہش مضبوط نہ ہو تو انسان گھر میں پڑا رہتا ہے۔ یہی صورت حال آگ سے بچنے کی ہے۔ اگر انسان سخت مایوسی کا شکار ہو اور آگ اِس کرب سے نجات پانے کا ذریعہ محسوس ہو تو دل میں آگ کا خوف نہیں بلکہ اُس میں کُود جانے کی خواہش پیدا ہو گی۔ انسان باہر نکلنے کا راستہ جانتے ہوئے بھی خود کو آگ کی نذر کر دے گا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ عام انسان اپنے دل و دماغ کے درمیان ہونے والے رابطوں کی ہیئت اور اثر پذیری کو اچھی طرح جان سکتا ہے۔ اِس کے لیے آپ آئے دن پیش آنے والے واقعات کو باری باری ذہن میں لائیں۔ پھر ہر ایک کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب دیں۔

پہلا سوال آپ کی ذہنی صلاحیت سے متعلق ہے۔ اِس سے یہ پتا چلے گا کہ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات پر آپ کس طرح اثر انداز ہو سکتے تھے۔

سوال ۱: کیا اِس صورت حال میں آپ کے کرنے کو کچھ تھا؟ یعنی آپ کچھ سیکھ سکتے تھے یا عملی طور پر کچھ کر سکتے تھے؟

مثال کے طور پر آپ کے دفتر یا گھر میں کوئی فرد زخمی ہو گیا، خون بہنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں اُس کی موت واقع ہو جائے گی۔ آپ چاہتے ہیں کہ مدد کریں لیکن تمام خواہش اور ہمدردی کے باوجود آپ کچھ نہ کر سکے۔ آخر کار دفتر یا گھر سے دوسرے فرد نے آ کر خون روکنے میں مدد کی۔ عام زندگی میں یہ صورتحال اُن لوگوں کے ساتھ پیش آتی ہے جن کو اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ اُس پوزیشن کے اہل نہ تھے مگر قسمت نے اُنہیں اُس کرسی پر بٹھا دیا۔ یا یہ کہ اُن کے گھر میں ایک نئی ٹیکنالوجی آئی اور وہ اُس مفید چیز کو بہتر طور پر استعمال کرنے کے قابل نہیں تھے۔

دوسرا سوال آپ کے دل سے متعلق ہے۔ کسی ایک واقعہ کو سامنے رکھیں پھر اُس سوال کا جواب دیں۔

سوال ۲: کیا آپ کے پاس اُس صورتحال میں کچھ کرنے کی صلاحیت تھی لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا؟

یعنی کہ آپ جانتے تھے کہ اُس فرد کا خون کیسے بند کیا جا سکتا تھا لیکن آپ ایک مٹینگ میں جا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے تھے، دیر ہو رہی تھی اِس لیے آپ اُس فرد کو کسی اور کے حوالے کر کے چلے گئے۔ راستے میں آپ کو خیال آتا رہا کہ اُس فرد کی مدد کرنا ضروری تھا لیکن آپ کے دل نے آپ کو مطمئن کر دیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اتنی بڑی دنیا ہے کوئی نا کوئی تو مدد کر ہی دے گا۔ آپ یہ سوال پیش آنے والے بہت سے واقعات کے بارے میں کر سکتے ہیں۔ وہ واقعات جو آپ کی ذات، آپ کے خاندان یا آپ کے دفتر اور پڑوس سے متعلق ہوں۔ دل و دماغ سے متعلق کچھ سوال اور ہیں جن کی مدد سے آپ جان سکتے ہیں کہ کسی سے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ کن صورتوں میں آپ کے جذبات غالب آجاتے ہیں اور دماغ کے مشورے کو قبول نہیں کرتے؟ کن صورتوں میں آپ توازن قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں؟

بعض لوگ رات رات بھر کسی دوست کی مدد کے لیے گھر سے باہر رہ سکتے ہیں۔ اُن کا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ اُن کا دوست تکلیف میں ہو اور وہ گھر جا کر سو جائیں۔ لیکن اپنے گھر میں اُن کی بیوی بچے کو شدید بخار کی حالت میں ہسپتال لے کر جائے گی اور وہ فقط زبانی مدد یا کسی ڈاکٹر کو فون کرنے پر اکتفا کریں گے۔ بیوی کی رات آنکھوں میں کٹ جائے گی اور وہ خود صبح دفتر جانے کا بہانہ بنا کر نیند کے مزے لیتے رہیں گے۔ ایک دوست کے لیے رات بھر تڑپنے والا شخص اپنے بچے اور بیوی سے یوں بے تعلق ہو، یہ کیسے ممکن ہے؟

اِسی طرح مغربی دنیا میں لوگ میڈیا پر اندھا یقین رکھتے ہیں اور دنیا جہان کے اہم مسائل و معاملات کی تحقیق کئے بغیر ایک رائے قائم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن سے براہِ راست اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی اُن کے ذاتی مفاد پر کوئی ضرب پڑتی ہے۔ لیکن اگر کسی کا اپنا ادارہ جہاں وہ کام کرتا ہے ہدفِ تنقید ہو تو پھر آپ اُسی فرد کو دیکھیں وہ کمپنی کے دوسرے افراد سے مشورہ بھی کرے گا، کتابیں بھی پڑھے گا تاکہ ادارے کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر لے اور اپنی رائے قائم کرنے کے لیے اپنا ذہن کماحقہٗ استعمال کر سکے۔ کسی مسئلہ سے جذباتی وابستگی یا عدم دلچسپی کا انحصار اُس کی اہمیت، نوعیت اور حیثیت پر ہوتا ہے۔ وہ مسئلہ ذاتی، معاشرتی، قومی یا بین الاقوامی نوعیت کا ہوگا۔ ذاتی مسائل ہماری ترجیحات میں سرِ فہرست ہوتے ہیں۔ معاشرتی یا قومی مسائل ثانوی اہمیت رکھتے ہیں اور بین الاقوامی کی حیثیت واجبی سی ہوتی ہے۔ بین الاقوامی مسائل کے لیے ہم سرسری طور پر ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کو حرفِ آخر سمجھ لیتے ہیں اور اُن کی تجزیاتی رائے کو من و عن قبول کر لیتے ہیں۔ قومی اور معاشرتی معاملات میں بھی ہمارا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی

روبیہ کم وبیش یہی ہوتا ہےلیکن ذاتی مسائل ہماری راتوں کی نیند حرام کردیتے ہیں اور جب تک ہمیں اُن کا موزوں حل نظرنہیں آتا ہم اپنی تمام ذہنی اور جذباتی توانائیاں اُن کے لیے وقف کیے رکھتے ہیں۔ظاہر ہے معدودے چندلوگ اِس کلیہ سے مستثنیٰ ہوسکتے ہیں جو بین الاقوامی اور قومی مسائل پر بھی سنجیدگی سے غور کرتے ہیں اور تمام حقائق کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن نے دل کو''سوچنے کا آلہ'' کہا ہے۔کیونکہ دل ودماغ کی جنگ میں بیشتر اوقات دل ہی حاوی ہوجاتا ہے۔ پھر دل ہی دماغ کے لیے لائحۂ عمل مرتب کرتا ہےاور دماغ اپنے سونگھنے، دیکھنے، سننے اور چُھونے کی صلاحیتیں دل کی رضا کے مطابق استعمال کرتا ہے۔اِس میں یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ اِس مسئلے پر غیر جانبدارانہ تحقیق کی مزید ضرورت ہے یا یہ کہ ابھی معلومات کے کئی دوسرے ذرائع موجود ہیں۔کیا آپ کے ساتھ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صلاحیت اور وسائل دستیاب ہونے کے باوجود آپ کسی کام کوانجام دینے پر آمادہ نہیں ہو پاتے؟ یا آپ کسی ایک مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غورنہیں کرسکتے؟ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ دل ودماغ کا باہمی توازن زیروزبر ہوگیا ہے اِس کا علاج جاننے کے لیےضروری ہے کہ ہم دماغ اور دل کی کارکردگی کوالگ الگ سمجھیں۔

دل ودماغ میں سے کسی ایک کے حاوی ہوجانے سے اِن دونوں کی نشوونما کا عمل رک جاتا ہے۔اِن کی صحت کا دارومدار ایک دوسرے پر ہے۔جوں ہی اِن میں سے کوئی ایک (عام طور پر دل) دوسرے پر حاوی ہوجائے تو مغلوب ہونے والے کی ترقی تو رُکتی ہی ہے اِس کے ساتھ دوسرا بھی زیادہ دن صحت مندنہیں رہتا اور اِس کی حالت بھی خراب ہونا شروع ہوجاتی ہے۔مثلاً دل کے حاوی ہونے کی صورت میں دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اِس کا کام سب سے پہلے تو دل کے اِرادوں اور خواہشات کا تنقیدی جائزہ لیناتھا۔مغلوب ہونے کے بعد دماغ، دل میں پیدا ہونے والے کسی جذبہ پر انگلی اٹھانے کے قابل نہیں رہتا اور بے چون وچرا ہر حکم مانتا جاتا ہے۔دماغ کی یہ روش دل کومزید باغی کردیتی ہے۔ اُس پر کسی قسم کی قدغن نہیں رہتی۔سارانظام طوفانوں کی زد میں ہوتا ہےاور یکے بعددیگرے یہ سلسلہ چل نکلتا ہے کیونکہ اِن کوروکنے کے لیے جو بند تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔آخر کار یہ طوفان دل کوبھی مفلوج کردیتے ہیں جس کا نتیجہ تباہی کے سوااور کچھ نہیں ہوسکتا۔

یہ بات شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ ۱۹۷۰ء تک مغربی ماہرین نفسیات دل ودماغ میں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی

صرف دماغ کو فعّال قوت تسلیم کرتے تھے جو انسان کے پورے تحریکی نظام کو منضبط کرتی تھی۔ اور دل کا کام خون کی گردش کا فریضہ انجام دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جب جذباتی مسائل کی فراوانی اور پیچیدگی میں شدید اضافہ ہوا تو جذبات کے مرکز کی تلاش ہوئی یوں دل کو جذبات کا مرکز تسلیم کیا گیا آج مغربی ماہرین دل کو فعالیت اور اثر انگیزی میں دماغ سے زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں (بعض کے نزدیک تین گُنا)۔ ظاہر ہے کہ جب دل کی استعدادِ کار کو ہی تسلیم نہیں کیا گیا تھا تو دل و دماغ کے تقابلی جائزے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد مغربی دنیا میں انسانی شخصیت کے ارتقاء میں دل کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو علمِ نفسیات میں اِس کے مقام کا تعیّن کیا جانے لگا۔ آج بہت سے ماہرین گوناگوں نفسیاتی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے دل و دماغ کی سحر کاریوں پر یکساں طور پر ایمان رکھتے ہیں۔

دوسری طرف شاعری نے نہ صرف دل کے وجود کو تسلیم کیا بلکہ نظامِ زندگی کی ترتیب و تدوین میں دل کی برتری اور فوقیت کو ثابت کر دیا ہے۔ اِس موضوع پر غالبؔ کا زندۂ جاوید شعر دیکھیے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے؟

دل کی نادانیوں کا خمیازہ انسان کو ذہنی، جذباتی اور جسمانی امراض کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ جو اکثر لاعلاج ثابت ہوتے ہیں۔

اقبالؔ نے تو دل و دماغ کے درمیان ایک خوبصورت نظم کی صورت میں تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ''عقل و دل'' نامی اِس نظم میں شاعر نے دماغ اور دل کی متنوّع خصوصیات پر جامع تبصرہ قلمبند کیا ہے۔ عقل دعویٰ کرتی ہے کہ وہ:

''بھولے بھٹکے کی رہنما ہے، اُس کا گزر فلک پر ہوتا ہے، وہ راہبری کرتی ہے،
کتاب کا علم اُس کے پاس ہے''۔

دل اِس کے جواب میں کہتا ہے کہ وہ:

''تخیل کی طاقت رکھتا ہے، اندرون کی دنیا کا علم اُس کے پاس ہے، معرفت تک اُس کی رسائی ہے،
علم سے پیدا ہونے والے امراض کا علاج وہی کر سکتا ہے، آسمان سے پرے اڑنے کی صلاحیت بھی
اُسی میں ہے۔ بلکہ وہی ربِ جلیل کا عرش ہے''۔

انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی

جذباتِ لطیف کی شدّت کا مرکز دل ہے جو نتائج کی پروا کیے بغیر خطرات مول لینے کا عادی ہے۔ دل جب حد اعتدال سے تجاوز کرتا ہے تو مصلحت کیش دماغ اُسے باز رکھنے کے لیے نفع وضرر کی فلسفیانہ زنجیریں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ عشق دل کی نمائندگی کرتا ہے اور عقل دماغ کی۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل تھی محو تماشائے لبِ بام ابھی

روزِ ازل سے آج تک اِس جہانِ آب وگل مے جتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے ہیں وہ دل کے زندہ ہو جانے کے مرہونِ منت ہیں۔ اِسی لیے اقبالؔ نے دماغ کی فطری پاسبانی سے کبھی کبھی دل کی آزادی کو ضروری سمجھا ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

دل اوردماغ کے مثبت تعلق کی اہمیت

اگر غور کیا جائے تو اسلام کی تمام عبادات کا مقصد دل و دماغ کے درمیان رابطہ اور تعاون کو بہتر بنانا ہے۔ نماز کو ہی لیجیے۔ سب سے پہلے تو ہم نماز میں ہاتھ باندھ کر دل و دماغ کا رشتہ باقی جسم سے توڑ دیتے ہیں۔ انسانی جسم میں دل و دماغ کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے دو حصّے ہیں جن پر زندگی کے مادی وجود کا انحصار ہے۔ لیکن دن میں ۵ مرتبہ اُن سے ناتا ٹوٹ جائے تو جبلی حیوانی خواہشات کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اُن میں سے پہلا ہمارا پیٹ ہے جو اَن گنت دنیاوی لذتوں کا محرک ہے۔ دوسرا مرکز ہے ہماری شرم گاہ جو ہر قسم کے جنسی اور شہوانی مطالبات کا باعث ہے۔ ہاتھ باندھ کر ہم پیٹ اور جنس کے تقاضوں سے کچھ دیر کے لیے مامون ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ باندھتے وقت ہم یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے دل و دماغ کو باقی جسم سے الگ کر کے اِن دونوں کی روحانی تربیت کا اہتمام کرنا ہے۔ دل و دماغ کی تربیت کا یہ عمل ایک طرح سے بچوں کے کھیل See-Saw کی طرح ہے جس میں پہلے دماغ اُوپر ہوتا ہے اور دل نیچے پھر دونوں برابر آجاتے ہیں اور آخر میں دل کو اُوپر جانے کا موقع ملتا ہے۔ اِس عمل کے دوران فاتحہ پڑھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی شخصیت کے اجزائے ترکیبی

جاتی ہے اور قرآن کی قرأت ہوتی ہے۔ قرأت کے دوران دماغ اُوپر رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کو پہنچنا تو دل تک ہے لیکن اِس کا سفر دماغ کی راہ سے ہو کر جانا چاہیے۔ یعنی قرآن کا فہم ضروری ہے۔ اِسی لیے دماغ قرأت کے دوران افضل حالت میں ہوتا ہے۔ رکوع میں پہنچ کر دل و دماغ ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ یہ نماز کی واحد حالت ہے جہاں دل و دماغ ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔ لیکن سجدے کی حالت میں دل دماغ سے اُوپر چلا جاتا ہے۔ اگلی رکعت میں یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور یوں انسان دل و دماغ کو مرحلہ وار مختلف حالتوں میں لا کر اِن کے رابطہ کو مضبوط کرتا رہتا ہے۔ اقبالؔ نے روحانی ارتقاء اور مادی لذّات کا موازنہ کرتے ہوئے کیا خوبصورت بات کہہ دی ہے۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

تمام روحانی، دینی، نفسیاتی، عمرانی اور مابعد الطبیعاتی علوم دل کو ایک فعّال قوت کی حیثیت سے تسلیم کرتے آئے ہیں لیکن میڈیکل سائنس کے نزدیک دل صرف ایک آلہ ہے جس کا مقصد خون کو پمپ کرنے کے سِوا کچھ نہیں۔ وہ اِسے جذبات کا مرکز مان لینے میں اب بھی متامّل ہے حالانکہ میڈیکل سائنس نے جو مصنوعی دل بنائے اور لوگوں کے سینوں میں پیوست کئے تھے وہ بہت بری طرح ناکام ہو چکے ہیں کیونکہ اِن میں وہ فطری صلاحیتیں مفقود تھیں جو قدرتی دل میں خالقِ کائنات نے ودیعت کر رکھی ہیں۔ اِسی لیے اب مریض کو دل کی تبدیلی کے لیے ''اصلی'' دل کے دستیاب ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب میڈیکل سائنس بھی انسان کے سینہ میں محبوس گوشت کے اِس لوتھڑے کی معجزاتی صلاحیتوں پر ایمان لانے پر مجبور ہو جائے گی اور دماغ سے منسوب کئے جانے والے بہت سے افعال دل کے کاندھوں کی زینت بنا دیے جائیں گے۔ ویسے بھی خوشی، غم، غصہ، خوف، محبت اور نفرت جیسے جذبات جب برانگیختہ ہوتے ہیں تو سب سے پہلے دورانِ خون کا نظام متاثر ہوتا ہے اور دورانِ خون میں نظم و ضبط پیدا کرنے کا کام ازلی طور پر دل کے سپرد ہے۔

۲.   ذہن کے حدودِ کار

انسانی ذہن ۲۰۰ بلین خلیوں پر مشتمل ایک نہایت پیچیدہ مشین ہے۔ انسانی ذہن کو اگر جدید کمپیوٹر کی شکل دے دی جائے تو وہ کئی لاکھ مربع کلومیٹر پر محیط ہوگا۔ دنیا میں کوئی دوسری قدرتی یا انسان کی بنائی ہوئی مشین انسانی دماغ کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ دو کام تو انسان ایسے کرتا ہے جو کوئی ذی روح کبھی نہیں کرسکتا۔

سب سے پہلے تو زبان ہے جو انسان کے پاس اظہار کا منفرد ذریعہ ہے۔ یہ صلاحیت مخلوقات میں سے کسی اور کے پاس نہیں۔ گرامر کا استعمال، صحیح الفاظ کا چناؤ اور ایک عبارت کو شروع سے آخر تک مربوط کرنے کی صلاحیت صرف انسانی ذہن کا کارنامہ ہے۔ ذہن کی گہرائی میں لاشعوری طور پر انسان کی زبان وجود میں آتی ہے۔ یہ زبان وہ فطری طور پر اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔ صرف سننے سے ایک بچہ اپنی مادری زبان کے الفاظ اپنے دماغ کے لاشعور میں جذب کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اِن الفاظ کو بولنا شروع کردیتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ پڑھنے کے قابل بھی ہوجاتا ہے اور پھر یہ سلسلہ لکھنے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے یوں زبان سیکھنے کا فطری عمل مکمل ہوتا ہے۔ انسانی زبان کی گرامر ایک پیچیدہ فن ہے۔ گرامر کو تخلیق ہونے میں کئی صدیاں لگی ہیں۔ لیکن انسانی دماغ دو سے تین سال کے عرصے میں ایک زبان کو صدیوں میں مکمل ہونے والی گرامر کے ساتھ آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔

اِس سے بھی حیرت انگیز کام لکھنا ہے۔ اول تو لکھنے میں تحریر کا انعکاس دماغ میں تخلیق ہونا ضروری ہے دوسری دلچسپ بات لکھنے کے حوالے سے ہمارے انگوٹھے کا استعمال ہے۔ لکھتے وقت بنیادی کردار انگوٹھے کا ہوتا ہے۔ تحریر کا وجود انسانی انگوٹھے کے X-axis اور Y-axis پر چلنے کی وجہ سے تشکیل پاتا ہے۔ انگوٹھے کو آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلانے کے لیے جس استعداد یا مہارت کی ضرورت ہے وہ صرف انسانی دماغ میں پائی جاتی ہے۔ یعنی تحریر کا وجود میں آنا دماغ کی اعلیٰ صلاحیت ہے جو صرف انسان کو عطا کی گئی ہے۔ اِس حقیقت کو سمجھنے کے بعد قرآن میں قلم کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اصل اہمیت اِس دماغ کی ہے جسے قلم کو استعمال کرنے کا ملکہ بخشا گیا ہے۔

بولنے اور لکھنے سے بڑھ کر دماغ کی صلاحیتوں کا مرکز وہ حصہ ہے جسے Frontal Lobe کہا جاتا ہے۔ یہ انسان کی پیشانی کے بالکل پیچھے اور کنپٹیوں کے درمیان واقع ہے، یہ دو بنیادی کام سرانجام دیتا ہے۔ اول تو Frontal Lobe کے بائیں حصہ میں حقائق اور معلومات جمع کرنے اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ انسانی دماغ یہ سارے حقائق اپنے اردگرد ہونے والے واقعات و مشاہدات سے جمع کرتا ہے۔ اور تصدیق شدہ حقائق و معلومات Frontal Lobe کے دائیں حصہ کو منتقل کردیتا ہے جہاں اُن کی بنیاد پر مربوط تخیلاتی تصویر بنتی ہے جو مستقبل کی منصوبہ بندی کے کام آتی ہے۔ مثلاً پچھلے سال کی تیز بارش نے علاقے میں تباہی پھیلائی تھی۔ اِس دفعہ برسات کا موسم آتے ہی علاقے کے لوگوں نے منصوبہ بندی شروع کردی اور ماضی کے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں مستقبل کی تیاری کرلی۔ اِس کے لیے پہلے سیکھنا، پھر سوچنا اور پھر اِس پر عمل کرنا دماغ کا کام ہے۔

انسان پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے یہی Frontal Lobe اہم رول ادا کرتا ہے۔ انسان دیکھتا ہے کہ اللہ نے قوموں کو اُن کے بُرے اعمال کی پاداش میں نشانِ عبرت بنادیا۔ اللہ بچّے میں روح ڈالتا ہے اور پودے کو بیج سے پیدا کرتا ہے یہ روزمرہ کے مسلمہ حقائق ہیں۔ انسانی دماغ اِن حقائق کی بنیاد پر آگے کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ اپنے Frontal Lobe کے دائیں حصہ میں اِن حقائق کو Feed کرنے کے بعد مستقبل کے بارے میں ایک تخیلاتی سوچ مرتّب کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کرتا آرہا ہے اور وہ اُسے بھی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اِس طرح انسانی دماغ ماضی سے مستقبل کا سفر طے کرتا ہے۔ قرآن میں پیش کیے ہوئے موت، قیامت اور جنت و جہنم کے مناظر اُس کے تخیل کی آنکھ دیکھنا شروع کرتی ہے۔ یہ تخیل جتنا زیادہ حقائق پر مبنی ہوتا ہے اتنا ہی واضح اور مضبوط ہوتا ہے۔ مثلاً وہ فرد جس نے کائنات کا بغور مشاہدہ کیا ہو۔ بچّے کی پیدائش سے لے کر پودوں کی نشوونما تک کے بارے میں معلومات اخذ کی ہوں۔ آخرت، جنت اور جہنم کا بہتر اِدراک کرسکتا ہے۔ اِس لیے ایک عالم کا مقام ایک زاہد سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔ عالم نے کائنات کا معروضی مشاہدہ کیا ہوتا ہے جس کی بدولت اُس کے ذہن میں عالمِ آخرت کی بہتر اور واضح صورت اجاگر ہوتی ہے اور اُس کا عقیدہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ مختلف ادوار میں جن غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا ہے اُن کی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مختلف دنیاوی علوم میں مہارت رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ صرف پیدائشی مسلمان ہی ہیں جو آج بھی دینی اور دنیاوی لحاظ سے جہالت اور گمراہی کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں حالانکہ دینِ حق کا فہم اور علم کا حصول مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے۔

ہم نے دیکھا کہ انسانی ذہن پہلے سیکھتا ہے پھر تصور کو جنم دیتا ہے اور تیسرے مرحلہ میں اُس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذہن کے حدودِ کار

تصور کی مدد سے عمل کی جانب بڑھتا اور کچھ کر کے دکھاتا ہے۔ یہاں دماغ کے بارے میں کچھ اور حقائق واضح کرنا ضروری ہیں۔ Frontal Lobe کے علاوہ انسانی دماغ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اِن تین حصوں میں سب سے نیچے کا دماغ Reptile Brain کہلاتا ہے۔ یہ دماغ کا وہ حصہ ہے جہاں خوف اور دکھ بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں جہاں انسان اپنی جبلتوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ جہاں پر انسانی ذہن خوراک، جنسی لذت، انتقام اور فرار کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ یہ دماغ انسانوں، مویشیوں اور ریپٹائلز تینوں میں پایا جاتا ہے۔ ریپٹائلز میں تو صرف یہی دماغ ہوتا ہے۔ اِس لیے دماغ کے اِس حصہ پر غور کرنے کے لیے ہمیں ریپٹائلز کو ایک نظر دیکھنا ہوگا۔ ہم دو اہم ریپٹائلز پر غور کرتے ہیں ایک سانپ اور دوسرا مگرمچھ۔ یہ ریپٹائلز صرف اپنا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔ اُنہیں آپ چاہے کتنا ہی عرصہ کیوں نہ پال لیں اور کتنا ہی پیار دے لیں یہ کبھی بھی دل سے آپ کو مالک تسلیم نہیں کریں گے اور موقع پاتے ہی آپ پر مہلک وار کر دیں گے۔ دونوں کا طریقۂ واردات مختلف ہو سکتا ہے۔ سانپ تو اپنے جسم کی پھرتی اور چھپ کر وار کرنے کی صلاحیت کا فائدہ اٹھائے گا۔ اُس کی کوشش ہوگی کہ آخری وقت تک سامنے آ کر مقابلہ کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اپنی ذات کا تحفظ اُس کے لیے اتنا اہم ہے کہ وہ وار کرنے سے پہلے لحہ بھر کو بھی نہیں سوچتا کہ کس پر وار کر رہا ہے۔ مشہور ہے کہ اژدھا جب کھا کھا کر بہت بڑا ہو جاتا ہے اور رینگنے اور شکار کرنے کے قابل نہیں رہتا تو ایک دن اپنی ہی دم نگلنا شروع کر دیتا ہے۔ یعنی بالآخر اپنی پہچان بھی کھو دیتا ہے اور اپنی بنیادی طلب پورا کرنے کے لیے خود کو ہی ہڑپ کر جاتا ہے۔

مگرمچھ اپنے جبلّی تقاضوں کی تسکین کے لیے اپنی قوت کا سہارا لیتا ہے۔ اُس کے جبڑے بہت مضبوط ہوتے ہیں اور وہ اپنے شکار کو نہایت سرعت سے پکڑتا ہے اور دو جھٹکوں میں ختم کر دیتا ہے۔ سانپ کی طرح مگرمچھ بھی صرف ریپٹائل دماغ ہوتا ہے اس لیے وہ صرف ردِعمل ظاہر کرنا جانتا ہے۔ اِن دونوں کے پاس سوچ نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی غرض کے غلام ہوتے ہیں شاید اِسی لیے Reptile Brain والی مخلوق زمین کی سطح پر چلتی ہے۔

انسان میں یہ دماغ شدید غصہ اور نفرت کا سبب بنتا ہے۔ اِس کی بدولت انسان بالعموم کسی خوف میں مبتلا پایا جاتا ہے یا پھر وہ کسی حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اشرف المخلوقات والی اعلیٰ فکر غائب ہوتی ہے۔ انسان صرف اپنی ذات کے تحفظ کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ

ذہن کے حدودِ کار

قانون بھی کوئی چیز ہوتا ہے اور دوسرے انسان کے بھی کچھ حقوق ہیں اُسے خوف صرف اپنی ذات کے تحفظ کا ہوتا ہے اور وہ اُس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ حسد دوسرا جذبہ ہے جو دماغ کی اس سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ انسان کسی صورت میں خود سے بہتر انسان کو دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہے۔ پھر اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اُسے نیچا دکھائے ہم جسے حسد کی آگ کہتے ہیں وہ یہیں پائی جاتی ہے۔ انسان میں یہ حسد دوسرے انسان کی دولت، رتبہ، عزت، عقل، فضیلت، حُسن، شہرت، کامیابی، علم اور عظمت غرض کسی بھی خوبی کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک بار حسد کی آگ بھڑک اٹھے تو بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ ایسا شخص پھر کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ سکتا وہ مسلسل اپنے رقیب کو نیچا دکھانے کے درپے ہوتا ہے۔ خوراک، جنسی خواہش، معاشرے میں عزت، لباس اور اعلیٰ معیارِ زندگی یہ سب انسان کی بنیادی خواہشات ہیں۔ انسان Reptile Brain حاوی ہونے کی وجہ سے ان خواہشات کی شدّت کے ساتھ تکمیل میں مصروف رہتا ہے۔ ایک جنون کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک ایسی لذت کی کیفیت جو ہر لمحہ بڑھتی رہتی ہے۔ ایک گاڑی کے بعد دوسری گاڑی کی خواہش، ایک لاکھ کے بعد دو لاکھ، Reptile Brain ہمیشہ ایک کو دو اور دو کو چار کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ قرآن میں اِس ذہن کو خوبصورت پیرائے میں اجاگر کیا گیا ہے۔ Reptile Brain سے سوچنے والوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مویشیوں جیسے ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر ہیں، یہ لوگ غافل ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ غافل کس طرح ہوتے ہیں۔ Reptile Brain رکھنے والے لوگ اللہ کی ذات سے غافل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اپنے خاندان سے لاپروا ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ جنون اتنا بڑھتا ہے کہ وہ دوسروں کے علاوہ اپنی ذات سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ وہ نہائے بھی ہیں یا نہیں۔ اُنہوں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں، وہ اپنی ذات اور بنیادی ضرورتیں تک فراموش کر دیتے ہیں اور اپنی اندرونی اور بیرونی دنیا سے غافل ہو کر صرف جذبات کی تسکین کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔

Reptile Brain کے اوپر اور Frontal Lobe کے نیچے دماغ کا دوسرا حصہ ہے۔ اِس حصے کا نام Mammal Brain ہے۔ دماغ کا یہ حصہ صرف چوپایوں اور انسانوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ Reptiles اِس حصے سے محروم ہیں۔ دماغ کے اِس حصے کو سمجھنے کے لیے آپ کتّے کے عادات و

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اطوار کا مشاہدہ کریں۔ کتّا اپنے مالک سے وفاداری رکھتا ہے اور گھر کے لوگوں کو پہچانتا ہے۔ کتّے کے مزاج میں نہ تو ہر شخص کے لیے محبت ہے اور نہ ہی دشمنی، کتّے کی محبت کا دائرہ محدود ہے۔ کتّا اپنی مکمل وفاداری صرف اُس سے رکھتا ہے جس نے اُسے پالا پوسا ہو، جس کے ساتھ وہ رہتا ہو اور جس کے خاندان کا حصہ ہو۔ کتّا گھر کے لوگوں کا خوب خیال رکھتا ہے اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ اُن کے ساتھ کھیلتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اُن کے لیے جان بھی قربان کردیتا ہے۔ مخصوص لوگوں سے محبت اور غیروں سے نفرت کتّے کے دماغ کا بنیادی کردار ہے۔ یہ صورتِ حال تب تبدیل ہوتی ہے جب کتّا پاگل ہوجاتا ہے۔ اپنی بنیادی ضروریات سے بے نیاز ہوجائے یا اُس کی ضروریات پوری نہ ہوسکیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ بعض اوقات بھوک کی حالت میں کتّے نے اپنے مالک پر حملہ کردیا۔ دماغی توازن خراب ہونے کی صورت میں تو اُس کا Mammal Brain غیر فعال ہوجاتا ہے اور Reptile Brain اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اِس حالت میں اُسے اپنے اردگرد موجود کسی بھی فرد کو کاٹنے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔

انسان کا بھی یہی حال ہے جب اُس کا Mammal Brain کام کرتا ہے تو اُس کا رابطہ اپنے گھر والوں، خاندان اور بہت ہوا تو اڑوس پڑوس تک محدود رہتا ہے، اپنی برادری یا ذات کے لوگوں میں وہ خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے اُنہیں کے ساتھ کھاتا پیتا ہے، اُن کا خیال رکھنا بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اپنی زبان، کلچر یا مذہب سے ہٹ کر کوئی فرد مل جائے تو محتاط ہوجاتا ہے اور بعض اوقات تو خوف کی حالت اُس پر طاری ہوجاتی ہے پھر یہی خوف اُس کو تشدد پر مائل کردیتا ہے۔ فعّال Mammal Brain کے حامل شخص کی اللہ سے محبت بھی مشروط ہوتی ہے۔ اگر وہ مطمئن اور پُرسکون ہو تو اِس حالت کو قائم رکھنے کے لیے اللہ سے لو لگائے گا، حالتِ خوف یا غم سے نجات کے لیے اللہ کو پکارے گا۔ ورنہ وہ اللہ کی طرف کم ہی راغب ہوتا ہے۔ اُس کا تخیل طاقتور ہوتا ہے اور نہ ہی وہ حقائق میں دلچسپی لیتا ہے۔ ایک لگے بندھے طریقے پر چلنا اُسے آسان لگتا ہے شخصیت پرستی ایسے فرد کی ایک اور خصوصیت ہے کوئی پیر، لیڈر یا اداکار اُس کا پسندیدہ ہو تو وہ اُس کے خلاف کچھ بھی سننا پسند نہیں کرتا اور آنکھیں بند کرکے اُس کے پیچھے چلتا رہتا ہے۔

Reptile Brain اور Mammal Brain کے اُوپر Human Brain ہوتا ہے۔ اسی حصّے کو Frontal Lobe بھی کہا جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے کہ یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذہن کے حدودِ کار

وہ حصہ ہے جہاں پر حقائق کی روشنی میں مستقبل کا تخیل وجود میں آتا ہے۔ بلند خیالات یہیں جنم لیتے ہیں۔ نئی ایجادات، آخرت کا تصور اور خدا سے تعلق بھی دماغ کے اِسی حصے کی پیداوار ہیں۔ Human Brain کا کام ہی خدا شناسی ہے۔ اسلام کی روح کو سمجھنے اور اللہ تعالیٰ سے ذاتی تعلق قائم کرنے کے لیے Human Brain انسان کو دیا گیا ہے جو شخص اللہ کو نہیں پہچانتا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا وہ نیکی اور بدی کے شعور سے عاری ہوتا ہے اور Human Brain کو استعمال ہی نہیں کرتا۔ اِسی لیے قرآن میں ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو پیشانی کے بل دوزخ میں جھونکا جائے گا۔ Human Brain پیشانی کے پیچھے ہی ہوتا ہے۔ کافروں کو اِسے استعمال نہ کرنے کی سزا ملے گی۔

ہم کسی شخصیت کے بارے میں اُن کے رویّہ، اندازِ فکر اور عملی زندگی کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ اُنھوں نے دماغ کے تینوں حصوں میں سے کس حد تک کس کس حصّے کو استعمال کیا ہے۔ آپ خود بھی اپنی شخصیت کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ حسب ذیل سوالوں کے جواب دیں۔

حصّہ اول

س ۱: کیا آپ نئے خیالات کو جنم دیتے ہیں؟

س ۲: کیا آپ دوسروں کی حرکات سے اُن کی پریشانیوں یا مشکلات کا اندازہ لگا لیتے ہیں؟

س ۳: کیا آپ کسی دھات، مشین، عمارت کو دیکھ کر مستقبل قریب میں اُس میں ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟

س ۴: کیا آپ کسی تنظیم سے مالی فوائد یا شہرت حاصل کرنے کے بجائے تابناک مستقبل کی اُمید کی وجہ سے وابستہ ہوئے ہیں؟

س ۵: کیا حادثات اور واقعات آپ کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں؟

س ۶: کیا آپ کو اپنے آس پاس کے لوگوں کے انتقام اور نفرت کا کوئی خوف نہیں کیونکہ آپ کو یقین ہے کہ آپ حق پر ہیں؟

حصہ دوم

س ۱: کیا آپ کسی رسم یا معاشرے کا اِس لیے حصہ ہیں کہ آپ تنہائی اور علیحدگی سے ڈرتے ہیں؟

س ۲: کیا آپ کو اختلاف کرنے سے ڈر لگتا ہے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

س۳: کیا آپ آس پاس کے لوگوں کی ناراضگی گوارا نہیں کرتے ؟

س۴: کیا کسی بات کی گہرائی میں جانے سے آپ کو ذہنی کوفت ہوتی ہے؟

س۵: کیا آپ کے دماغ میں کہانیوں اور فلموں کے کردار گردش کرتے رہتے ہیں؟

س۶: کیا آپ اپنے رشتہ داروں اور چاہنے والوں کی گفتگو اور رویئے کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں؟

س۷:۔ کیا آپ کو ایک روٹین پسند ہے؟

س۸:۔ کیا آپ مجمع کا ساتھ دینا پسند کرتے ہیں؟

حصہ سوم

س۱: کیا آپ ہر کام کسی خوف کے تحت کرتے ہیں؟

س۲: کیا آپ کسی تنظیم سے اِس لیے وابستہ ہیں کہ کسی سے آپ کو انتقام لینا ہے؟

س۳: کیا آپ کے دامن میں بچپن کی محرومیاں ہیں؟

س۴: کیا آپ فوراً بدلہ لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں؟

س۵: کیا آپ سمجھتے ہیں/ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ بہت زیادتیاں ہوئی ہیں/ ہوتی ہیں؟

س۶: کیا کسی کی گاڑی یا گھر دیکھ کر آپ کے اندر احساس محرومی یا کمتری جاگ اُٹھتا ہے؟

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۳. سیکھنا

دماغ کا چاہے کوئی حصہ فعال ہو سیکھنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہاں سیکھنے کی نوعیت اور معیار کا فرق ضرور ہوتا ہے اور بلاشبہ بہت واضح ہوتا ہے۔ Reptile Brain کے تحت کام کرنے والا ذہن ایسی مکارانہ ترکیبیں سیکھتا رہتا ہے جن کی مدد سے اُس کے منفی جذبات کی تسکین ہو سکے۔ یہی ذہن ہمیں حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے طنزیہ جملے، تخریبی چالیں اور مکارانہ ترکیبیں سُجھاتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے اِن سے حسد کی آگ کم نہیں ہوتی بلکہ مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ Reptile Brain انسان کو جنگجویانہ ردِعمل سکھاتا ہے۔ بسا اوقات انسان کو Reptile Brain کے تحت ردِعمل ظاہر کرنے کے لیے بہت کچھ سیکھنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ ردِعمل فطری ہوتا ہے۔ لیکن فطری ردِعمل عام طور پر ناکام ہو جاتا ہے۔ پے در پے ناکامیاں انسان کو دو طرح متاثر کرتی ہیں۔ یا تو وہ پاگل ہو جاتا ہے یا پھر وہ قنوطیّت کا نوالہ تر بن جاتا ہے۔ دوسری صورت میں انسان اپنی تسکین کے لیے ہر حربہ آزمانے کی کوشش کرتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر انسان بعض اوقات انتقامی جذبے کو دل میں دبائے عرصے تک منصوبہ بندی کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اُسے یقین ہو جائے کہ وہ انتقام لینے کے قابل ہو گیا ہے۔ حیوان چونکہ چھوٹا سا Reptile Brain رکھتے ہیں۔ اِس لیے اُن کا ردِعمل لمحاتی ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس انسان Reptile Brain کے زیرِ اثر سال ہا سال تک منفی جذبات کی نشوونما کے بعد اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اسلحہ کا استعمال، جسمانی قوّت، لڑائی کی تربیت، دولت کا حصول اور معاشرتی اثر و رسوخ یہ سب ہتھیار Reptile Brain کی تحریکات کو تسکین دینے کا موثر ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

انسان Mammal Brain کے زیرِ اثر بھی سیکھتا ہے۔ برادری میں رہنے کے آداب، بول چال، خانہ داری اور بسا اوقات لوگوں میں عزت حاصل کرنے کے لیے بناوٹ اِسی دماغ کے ذریعہ سیکھتا ہے۔ اِسی طرح وہ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں اور پھر اپنے حاکموں کو خوش کرنے کے لیے بہت سے گُر سیکھتا ہے۔ وہ بغور دوسروں کو دیکھتا رہتا ہے اور ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ دوسروں کا منظورِ نظر بنے۔ اپنے خاندان کی حفاظت اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے اُسے کیا کچھ آنا چاہیئے۔ وہ نہایت سکون اور ادب کے ساتھ وہ سب کچھ سیکھ لیتا ہے جس کا مطالبہ معاشرہ اُس سے کر رہا ہو۔ اِسی دماغ سے کام لے کر ایک کتّا بھی چھوٹے موٹے کام اور کرتب سیکھ جاتا ہے۔ اپنے مالک کے روزمرہ کام کرنا،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیکھنا

گیند اُٹھالانا، ہاتھ ملانا، سلام کرنا اور ایسے ہی کرتب اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے انجام دینے لگتا ہے۔

Mammal Brain کے ذریعہ سیکھنے کا مقصد کوئی انقلاب لانا نہیں ہوتا۔ انسان صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ اتنا کچھ سیکھ لے جس کی بدولت اُس کی ترقی نہ رُکے یا اُس کے دوست اُس کا مذاق نہ اڑائیں۔ عام طور پر علم حاصل کرنے سے وہ اتنا لطف اندوز نہیں ہوتا جتنا اِس خیال سے کہ اُس کے علم کی وجہ سے اُسے معاشرے میں کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اب ہم آتے ہیں اُس سیکھنے کی طرف جو Human Brain کے تحت ہوتا ہے۔ Human Brain کو کام میں لا کر انسان پہلے تو حقائق کا شعور حاصل کرتا ہے۔ مشاہدہ، تحقیق، تجزیہ وغیرہ Human Brain کے تقاضے ہیں۔ انسان ہر غرض اور خواہش سے آزاد ہو کر تحقیق کرتا ہے۔ اِس لیے Human Brain کے تحت حاصل ہونے والا علم اپنے اندر ایک لذت رکھتا ہے۔ Human Brain کا دوسرا مقصد اپنے تخیل کو ترقی دے کر نئے خیالات کو جنم دینا ہے۔ اِسی بنیاد پر انسان نئی مہارتیں اور ہنر سیکھتا ہے جو اُس کے مستقبل کی کامیابی کے ضامن بن جاتے ہیں۔

علم کا حصول دراصل دو مراحل پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک نظریہ دوسرا طریقہ۔ مشاہدہ اور مطالعہ سے نظریات ترتیب پاتے ہیں اور ہمارے جذبات کو ایک شکل دیتے ہیں جبکہ طریقہ ہمارے نظریات کو عمل میں ڈھال دیتا ہے۔ نظریات ہماری فکر اور ذات کو سنوارتے ہیں جبکہ طریقہ ہماری عملی زندگی میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ نظریہ اور عمل میں ایک گہرا تعلق ہے۔ ایک نظریہ عمل کی صورت اختیار کرنے کے بعد زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے اور انسان کی شخصیت کا لازمی حصّہ بن جاتا ہے۔

ایک دس سالہ لڑکی اپنی ماں کو کھانا پکاتے دیکھتی ہے وہ محسوس کرتی ہے کہ کھانا پکانا عورت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ پھر وہ کھانا پکانا سیکھتی ہے۔ جب وہ کھانا پکا کر دسترخوان پر رکھتی ہے اور کھانے والے اُس کی تعریف کرتے ہیں تو اُس کے اندر یہ نظریاتی احساس پختہ ہو جاتا ہے کہ اُس کے گھر والے اُس سے محبت کرتے ہیں۔ ایک لڑکا اپنے باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ اپنی تنخواہ گھر لاتا ہے تو گھر میں خوشی پھیل جاتی ہے۔ ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ ماں کو اچھا لگتا ہے وہ حساب لگاتی ہے کہ اب پیسے آگئے ہیں تو کیا کیا چیزیں خریدنا ہیں۔ اِس نظریے کو بنیاد بنا کر وہ بھی روزی کمانے کا طریقہ سیکھتا ہے۔ اپنی کمائی لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ ماں اُس کی تنخواہ پا کر اپنے خاوند کی تنخواہ سے بھی زیادہ خوشی کا اظہار کرتی

سیکھنا

ہے۔ماں کے یہ تاثرات لڑکے کے دماغ میں یہ نظریہ پیدا کرتے ہیں کہ اولاد کی تنخواہ سے ماں کو کتنی خوشی ہوتی ہے۔

اسلام میں نظریہ اور عمل کا جو حسین امتزاج ہے وہ دوسرے مذاہب میں کم ہی نظر آتا ہے۔ اسلام میں دو بنیادی کتابیں ہیں، ایک بنیادی طور پر نظریہ کی تشکیل کرتی ہے اور دوسری عملی طریقے کی، نظریہ کی کتاب قرآن ہے۔جس میں چند بنیادی نظریات ہی بار بار منفرد انداز میں سمجھائے گئے ہیں۔یہ نظریات روحانی، مادی، اخلاقی، نفسیاتی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، عملی، سائنسی غرض انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہیں۔(ہم اِن نظریات پر ذرا آگے بات کریں گے) دوسری قسم احادیث اور سیرت کی کتابوں کی ہے جہاں ہمیں عملی طریقے ملتے ہیں۔قرآن ہمیں نظریہ دیتا ہے اللہ کی ربوبیت اور پھر عبادت کا نظریہ ملتا ہے یعنی نماز پڑھنے کا حکم۔اب اِس نماز کو پڑھنے کا عملی طریقہ ہمیں احادیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔جب ہم نماز ادا کرتے ہیں تو اُس سے حاصل ہونے والا سرور ہمارے لیے ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ یا تو پہلے سے موجود نظریئے کو مضبوط کر دیتا ہے یا ایک نئے نظریئے کو جنم دیتا ہے۔مثلاً نماز ہمارے اندر ایک نئی قوت پیدا کرتی ہے۔جس سے نماز پڑھنے والے کی پوری زندگی میں انقلاب آجاتا ہے اور اُس کے نظریات ایک مثبت تبدیلی سے آشنا ہوتے ہیں۔

ہم عملی کاوش سے نماز کے آداب سیکھتے ہیں، یوں ہماری نماز میں خشوع وخضوع پیدا ہونے لگتے ہیں۔چونکہ نظریہ ہی ہمیں عمل پر آمادہ کرتا ہے اِس لیے سیکھنے کا عمل بھی نظریئے کے تابع ہوتا ہے۔یہ ضروری نہیں کہ انسان جس جوش و جذبہ سے نظریہ سیکھتا ہے اُسی شدّت سے اُس پر عمل بھی کرنے لگ جائے۔اُس صورت میں اُس کا نظریہ تو مضبوط ہوگا لیکن اُس کے عمل کا معیار کمزور ہوگا۔

یہاں Human Brain، Mammal Brain اور Reptile Brain سے سیکھنے کے تعلق پر ایک چھوٹی سی بات ہوجائے۔ ہر نظریہ یا عمل، دماغ کی نچلی سطح سے اُوپر کی طرف بڑھتا ہے۔ Reptile Brain جبلت کے اثر کا مظہر ہوتا ہے اور جبلت فوری ردعمل کی متقاضی ہوتی ہے اِس لیے Reptile Brain کے زیر اثر بیشتر لوگ نظریہ کا شعور کیے بغیر عمل کرتے ہیں۔آج کل غیر مسلم چونکہ دماغی سائنس میں ترقی یافتہ ہیں اور Reptile Brain کی حقیقت سے آشنا ہیں اِس لیے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان Reptile Brain کے اثر و نفوذ سے باہر نہ نکل سکیں اور بلا سوچے سمجھے غیر دانشمندانہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیکھنا

حرکات کے مرتکب ہوتے رہیں۔Reptile Brain کے زیرِ اثر مسلمانوں کا ردِعمل کسی بھی تربیت کے بغیر ہوگا۔ کیونکہ وہ کسی مربوط نظام کے تحت نہیں ہوگا اِس لیے وہ دوررس نتائج کا حامل نہیں ہوگا۔ اِس کے برعکس Mammal Brain کے زیرِاثر سیکھنے کا عمل Reptile Brain سے زیادہ طویل ہوتا ہے۔ انسان اِس طرح معاشرے کے دوسرے افراد، حکمران اور سماجی رویوں کا مشاہدہ کرکے سیکھتا ہے اور قدرتی طور پر رویوں کو سیکھنے میں زیادہ وقت درکار رہتا ہے۔ Human Brain کے زیرِاثر سیکھنے کا عمل بہت طویل ہوتا ہے۔ کیونکہ پہلے تو نظریہ قائم کرنے کے لیے لمبے عرصہ تک خاموشی سے مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اُس کے بعد اُس نظریئے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو عوامل درکار ہوتے ہیں۔(اُن کی پیچیدگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے) اُن کے لیے کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں دنیا کے عظیم سائنس دان آئن اسٹائن کا ذکر مناسب ہوگا۔ آئن اسٹائن نظریۂ اضافت کے بانی ہیں۔ مگر آئن اسٹائن کی شہرت صرف نظریہ پیش کرنے کی مرہونِ منت ہے۔ اِس سے پہلے وہ کیا کرتے تھے بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ الہامی نظریہ پیش کرنے سے پہلے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا لیکن ایک نبی کے علاوہ ہر انسان کو ایک نظریہ پیش کرنے سے پہلے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آئن اسٹائن کو بھی اِسی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اُن کے نظریئے کی ابتدا برسوں پہلے کے فکر و مشاہدہ سے ہوئی۔ آئن اسٹائن سوئٹزرلینڈ کے Patent Office میں کام کرتے تھے اور روز ٹرین سے دفتر جاتے تھے اُنہیں خیال آتا تھا کہ اگر یہ ٹرین تیز ہوتی جائے تو اُس کے اندر بیٹھے لوگوں کے ساتھ کیا ہو۔ یہ ایک خیال تھا ظاہر ہے اُن کے اِس خیال کی بنیاد سائنس پر تھی۔ سو میل، دو سو میل، دس ہزار میل، ایک لاکھ اور بالآخر ۸۶،۰۰۰،امیل فی گھنٹہ۔ اگر یہ ٹرین روشنی کی رفتار سے چلے تو کیا ہوگا۔ اِس کی ماہیت اور کیفیت کیسے تبدیل ہوجائے گی آئن اسٹائن اپنے تخیل کی قوت کو بروئے کار لائے اور یوں ایک نیا نظریہ وجود میں آیا۔ اِس نظریئے کو ثابت کرنے کے لیے آئن اسٹائن کو عملی قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آئی جس کے لیے علمِ ریاضی اور طبیعیات کا سیکھنا ضروری تھا۔ اِن دو علوم کے سیکھے بغیر آئن اسٹائن کا نظریہ ثابت نہ ہوتا اور ایک خیالِ خام بن کر رہ جاتا۔

چونکہ Human Brain کی سطح پر آکر انسان کو سیکھنے میں زیادہ وقت درکار رہتا ہے اس لیے نظریات کم ہی وجود میں آتے ہیں لیکن بہت کچھ سیکھنے کے بعد جو نظریات وجود میں آتے ہیں اُن کا

سیکھنا

Human Brain اور وقت Mammal Brain کی سطح پر سیکھنے کا عمل معیار بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ سے کم ہوتا ہے اِس کے نتیجہ میں وجود پانے والے نظریات معیار میں کم اور تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔

Reptile Brain کی سطح پر تو کسی نظریئے کو تخلیق کرنے میں کچھ وقت درکار نہیں ہوتا نہ ہی کچھ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس لیے Reptile Brain کے تحت تخلیق پانے والے خیالات پیدا ہونے سے کچھ دیر بعد فنا ہو جاتے ہیں۔ یعنی نظریئے اور عمل کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے۔ Human Brain کی سطح پر وجود میں آنے والے نظریات اور اعمال کی زندگی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

دنیا کی عظیم شخصیات نیوٹن، بوعلی سینا، امام غزالی، اور دوسروں کے خیالات Human Brain کی سطح پر وجود میں آئے اور آج تک زندہ ہیں جبکہ Reptile Brain کے تحت اُبھرنے والے نظریات پانی کا بلبلہ ثابت ہوئے ہیں۔ کسی بھی مختصر مدّت میں Reptile Brain کے تحت پیدا ہونے والے نظریات لاکھوں ہوتے ہیں مگر اُنہیں کوئی پذیرائی نہیں ملتی۔ Mammal Brain کے تحت وجود پانے والے نظریات ہزاروں یا لاکھوں میں ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اخباروں کی زینت بنتے ہیں۔ جبکہ Human Brain کے زیر اثر جنم لینے والے نظریات اور اعمال چند ایک ہی ہوتے ہیں جو کتابوں کی زینت بن کر حیاتِ دوام پا لیتے ہیں۔

اِس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے تینوں دماغوں کے لیے استعمال ہونے والی تشبیہات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ایک طویل عرصے سے بلکہ دماغ کی تینوں سطحیں متعین ہونے سے پہلے بھی انسان تین دماغی سطحوں کو تین جانوروں سے منسوب کرتا آ رہا ہے۔ Reptile Brain کو سانپ سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ سانپ چونکہ صرف جبلت کی بنیاد پر کام کرتا ہے اور اس کے عمل میں سیکھنے کا عنصر شامل نہیں اِس لیے وہ مخلوقات کی سب سے نچلی سطح کا نمائندہ ہے۔ اُس کی ذہنی پستی اُس کی چال سے نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اپنا سر زمین پر ڈال کر چلتا ہے۔ اُس کے آگے بڑھنے کا طریقہ اُس کے ذہن کی غمازی کرتا ہے۔

Mammal Brain کی نشانی ہے گھوڑا۔ وفادار، اپنے مالک کے حکم کا تابع۔ گھوڑے میں Reptile Brain، Mammal Brain دونوں موجود ہیں لیکن یہ اپنے Mammal Brain کا استعمال کرتے ہوئے اپنے مالک کے حکم پر آگ میں بھی کود جاتا ہے۔ اُس کی پُر وقار چال اس

سیکھنا

کے ذہن کی ترجمان ہے۔ایک عزت،ایک وقار،ایک شان۔

Human Brain کو یوں تو اشرف المخلوقات یعنی انسان ہی بہتر طور پر پیش کرسکتا ہے۔ لیکن انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خود سے ہٹ کر اپنے لیے تشبیہات تلاش کرے (جیسے ماں اپنے بیٹے کے حُسن کو چاند سے تشبیہہ دیتی ہے) اِس لیے Human Brain کو ایک پرندے سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ وہ پرندہ شاہین ہے جو بلندیوں پر حکمرانی کرتا ہے اور اعلیٰ صفات کا حامل ہے۔ شاہین دور تک دیکھ سکتا ہے اور بہت گہرائی میں جا کر حقائق کو جمع کرتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا ژرف نگاہی سے انتخاب کرتا ہے۔ وہ مردار نہیں کھاتا۔ یعنی وہ Reptile Brain کے ادنیٰ درجہ پر نہیں آتا۔ پھر وہ بڑی مہارت سے اپنے شکار کی طرف بڑھتا ہے۔ یعنی بھرپور طریقہ سے عملی قدم اٹھاتا ہے جس کے لیے اُس نے سال ہا سال تک پلٹنے جھپٹنے کی تربیت پائی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنا تجزیہ کیسے کریں۔ ہمیں کیسے پتہ چلے کہ ہم سیکھ رہے ہیں یا نہیں اور اگر ہم سیکھ رہے ہیں تو یہ سیکھنا Human Brain کی سطح پر ہے یا پھر Mammal Brain اور Reptile Brain کے درجہ پر۔ اِس خود شناسی کے لیے آپ حسب ذیل چیزوں کا جائزہ لیں اور ہر ایک کے بارے میں چند سوالوں کا جواب دیں۔

۱۔ کیا آپ کو اکثر سوچنے کا موقع ملتا ہے؟ کیا آپ دن میں کئی بار سوچتے ہیں؟
اگر ایسا ہے تو ہم یہ تسلیم کرسکتے ہیں کہ آپ کا سوچنے کا عمل قائم ہے۔ اب آیئے سوچ کی نوعیت معلوم کرتے ہیں اِس کے لیے آپ کے سوچنے کا وقت اور جگہ معلوم کرنا پڑیں گے۔

۲۔ کیا آپ چلتے پھرتے سوچتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ غالباً Reptile Brain یا Mammal Brain کو کام میں لا رہے ہیں۔

۳۔ کیا آپ لوگوں کے ردِعمل پر سوچتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain یا Mammal Brain سے کام لیتے ہیں۔

۴۔ کیا آپ کسی خوشی یا تکلیف دہ واقعہ کے جواب میں جذباتی انداز میں سوچتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain کے درجہ پر ہیں۔

۵۔ کیا آپ بہت گہرے مشاہدے کے بعد آرام سے بیٹھ کر ایک ایک تفصیل کو دماغ میں لا کر سوچتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain سے کام لے رہے ہیں۔

۶۔ کیا آپ نئی نئی اشیاء بناتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain کے درجہ پر ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیکھنا

۷۔ کیا آپ آرام سے بیٹھ کر کسی بھی جذباتی تسلط سے آزاد ہو کر مستقبل میں جھانکتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain کے درجہ پر ہیں۔

۸۔ کیا آپ اپنے خاندان یا اپنے تحفظ کی خاطر سوچتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Mammal Brain کے درجہ پر ہیں۔

۹۔ کیا آپ بدلہ لینے کا سوچتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۰۔ کیا آپ علم حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں یعنی نئی معلومات کے لیے تگ و دو کرتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۱۔ کیا آپ معلوم چیزوں اور واقعات کا کوئی نیا پہلو دریافت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۲۔ کیا آپ گہرائی میں جا کر چیزوں کو دیکھتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۳۔ کیا آپ ناول اور کہانیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Mammal Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۴۔ کیا آپ کو پڑھنے کا یا مشاہدہ کرنے کا کوئی وقت نہیں ملتا ہے؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۵۔ کیا آپ میں مطالعہ یا مشاہدہ کرنے کے لیے تحمل نہیں ہے؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۶۔ کیا آپ کا حاصل کردہ علم آپ کے اندر نئے خیالات کو جنم دیتا ہے؟ گر ہاں تو آپ Mammal Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۷۔ کیا آپ امتحان کے لیے پڑھتے ہیں یا کسی کو خوش کرنے کے لیے؟ اگر ہاں تو آپ Mammal Brain کے درجہ پر ہیں۔

اور آخر میں وہ احساس جو آپ کو سیکھنے کی ترغیب دیتا ہے یہ بتائے گا کہ آپ کے دماغ کا کون سا حصہ استعمال ہو رہا ہے۔

۱۸۔ کیا آپ کوئی کام کسی سے بدلہ لینے کے لیے سیکھ رہے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain کے درجہ پر ہیں۔

۱۹۔ کیا آپ کا سیکھنا کسی خواہش کی تسکین کے لیے ہے؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain کے درجہ پر ہیں۔

۲۰۔ کیا آپ کسی خوف کی وجہ سے سیکھ رہے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Reptile Brain کے درجہ پر ہیں۔

۲۱۔ کیا آپ لوگوں میں مقام حاصل کرنے کے لیے سیکھ رہے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Mammal Brain کے درجہ پر ہیں۔

۲۲۔ کیا آپ کونا کامی کا احساس ہے؟ اگر ہاں تو آپ Mammal Brain کے درجہ پر ہیں۔

۲۳۔ کیا آپ علم کی لذت محسوس کرتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain کے درجہ پر ہیں۔

۲۴۔ کیا آپ کوئی نیا کام کرنا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں تو آپ Human Brain کے درجہ پر ہیں۔

اِن سوالوں کے جواب دے کر آپ جان سکتے ہیں کہ کیا آپ کے اندر واقعی سیکھنے کا سلسلہ جاری ہے اور اگر ہے تو کیا آپ کا سیکھنا اعلیٰ نوعیت کا ہے یا نہیں؟

انسان کو سیکھنے کے لیے تین مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ سیکھنے کا عمل تین منازل سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ تین مدارج مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ پر مبنی ہیں۔ ہم اگلے باب سے ان تینوں کا الگ الگ جائزہ لینا شروع کریں گے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۴. مشاھدہ

مشاہدہ انسانی سوچ کی بنیاد ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مشاہدہ انسانی شخصیت کی ابتداء بھی ہے۔ یہ وہ حیرت انگیز کام ہے جو بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے ہی شروع کر دیتا ہے۔ یعنی دماغی کاموں میں سے مشاہدہ ہر انسان دُنیا میں آنے سے پہلے ہی شروع کر دیتا ہے۔

مشاہدہ کا بنیادی مقصد انسانی دماغ کے لیے معلومات اکٹھا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حواسِ خمسہ عطا کیے ہیں۔ آنکھ سے ہم اشیاء کا چھوئے بغیر جائزہ لیتے ہیں، ناک سے ہم سونگھتے ہیں، ہاتھوں سے چُھو کر دیکھتے ہیں، زبان سے چکھتے ہیں اور کانوں سے سُنتے ہیں۔ اِن ذرائع سے حاصل کردہ معلومات ہمارے دماغ میں پہنچتی ہیں جہاں سوچ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو مشاہدہ کیے بغیر بھی بہت کچھ سوچ سکتے ہیں، تو کیا یہ سوچ کارآمد نہیں ہوتی؟ اِسی طرح ہم بہت کچھ دیکھتے، سونگھتے، چکھتے، سُنتے اور محسوس کرتے ہیں مگر اِن سے کوئی قابلِ ذکر سوچ جنم نہیں لیتی یہ کیسے ہوتا ہے؟

ہم دوسرے سوال سے شروع کرتے ہیں۔ مشاہدہ انسان کی سوچ سے منسلک ہے۔ وہ مشاہدہ جو سوچ کو جنم نہ دے مشاہدہ نہیں کہلاتا۔ مشاہدہ کرنے اور دیکھنے، سونگھنے، سُننے، چھُونے وغیرہ میں فرق ہے۔ سمندر کے کنارے بیٹھ کر سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھنا، ٹھنڈی ہوا میں لہروں کا شور سننا، نمکین ہوا کو اپنے جسم پر محسوس کرنا اور پھر اِن ساری معلومات کی مدد سے کچھ سوچنا آپ کے مشاہدے کا حصہ ہے۔ لیکن اگر آپ پانی میں اُچھل کود کر رہے ہیں، جس کے دوران پانی آپ کے منہ میں بھی جا رہا ہے۔ ایک بچّہ آپ کے اُوپر اُچھل رہا ہے اور آپ کی تمام تر توجہ کھیلنے پر ہے تو یہ مشاہدے کا حصہ نہیں۔ کھیلتے وقت آپ ریت ایک دوسرے پر پھینک رہے ہیں، پانی اُچھال رہے ہیں اور ریت آپ کو چُھو رہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ آپ کا مشاہدہ نہیں، کیوں؟ کیونکہ اِن سب حرکات سے آپ کا مقصد کوئی نتیجہ اخذ کرنا نہیں۔ اِس کے برعکس ایک فرد کنارے پر بیٹھا باپ بیٹے کے کھیل کا مشاہدہ کر رہا ہے اگر چہ وہ پانی سے باہر ہے لیکن مشاہدہ کرنے کی نیت سے وہاں موجود ہے اِس لیے وہ کئی ایک نتائج اخذ کر کے اُٹھے گا یا جس مقصد سے وہ مشاہدہ کر رہا تھا اُس کے لیے اُس کے پاس بہت سا مواد موجود ہوگا۔

مشاہدہ کرتے وقت ایک نیت ہوتی ہے۔ ایک مقصد ہوتا ہے۔ مشاہدہ اِس ارادے سے کیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

جاتا ہے کہ ہم اِن معلومات سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم اپنے موجودہ نظریات میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں یا پھر نئے نظریات تخلیق کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

ہمارا پہلا سوال مشاہدے کے بغیر سوچنے کے بارے میں تھا۔ ہم کئی دفعہ مشاہدے کے بغیر سوچتے ہیں۔ ہم کسی ایسے معاملے کے بارے میں سوچتے ہیں جس کا مشاہدہ ہم پہلے ہی کر چکے ہوتے ہیں۔ جیسے وہ فرد جو پانی میں کھیلتے لوگوں کا مشاہدہ کر آیا اب سوچ رہا ہے کہ اُس مشاہدے سے کیا نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ جو کچھ وہ اب تک جانتا تھا وہ ٹھیک تھا یا اُس میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ مثلاً پچھلی سردیوں میں اُس نے لوگوں کو سمندر میں کھیلتے کودتے دیکھا تو اُس کا تاثر کچھ اور تھا۔ اِس دفعہ گرمیوں میں اُس نے محسوس کیا کہ پانی میں کھیلنے کودنے والوں کا رویہ تبدیل ہو گیا تھا۔

اِس کے علاوہ وہ فرد سوچ سکتا ہے کہ اِس مشاہدے سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں اُن کی تصدیق کسی اور ماحول میں کیسے ہو۔ مثلاً لوگ پانی میں جو کھیل کھیلتے ہیں کیا باغ میں کھیلے جانے والے کھیل وہی ہوتے ہیں یا مختلف۔ لیکن کسی کو نفرت سے دیکھنا، کوئی روزمرہ کا کام کرنے کے لیے دیکھنا مشاہدے کا حصہ نہیں۔ ہمیں زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر عام زندگی گزارنے کے لیے مشاہدے کی ضرورت نہیں، اِس کے لیے دیکھنا کافی ہے۔ جانور اپنی طبعی زندگی میں کبھی بھی مشاہدہ نہیں کرتے وہ صرف دیکھ کر اپنے ماحول میں پرسکون زندگی گزار دیتے ہیں۔ بلی کو لیجئے جس جگہ رہتی ہے خوش رہتی ہے، گوشت کو دیکھتی ہے، گوشت کو ہی سونگھتی ہے، گیند کو پیر سے چُھو کر محسوس کرتی ہے اور بس۔ بلی کی زندگی میں مشاہدہ نہیں صرف دیکھنا ہے۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے مشاہدہ درکار نہیں صرف دیکھنے سے کام چل جاتا ہے۔ یاد رہے کہ ہم یہاں لفظ ''دیکھنا'' حواسِ خمسہ کے عمومی استعمال کے لیے لائے ہیں۔ یہ حواسِ خمسہ کا وہ استعمال ہے جس سے سوچنے کی تحریک نہیں ہوتی۔ جبکہ مشاہدہ ایک یا ایک سے زیادہ حواسِ خمسہ کا سوچنے سے منسوب ہونا ہے۔

دیکھنا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ ہر انسان دیکھتا ہے۔ لیکن مشاہدہ انسان کی بنیادی ضرورت نہیں اِس لیے ہر انسان مشاہدہ نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے جو مشاہدہ کرتے ہیں۔ انسان دیکھنے کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ پھر اُس کی طبیعت مشاہدے کی طرف نہیں آتی۔ اگر بچپن سے سوچنے کی عادت نہ ہو تو انسان مشاہدہ بھی نہیں کرتا۔ آج کی مسلم دنیا میں رائج نظامِ تعلیم بالعموم مشاہدے کی تعلیم نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیتا۔ نتیجتاً ہمارے ہاں نئے نظریات کی تخلیق سائنسی بنیادوں پر نہیں ہوتی حالانکہ قرآن جگہ جگہ مشاہدے کی تلقین کرتا ہے۔ اگر بچپن سے مشاہدہ کرنا سکھایا جائے تو یہی مشاہدہ آگے چل کر سوچنے کی بنیاد بنتا ہے لیکن چھوٹی عمر سے مشاہدہ نہ سکھانے کی وجہ سے عمر بھر سوچنے کا عمل معطل رہتا ہے۔ یوں تو قرآن کائنات کے سربستہ رازوں کو جاننے کی دعوت دیتا ہے لیکن مشاہدے کی ضرورت ایک خاص مقصد کے لیے ہے۔ اور وہ مقصد ہے حق شناسی یعنی اللہ کی پہچان۔

اللہ کی ذات ہم سے مخفی ہے لیکن اللہ کی صفات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ندی کے شفاف پانی میں تیرتی مچھلیوں سے لے کر صحرا کی تپتی دھوپ میں ایک چٹان کے نیچے چُھپے سانپ تک، دوردراز ستاروں کی جگمگ کرتی روشنی سے لے کر شام کے دھندلکوں میں کھیتوں کے درمیان ٹمٹماتے جگنو تک، ہم اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کر کے اللہ کی ذات کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اور اگر مشاہدہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو اللہ کی پہچان نہیں ہوتی۔ مشاہدہ کے بغیر اسلام ایک دین نہیں بلکہ چند رسومات کا مرکب بن کے رہ جاتا ہے۔

مغربی دنیا نے مشاہدے کی ضرورت کو بخوبی سمجھا اور اِسے سائنسی بنیادوں پر اپنا معمول بنالیا۔ جس دور میں مسلمان مشاہدہ کی قوت سے عاری ہو رہے تھے مغربی دانشور اپنی قوم کو مشاہدہ کرنا سکھا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ مشاہدہ کرنا مغربی دنیا میں ایک بنیادی ضرورت بن گیا۔ بلکہ سائنس کی ترقی کے لیے اُسے وہ مقام حاصل ہوا جو ہمارے یہاں کسی مذہبی فریضے کے لیے بھی ممکن نہیں۔

مسلمان تو پچھلے ۵۰۰ سال سے مشاہدہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ لیکن مغرب میں ہر ڈھائی سالہ بچّے کو مشاہدہ کی تربیت دی جاتی ہے اِس کے باوجود مغربی دنیا میں لوگ اللہ کی ذات کو نہیں پہچانتے حالانکہ حق شناسی کے لیے مشاہدے کو بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

یہ ایک دلچسپ صورتِ حال ہے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ ہم مشاہدے کی تین اقسام کا ذکر کریں۔

مشاہدہ مندرجہ ذیل تین اقسام کا ہوتا ہے۔ (۱) اللہ، (۲) اپنی ذات، (۳) اپنے اردگرد کا ماحول۔

(۱) اللہ کو پہچاننے کے لیے انسان اللہ تعالیٰ کی نشانیوں یعنی آیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ نشانیاں انسان کی ذات سے لے کر کائنات کی دور افتادہ حدود تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اِس مشاہدے کا مقصد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

انسان کواللہ کے وجود کا ادراک عطا کرتا ہے۔ اِس طرح انسان نہ صرف اللہ کو پہچان لیتا ہے بلکہ اُس سے قریب بھی ہوجاتا ہے۔اور جوانسان اللہ کی قربت کے لیےایک قدم بڑھاتا ہے اللہ اُس کی سمت دس قدم بڑھتا ہے یہاں تک کہ اُس کی شہ رگ سے بھی قریب آجاتا ہے۔

(۲) مشاہدے کی دوسری قسم اپنی ذات کا مشاہدہ ہے۔ یہاں انسان اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔ یہ مشاہدہ اُسے خودشناسی کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اُسے پتا چلتا ہے کہ اُس کی ذات میں کیا خوبیاں اور کیا خامیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اُس کے نفس میں اللہ نے کیا کیا صلاحیتیں ودیعت کررکھی ہیں۔ جواُس کی غفلت یا غلط رویہ سے زنگ آلود ہوگئی ہیں اور اپنی اصلاح کے لیے اُسے کیا کچھ کرنا چاہیے۔

(۳) تیسرا مشاہدہ ہے کائنات کا۔ یہ ایک وسیع مشاہدہ ہے۔ یہ مشاہدہ شروع ہوتا ہے ایک سیل (Cell) یا ایٹم (Atom) سے اور پھیل جاتا ہے ستاروں اور کہکشاؤں کے مشاہدے تک۔ اِس مشاہدے کے تحت بے شمار علوم کا احاطہ ہوتا ہے بلکہ تمام جدید سائنسی علوم اِس مشاہدے کی بدولت وجود میں آتے اور نشوونما پاتے ہیں۔

مغربی دنیا میں مشاہدے کی اہمیت کا احساس اُس وقت ہوا جب وہ مذہب سے بغاوت کررہی تھی۔ بلکہ مذہب کے نمائندہ، کلیسا کومشاہدہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا گیا۔کلیسا کا مغرب کومشاہدے سے روکنے کا مسئلہ بھی سادہ تھا۔ خدا کا جونقشہ کلیسا نے کھینچا وہ انسانی مشاہدے کی توہین کے مترادف تھا۔کلیسا کا خدا چھ دن میں کائنات بنانے کے بعد ساتویں دن آرام کا طالب ہوا۔اور اُس کے بعد آج تک ایک معطل قوّت بن کررہ گیا۔جبکہ مشاہدہ ایسے خدا کے وجود کا تقاضا کرتا تھا جوابھی تک نئی دنیائیں تخلیق کررہا تھا اور کائنات میں ایک فعال اور مختارِکُل قوّت کے طور پر موجود تھا۔کلیسا کا خدازمین کے گرد سورج کو گُھما رہا تھا جبکہ مشاہدہ کے مطابق زمین سورج کے گرد گُھوم رہی تھی۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

کلیسا جانتا تھا کہ مشاہدہ اُس کے پیرؤوں کو مذہب سے دور لے جائے گا لہٰذا اُس نے مشاہدہ پر پابندی لگادی اور اُس پابندی کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بے دین (Heretic) قرار دے دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

نتیجہ ہم سب کو معلوم ہے۔ بالآخر مغرب نے کلیسا سے نجات حاصل کی بلکہ مذہب کو ہی خیر باد کہہ دیا۔اب جو نظامِ تعلیم وجود میں آیا اِس میں ذات اور کائنات کا مشاہدہ تو لازم تھا لیکن خدا کا مشاہدہ سرے سے غائب تھا۔مغرب نے مشاہدہ کرنے کا فن مسلمانوں سے سیکھا،مسلمانوں کو مشاہدہ کرنا قرآن نے سکھایا اور قرآن میں مشاہدے کا اولین مقصد اللہ کی ذات کو پہچاننا تھا۔ باقی باتیں ثانوی حیثیت کی حامل تھیں۔ یوں مشاہدہ جس مقصد کے لیے انسان کو سکھایا گیا تھا وہ فوت ہوگیا اور صرف مادی مشاہدہ رہ گیا۔تاہم مغرب نے کائنات کا مشاہدہ کر کے نہ صرف سائنسی علوم میں اضافہ کیا بلکہ موجودہ سائنسی نظریات میں بھی انقلاب پیدا کردیا۔

مشاہدہ ایک منظّم اور مربوط عمل ہے۔انسان کو اللہ کی صفات و آیات کا مشاہدہ کرنا چاہیے، پھر اپنی ذات کے مشاہدہ پر توجہ دینا چاہیے تا کہ اپنی ذات میں اعلیٰ صفات پیدا کی جائیں۔اِس کے بعد اپنے ماحول کے فطری مظاہر، دریاؤں،سمندروں، پہاڑوں اور زمین سے پرے ستاروں اور کہکشاؤں کا مشاہدہ بھی کرنا چاہیۓ اِس طرح انسان کی شخصیت میں ایک توازن آجائے گا۔اور اُس کے قلب و ذہن میں وسعت پیدا ہوگی۔جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا بنیادی تقاضا ہے۔

اب ہم پر واضح ہوگیا کہ مشاہدہ ہی انسان کو حیوان سے جدا کرتا ہے، یہی سوچ کی بنیاد ہے اور یہ کہ انسان تین طرح کا مشاہدہ کرتا ہے اللہ کی آیات کا، اپنی ذات کا، کائنات کا۔تو اب سوال یہ ہے کہ اچھے مشاہدے کا طریقِ کار اور معیار کیا ہو۔اِس کا جواب ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔عزیزؑ اللہ کے نبی تھے۔ اُن کا واقعہ قرآن کی سورہ البقرہ میں آیا ہے۔ایک دفعہ ایک اُجڑی ہوئی بستی کے پاس سے گزرتے ہوئے اُن کے دل میں خیال آیا کہ اللہ اِس بستی کو زندہ کیسے کرے گا جب کہ اُس کے افراد تو کیا پتھر کے مکان بھی زمین بوس ہو چکے تھے۔اُسی وقت اللہ نے اُن کو ایک لمبی نیند سلا دیا کئی سو سال کے بعد آپ اُٹھے تو اللہ نے آپ کی توجہ دو چیزوں کی طرف مبذول کرائی ایک تو اللہ نے آپ سے اپنا گدھا دیکھنے کو کہا جواب ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا دوسرا مشاہدہ اللہ نے آپ کو آپ کے کھانے کا کروایا جو تازہ بہ تازہ پڑا تھا وہی خوشبو، وہی ذائقہ جو سو سال پہلے تھے۔اِس مشاہدے کے بعد حضرت عزیزؑ کو یقین ہوگیا کہ اللہ کس طرح مارتا اور پھر زندہ کرتا ہے۔یہاں سے مشاہدہ کے دو اصول واضح ہوتے ہیں چونکہ یہ دو اصول قرآن کی سورۂ بقرہ میں آنے والے واقعات سے اخذ ہوتے ہیں اِس لیے ہم نے اُنہیں اصولِ بقرہ اول و دوئم کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نام دے دیئے ہیں۔

پہلا اصول

اچھا مشاہدہ ایک نظام یا شے کا اُس وقت تک مشاہدہ کرنا ہے جب تک اُس میں مزید تبدیلی کا امکان نہ رہے۔یعنی ہمیں کسی چیز کا مشاہدہ کرتے رہنا چاہیئے یہاں تک کہ اُس میں تبدیلی کا عمل رُک جائے۔ ایک تتلی کی مثال لیجئے آپ نے تتلی کے انڈے کا مشاہدہ کرنا شروع کیا انڈے سے Caterpillar برآمد ہوا اب اگر آپ اُس کا چند دن تک مشاہدہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ انڈے سے ایک کیڑا برآمد ہوا لیکن جو شخص آخر تک مشاہدہ کرے گا اُسے معلوم ہوگا کہ انڈے میں سے برآمد ہونے والا کیڑا آخر کار تتلی بن جائے گا۔ایک اور مثال گندم کی ہے۔کسان نے بیج بویا، گندم اُگی، آپ ہر مرحلہ پر مشاہدہ کرتے رہے یہاں تک کہ گندم بھوری ہوگئی، آپ کے جانے سے پہلے کسان نے گندم کاٹ کر زمین پر ڈال دی، لیکن پودے سے گندم کے دانے الگ کرنے کا مرحلہ آپ نے نہ دیکھا یوں آپ کا مشاہدہ نامکمل رہا کیونکہ آپ بتدریج تبدیلی کا آخری مرحلہ نہیں دیکھ سکے۔

دوسرا اصول

اچھا مشاہدہ وہ ہوتا ہے جس میں آپ کے حواسِ خمسہ استعمال ہوں۔آپ نے گلاب کا ایک پھول دیکھا۔آپ نے اُسے چھوا، چکھا لیکن سونگھا نہیں۔اب اِس مشاہدے میں سونگھنا ضروری تھا لیکن وہ آپ نے نہیں کیا۔ایسی صورت میں آپ کا مشاہدہ نامکمل رہا۔حواسِ خمسہ مشاہدہ کرنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں جو کسی مرحلہ پر کم نہیں ہوتی۔

مشاہدے کے اِن دو اصولوں کو ملحوظ رکھنے کے لیے جس اہم عنصر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہے صبر۔طبیعت کی بے چینی اچھے مشاہدے کی راہ میں بنیادی رُکاوٹ ہے۔لوگ مشاہدے کا شوق رکھتے ہوئے بھی اچھا مشاہدہ نہیں کر پاتے کیونکہ وہ اِن دونوں اصولوں سے ناواقف ہوتے ہیں اور طبیعت میں صبر کی کمی ہوتی ہے۔صبر و تحمّل سے کام لے کر با اصول مشاہدہ کرنے سے عرفان و ہدایت کے راستے انسان کے لیے کُھل جاتے ہیں۔اور وہ ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کر دیتا ہے اور یہی انسانی زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

یہ بھی ایک قرآنی اعجاز ہے کہ قرآن میں حواسِ خمسہ کا جس ترتیب سے ذکر آیا ہے اُس میں سب سے پہلے سننے کی قوّت ہے۔ اِسی لیے نومولود کے کام میں سب سے پہلے اذان سناتے ہیں۔ جو اِس کی لوحِ احساس پر نقش ہو جاتی ہے اور اُس کی روح مطمئن ہوتی ہے کہ اُس نے ایک مسلم گھرانے میں آنکھ کھولی ہے۔ آنکھ کھُلتے ہی ہر بچّہ اپنی آنکھوں سے اِرد گرد کی چیزوں کا مشاہدہ شروع کر دیتا ہے۔ اِس کے نتیجہ میں اُس کے ذہن پر مرتسم ہونے والے اولین نقوش جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتے ہیں ماں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ اُسے غور سے دیکھتا ہے جو اُسے گود میں لیے ہوتی ہے۔ اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا ہے۔ ماں اُسے بار بار چُھوتی ہے۔ وہ ماں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے ماں اُسے لوریاں سُناتی ہے۔ وہ ماں کا دُودھ پیتا ہے اور یوں اُس کے حواس خمسہ شب و روز ایک ہی شخصیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماں وہ نظریہ ہے جو بچے کے پہلے مشاہدے کی پیداوار ہے اور چونکہ یہ مشاہدہ تازہ دل و دماغ سے کیا جاتا ہے، کئی سال تک ہوتا ہے اور پورے حواسِ خمسہ کے ساتھ ہوتا ہے اِس لیے یہ نظریہ مرتے دم تک انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک انسان بے شمار مشاہدات کرتا ہے۔ افراد، اشیاء، جگہوں وغیرہ کے بارے میں اُس کا مشاہدہ اتنا مضبوط نہیں ہوتا جتنا ماں کا نظریہ۔ ایک مسلمان بچّے کو اُس کی ماں بچپن سے ہی اللہ کے بارے میں بتاتی ہے لیکن اُس میں بچے کا مشاہدہ شامل نہیں ہوتا۔ وہ اللہ پر اِس لیے یقین کرتا ہے کہ اُس کی ماں محبت اور خوف سے اللہ کا نام لیتی ہے۔ تقریباً ۱۶ سال کی عمر کے بعد انسان باقاعدہ طور پر اللہ کی صفات کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور اُس کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ۱۶ سال کے بعد اللہ کی صفات کا باقاعدہ مشاہدہ شروع ہوتا ہے۔ جو ہر انسان کو نصیب نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ صرف اپنی ماں کے خدا پر یقین رکھتے ہیں اور اِسی یقین کے ساتھ ساری زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ اور شعوری طور پر اللہ کو پہچان نہیں پاتے۔ ذاتی مشاہدے کا فقدان اُنہیں اللہ کی صفات کا براہ راست ادراک کرنے ہی نہیں دیتا۔

ماں کا تصور دراصل کسی فرد کا تصور نہیں۔ یہ محبت کا ایک ہمہ گیر آفاقی نظریہ ہے۔ یعنی انسان دنیا میں آنے کے بعد جو پہلا نظریہ قائم کرتا ہے وہ محبت کا ہوتا ہے۔ انسان کے حواسِ خمسہ کا بھرپور استعمال اور وہ بھی کئی سال تک انسان کے ذہن پر ماں کی محبت کے پاکیزہ نقوش مرتسم کر دیتا ہے۔ اِس لیے وہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

بلوغت کو پہنچنے کے بعد اپنی مرضی سے جو پہلا نظریہ قائم کرے گا۔ وہ بھی محبت کا ہی ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پیدائش کے بعد تشکیل پانے والے ماں کی محبت کے پہلے نظریے پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ صرف اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے بلوغت انسان کی دوسری پیدائش ہے اب انسان ذمہ داری کے ساتھ سوچ سمجھ کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ محبت کا نظریہ اب بھی اُس کی زندگی میں کارفرما ہوتا ہے۔ مگر اب اُس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ اور انسان کو گہرے مشاہدہ سے کام لے کر فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ اِن فیصلوں میں ہر شخص ذاتی اختیار کو بروئے کار لا سکتا ہے۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنی محبت سے آشنا کرنے کے لیے ماں کی محبت بطور بنیاد پہلے ہی فراہم کردی تھی۔ اب مشاہدے سے پیدا ہونے والی محبت اپنی شدت میں زیادہ ہوتی ہے، اگرچہ نوعیت وہی ہوتی ہے۔ فرق صرف اختیار کا ہوتا ہے۔

انسان کا دنیا میں آنے کا مقصد اللہ سے محبت ہے۔ لیکن اِس محبت کو پیدا کرنے کے لیے مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مشاہدہ کیسے کیا جائے؟ کیا ہمارے اردگرد موجود ہر چیز اپنے اندر یہ قوت رکھتی ہے کہ اُس کا مشاہدہ اللہ کی محبت پیدا کردے۔ اِس کا جواب ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔

قرآن میں خدا شناسی کے لیے بعض آیات یعنی نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پہچان کے لیے اِن نشانیوں کے مشاہدے کا حکم دیا ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے لیے بعض چیزوں کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ قرآن میں دی گئی اِن لاتعداد نشانیوں کو ہم ۳ اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ قرآن

سب سے پہلا مشاہدہ تو بذاتِ خود قرآن کا ہے۔ قرآن پڑھنے سے علم کے خزانے کھلتے ہیں۔ قرآن کا مشاہدہ گویا اللہ کا مشاہدہ ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز امر ہے۔ جوں جوں انسان کے ذہن میں قرآن کی عبارات کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ انسان کے اندر اللہ کی صفات کا ادراک بڑھتا جاتا ہے۔

۲۔ کائنات کا مطالعہ

قرآن کا مطالعہ انسان کو اپنے ماحول اور معاشرہ کے مشاہدہ کی ترغیب دیتا ہے۔ انسان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

دوسرے لوگوں کے رہن سہن، خیالات، اور فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے اِس مشاہدے کی بدولت ایک تصویر ظہور پذیر ہونے لگتی ہے یہ تصویر مکمل ہونے پر اللہ کی صفات اجاگر ہو جاتی ہیں۔ قرآن میں جن اشیاء کے مشاہدے کا خاص طور پر ذکر ملتا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سورج، چاند اور ستارے یعنی اجرامِ فلکی۔

۲۔ نباتات یعنی درخت، پھول اور پودے۔

۳۔ دن اور رات کی تبدیلی اور دوسرے موسمی تغیّرات۔

۴۔ برّی و بحری نشانیاں مثلاً پہاڑ، دریا، وادیاں، صحرا، سمندر اور آبی مخلوقات۔

۵۔ مویشی، حشرات، درندے اور پرندے۔

۶۔ انسان کی اپنی ذات یعنی میڈیکل سائنس اور علم الابدان۔

۳۔ تاریخ

تاریخ بھی ایک اہم مشاہدہ ہے جس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اللہ کا غصہ کس طرح اور کس قسم کے لوگوں پر نازل ہوا۔ کونسی قومیں اُس کے انعامات کی مستحق ٹھہریں اور کیوں؟ اِس کے لیے قرآن میں پچھلی قوموں کے قصے ملتے ہیں۔ اِسی طرح ہمیں زمین پر گھوم پھر کر عبرت ناک کھنڈرات کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پودے کی پیدائش سے لے کر انسان کی پیدائش تک اور پھر ان سب کی پرورش اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کا مشاہدہ ہے۔

یہ سب مشاہدات اللہ کی ذات سے محبت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہی انسان کا مقصدِ تخلیق ہے۔ اِسی لیے انسان اشرف المخلوقات کے درجہ پر فائز ہے۔

آخر میں اپنی قوتِ مشاہدہ کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب دیجئے:

س ۱۔ مجھے مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا مشاہدہ کرنے میں دلچسپی ہے؟

قدرتی مناظر	حیوانات	اجرامِ فلکی
لوگوں کے عادات واطوار	پودے	کیڑے
انسان کی بنائی ہوئی اشیاء	پرندے	دوسری چیزیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

س۲:۔ میں کتنی دفعہ مشاہدہ کرتا ہوں؟

دن میں دو بار — دن میں تین بار — دن میں ایک بار

ایک دن چھوڑ کر — ہفتے میں دو بار — ہفتے میں ایک بار

س۳:۔ میں مشاہدہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل حواسِ خمسہ کا استعمال کرتا ہوں؟

آنکھیں، دیکھنا — ناک، سونگھنا — کان، سُننا

زبان، چکھنا — ہاتھ، محسوس کرنا

س۴:۔ میں مشاہدہ کرنے کے بعد؟

صرف سوچتا ہوں — دوسروں سے تبادلۂ خیالات کرتا ہوں — لکھ لیتا ہوں

اُس کے بارے میں مزید پڑھتا ہوں — اُسے بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہوں

س۵:۔ میرا مشاہدہ کرنے کا دورانیہ؟

پانچ منٹ — ۳۰ منٹ — ایک گھنٹہ

۳ گھنٹے — ۵ گھنٹے — ۸ گھنٹے

س۶۔ :مندرجہ ذیل اشیاء مجھے مشاہدے سے روک دیتی ہیں؟

بھوک یا کوئی اور حاجت — بوریت — دوست یا گھر والوں کی پکار

آوازیں یا موسیقی — تھکان — دوسری ذمہ داریاں

س۷:۔ مجھے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے؟

خصوصی مشاہدہ — عمومی مشاہدہ

یہاں دو طرح کے مشاہدہ کی بات بھی ہو جائے۔ ایک مشاہدہ خصوصی ہوتا ہے یعنی کسی ایک ہی چیز پر توجہ مرکوز کر کے اُس کا مشاہدہ کرنا۔ مثلاً ایک باغ میں بہت سے بچّے کھیل رہے ہیں آپ اُن میں سے صرف ایک بچّے کا مشاہدہ کر رہے ہیں ایسا کرتے وقت آپ اُس بچّے کی ظاہری حرکات وسکنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور تھوڑی دیر میں آپ اُس کے کسی کام کے باطنی عوامل تک پہنچ جاتے ہیں۔ فرض کیجئے آپ دیکھتے ہیں کہ بچّہ دوسرے بچّوں سے کھانے پینے کی چیزیں چھین رہا ہے۔ اِس حرکت کا مشاہدہ آپ فوراً کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ حرکت بچّے کی بدتمیزی کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد آپ کو احساس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشاہدہ

ہوتا ہے کہ بچّہ اکیلا ہے اور صرف اُن بچّوں سے چیزیں چھین رہا ہے جو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہیں۔ وہ اکیلے بچّوں سے بالکل تعرّض نہیں کرتا۔ آپ اُس کا ایک گھنٹے تک مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ایک بڑی لڑکی آتی ہے اور اُس بچّے کو لے کر گھر کی طرف چل پڑتی ہے۔ آپ اُس کے پاس جاتے ہیں اور پوچھنے پر پتا چلتا ہے کہ اُس بچّے کے ماں باپ مر چکے ہیں وہ تنہا ہے۔ اور بڑے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اُن کے بچوں سے چیزیں چھین رہا ہے۔ یہ ایک خصوصی مشاہدہ تھا۔

عمومی مشاہدہ پارک میں موجود تمام بچّوں کا ہوسکتا ہے۔ یعنی بچّے کون سے کھیل کھیلتے ہیں؟ پارک کے کس حصہ میں بچّے زیادہ ہیں؟ کس وقت پارک میں بچّوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے؟ کتنے بچّے اپنے والدین کے ساتھ ہیں اور کتنے اکیلے ہیں وغیرہ وغیرہ؟

تاریخ میں اِس مشاہدے کی ایک اچھی مثال رسول اللہ ﷺ کی وہ دعا ہے جو آپ مکّہ کے مشکل دور میں کیا کرتے تھے۔ کہ وہ دو ''عمر'' میں سے کسی ایک کو مسلمان کردے۔ اِس دعا کے پیچھے دو عمومی اور دو خصوصی مشاہدات کارفرما تھے۔ دو عمومی مشاہدوں میں شامل تھے مسلمان اور کفار اور دو خصوصی مشاہدوں کے مرکز دونوں عمر تھے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

۵. تجزیہ

جین پیاجے Jean Piaget کا شمار بیسویں صدی کے عظیم ترین دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ہر دانشور اپنی سوچ کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ جین پیاجے Jean Piaget اِس لحاظ سے منفرد ہے کہ اُس کی زندگی یہ سوچنے میں گزری کہ انسان سوچتا کیسے ہے؟ اُس کی تحقیق نے موجودہ دور میں پہلی دفعہ ایک منظّم نظامِ فکر کا تعیّن کیا جس کی بدولت ہم سوچتے ہیں۔

دوسرے سوئس باشندوں کی طرح جین پیاجے Jean Piaget بھی مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اللہ کی ذات بتا کر یا بغیر بتائے کس سے کب کیا کام لے یہ سمجھنا انسان کی دسترس میں نہیں۔ جین پیاجے Jean Piaget کے بارے میں بھی یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ اُس کی تحقیق نے جہاں مغربی دنیا کے نظامِ تعلیم میں انقلاب برپا کیا وہیں اُس کی تحقیق کے بعض پہلو قرآن فہمی کے لیے کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

انسانی ذہن سوچتا کیسے ہے؟ ہم کس طرح نئے خیالات پیدا کرتے ہیں اور کس طرح موجودہ نظریات کو تبدیل کرتے یا وسعت دیتے ہیں؟ اِس حوالے سے جین پیاجے Jean Piaget کی تحقیق کا اب تک کوئی مدِ مقابل نہیں ہے۔ اِن سوالوں کے جواب کی خاطر اُس نے خاص طور پر بچّوں کا مشاہدہ کیا۔ بچّوں کے ساتھ بہت سے باقاعدہ کھیل کھیلے جن سے اُن کے سوچنے کے انداز کا پتا چلایا۔ وہ دن بھر پارک میں بیٹھا بچّوں کا مشاہدہ کرتا رہتا۔ ہم اِس باب کا آغاز جین پیاجے Jean Piaget کی تحقیق سے کرتے ہیں۔ یوں تو اُس کی ۳۳ کتابوں اور سینکڑوں تحقیقی مقالات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں لیکن یہاں ہم اُس کی تحقیقات کا اجمالاً تذکرہ کریں گے جن کی بدولت ہمیں اپنے مضمون کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔

سب سے پہلے تو جین پیاجے Jean Piaget نے بتایا کہ انسان مشاہدہ کرنے اور سوچنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا ہے پھر اپنی رائے اور مشاہدات کو ایک ''فائل'' میں ڈال دیتا ہے۔ انسانی دماغ اپنے اندر سینکڑوں فائلیں رکھتا ہے۔ ہر فائل (جس کو انہوں نے schmata کا نام دیا) میں مختلف نوعیت کی معلومات ہوتی ہیں۔ مثلاً ''ماں'' کی فائل میں ہمیں اپنی ماں کی شکلیں، قدوقامت، پسند ناپسند اور کئی طرح کی معلومات مل سکتی ہیں۔ یہاں ہمیں حقائق اور تاریخیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ہماری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والدہ کی عمر یا تاریخ پیدائش، اِس فائل میں متحرک فلمیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً چند سیکنڈ سے لے کر چند منٹ تک کی وڈیو جس میں ہم اپنی ماں کو کھانا پکاتے، ہنستے بولتے یا کسی موقع پر ہمیں سمجھاتے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ وڈیو صرف ہمارے دماغ کی اسکرین پر چل سکتی ہے (سائنسدان اِس کوشش میں ہیں کہ اِسے ظاہری دنیا میں بیرونی سکرین پر بھی منتقل کیا جائے۔ ابھی تک تو کامیابی نہیں ہوئی لیکن احادیث سے پتا چلتا ہے کہ دجال کے پاس یہ قوت ہوگی) یہ فائل پیدائش کے فوراً بعد تخلیق ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ پیدائش کے وقت ہمارے دماغ میں شعوری سطح پر کوئی فائل موجود نہیں ہوتی۔ پہلے مشاہدہ اور تجزیہ کے فوراً بعد پہلی فائل وجود میں آجاتی ہے اور یہ عام طور پر ماں کی فائل ہوتی ہے انسان عمر کے آخری حصہ تک فائلیں تخلیق کرتا رہتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں نہ صرف فائل بننے کا سلسلہ سست ہوتے ہوتے رُک جاتا ہے بلکہ بعض فائلیں بڑھاپے یا کسی حادثے کی وجہ سے غائب ہونا شروع ہوجاتی ہیں اور بالآخر انسان کا ذہن ایسا ہی ہوجاتا ہے جیسے پیدائش کے وقت ہوتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے اللہ نے قرآن میں بچپن کی طرف ''لوٹائے'' جانے سے تشبیہہ دی ہے۔

انسان کا مشاہدہ اِن فائلوں کی تعداد یا کسی فائل کے حجم میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ آپ نے کسی معروف شخصیت کے بارے میں پڑھا ہو یا سُنا ہو۔ آپ کی فائل میں فقط دوسروں کی رائے ہی محفوظ ہوگی۔ جس دن آپ اُس سے ملیں گے آپ کی فائل میں چند لمحوں میں بہت کچھ اضافہ ہوجائے گا۔ اگر ہم انسانوں سے متعلق بننے والی فائلوں کو حضرت عمرؓ کے قول کی روشنی میں دیکھیں تو کسی انسان کی فائل اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب ہم اُس کے ساتھ مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک معاملہ کرتے ہیں۔

۱۔ پیسے کا لین دین

۲۔ ساتھ کچھ دن گزارنا

۳۔ اکٹھے سفر کرنا

جین پیاجے Jean Piaget کے مطابق انسان کے دماغ میں جتنی زیادہ فائلیں ہوں گی اور اُن فائلوں میں جتنی زیادہ معلومات ہوں گی انسان اتنا ہی زیادہ ذہین ہوگا۔ ظاہر ہے فائلوں کی تعداد بڑھانے یا معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ہمیں مزید مشاہدے کی ضرورت ہے۔ انسانی ذہن معلومات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے علاوہ دوسری قسم کی فائلیں بھی اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے۔اُن کے بارے میں مزید گفتگو نتیجہ کے باب میں ہوگی۔ یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ انسانی ذہن بہت سی فائلوں کو اپنے اندر سمیٹے رکھتا ہے اب ہم آتے ہیں تجزیہ کی طرف۔

تجزیہ کیا ہے؟

تجزیہ مشاہدہ کے بعد کا عمل ہے۔مشاہدہ سے حاصل ہونے والی معلومات انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے دماغ میں داخل ہوتی ہیں۔سب سے پہلے تو حواسِ خمسہ سے داخل ہونے والی معلومات آپس میں ٹکراتی ہیں مثلاً آپ کمرے میں بیٹھے ہیں۔باہر سے آپ کو قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔پھر ایک فرد کمرے میں داخل ہوتا ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کا دوست ہے۔اِس کے بعد آپ کے دوست کی شکل اُس کے قدموں کی آواز سے مل جاتی ہے آپ ہمیشہ کے لیے اُس کے قدموں کی آواز کو اُس کی شکل سے وابستہ کر دیتے ہیں۔اور قدموں کی آواز سُنتے ہی آپ آنے والے کو پہچان لیتے ہیں۔

آپ باورچی خانہ میں کھڑے ہیں جہاں ائیر کنڈیشنر اور بلینڈر چل رہے ہیں وہیں ایک بچہ رو رہا ہے۔ایک خاتون چیخ کر اپنے بڑے بیٹے کو بلا رہی ہیں تیز پنکھا چلنے کی وجہ سے دیوار پر لٹکا درجہ حرارت کا آلہ دیوار سے ٹکرا کر ایک آواز پیدا کر رہا ہے۔ایک سیکنڈ یا اِس سے بھی کم عرصے میں آپ کے دماغ کا تجزیہ کرنے کا شعبہ سب آوازوں کو الگ الگ چیزوں سے منسوب کر دیتا ہے اور آپ ہر ایک آواز سے آواز پیدا کرنے والی چیز یا شخص کو پہچان لیتے ہیں۔اِسی طرح ہم چیزوں کے ذائقے، بدبو یا خوشبو کو اِن چیزوں کے ساتھ ملاتے ہیں۔اور ایک ایک چیز کو الگ الگ پہچان لیتے ہیں۔ جب کوئی چیز حواسِ خمسہ کے مشاہدے سے گزر کر تجزیہ کی سطح پر پہنچ جاتی ہے اور اُس چیز کے بارے میں معلومات مرتّب ہوجاتی ہیں تو دماغ اُس چیز کی فائل ڈھونڈتا ہے۔اگر اُس کی فائل مل جائے تو یہ معلومات اُس کی فائل میں شامل ہوجاتی ہیں ورنہ ایک نئی فائل کھول لی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابیؓ کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔یہ سُن کر حضرت عمرؓ اُس صحابی کے مہمان ہوگئے تا کہ دیکھ سکیں، اُس میں کیا خاص بات تھی۔آپ نے اُس کی ہر حرکت کا مشاہدہ کیا لیکن کوئی ایسی بات نہ پائی جو غیر معمولی ہو۔حضرت عمرؓ کو یقین تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی بات سچ تھی اور اُس صحابیؓ میں ضرور کوئی ایسی خوبی موجود تھی۔آخر آپ نے اُس سے دریافت کیا ایسی کیا بات

تجزیہ

ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے آپ کو جنتی ہونے کی خوشخبری دی صحابیؓ نے بتایا اس کی عادت تھی کہ ہر شب سونے سے پہلے ہر فرد کو معاف کر دیا کرتا تھا، ظاہر ہے یہ الفاظ اُس صحابیؓ کی فائل میں ایک اضافہ تھا بات سمجھ میں آ گئی اور حضرت عمرؓ واپس لوٹ آئے۔

اب اگر جین پیاجے Jean Piaget کی تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے جب یہ فرمایا تو کئی صحابہؓ وہاں موجود تھے۔ سب نے بات سنی سب نے اِس کو سچ جانا۔ سب نے اس صحابیؓ کے حوالے سے دماغ کی فائل میں یہ بات شامل کر لی کہ وہ جنتی تھا جو کہ بلاشبہ ایک اعزاز تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دماغ میں ایک سوال ابھرا: کیوں؟ حضرت عمرؓ نے صحابیؓ کا تین دن اور تین راتیں مہمان بن کر مشاہدہ کیا۔ آخر کار سوال کرنے پر اُن کے مشاہدے میں ایک نئی بات آئی جو دوسروں کے دماغ میں نہیں آ سکی۔ حضرت عمرؓ کی یہ فائل اب اپنے اندر اضافی معلومات رکھتی تھی۔ اِن اضافی معلومات کی وجہ سے وہ اب دوسروں سے زیادہ ذہین مانے جائیں گے۔ حضرت عمرؓ کا تجسّس دوسرے مواقع پر بھی نظر آتا ہے۔ اور یہی اُن کی ذہانت کی دلیل ہے۔

گہرا مشاہدہ تیز رفتاری سے دماغ کے اندر داخل ہوتا ہے۔ جہاں وہ تیزی سے تجزیہ کی مشین کو حرکت دیتا ہے۔ دماغ میں موجود فائلیں کُھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس سے متعلق کتنی فائلیں ہمارے دماغ میں موجود ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ یہ معلومات موجودہ فائلوں میں کہیں چلی جائیں ایسا نہ ہونے کی صورت میں نئی فائل جنم لیتی ہے۔ نئی فائل میں ہم موازنہ بھی کرتے ہیں نئی چیز کا پہلے سے موجود چیزوں سے اور یہ ایک اہم بات ہے۔ مثلاً ہم کسی کو ہاتھی کے بارے میں بتائیں تو ہم کہیں گے کہ یہ زرافے جتنا لمبا ہے۔ اب اِس کے لیے ضروری ہے کہ اُس فرد نے زرافہ دیکھا ہو۔ تا کہ وہ موازنہ کر سکے۔ اگر زرافہ کی فائل موجود نہ ہو تو ہمیں ناپنے کے پیمانے (فٹ، میٹر) کا سہارا لینا ہوگا۔

یہی صورت جذبات کی ہے۔ ہم ماں کے پیار کو جانتے ہیں۔ پھر جب ہمیں پتا چلتا ہے کہ اللہ ہم سے ماں کی نسبت ستر گُنا زیادہ پیار کرتا ہے تو اب ہمارے پاس ایک پیمانہ ہے اللہ کے پیار کو ناپنے کا۔ اب ہمارے پاس تمام مشاہدات کی روشنی میں اللہ کی محبت کی ایک فائل ہے جس کا موازنہ ماں کی محبت سے کیا جا سکتا ہے۔

کافر کون ہے؟ اِس نظریئے کی روشنی میں تو کافر وہ ہے جس نے ناکافی مشاہدات کے ساتھ جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تجزیہ

فائل تخلیق کی ہے وہ اپنے اندر ناکافی معلومات رکھتی ہے۔ یہ فائل نامکمل ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ وہ مزید مشاہدہ کرے تاکہ اُس کی فائل مکمل ہو، اِس مشاہدے کے لیے جن نشانیوں کی ضرورت ہے اُن کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔

ایک کافر کی فائل میں اللہ کے بارے میں معلومات اُس کے اپنے مشاہدے پر مشتمل نہیں ہوتیں۔ اِن کے اصل ماخذ اُس کے بزرگ، قرابت دار، مذہبی اور سیاسی رہنما، اُس کے دوست بلکہ اُس کی اپنی خواہشات ہوتی ہیں۔ وہ جسے مشاہدہ سمجھتا ہے وہ دراصل دوسروں کی سوچ ہوتی ہے۔ دوسروں کی رائے کو مشاہدہ تصور کرنا ایک ایسی خامی ہے جو انسان کے تجزیہ کو بگاڑ دیتی ہے انسان غلط نتیجے اخذ کرتا ہے اور گمراہ ہو جاتا ہے۔

اب ہم آتے ہیں جین پیاجے Jean Piaget کی ایک اور تحقیق کی طرف جین پیاجے نے بتایا ہے کہ قدرتی طور پر دماغ کی فائل میں خالق کا تصور محفوظ ہوتا ہے۔ ہر بچہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے اردگرد ہر چیز کا کوئی خالق ہے یا تو اُس چیز کو انسان نے بنایا ہے یا پھر خدا نے۔ یہ ایک دلچسپ اور اہم تحقیق ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے مشاہدے میں آنے والی ہر شے کا ایک خالق ہونا چاہئے۔ انسان کا ذہن یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ کوئی چیز خالق کے بغیر وجود میں آسکتی ہے۔ خاص طور پر اپنی فائل مکمل کرنے کے لیے بچوں کو یہ جاننے کی ضرورت پڑتی ہے کہ یہ چیز کس کی ہے؟ یا کس نے بنائی ہے؟ یا یہ کہ کیسے بنی ہے؟ انسانی ذہن مشاہدہ کے بعد تجزیہ کے مرحلے میں یہ ضرور سوچتا ہے کہ مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کو کس نے بنایا ہے۔ اِس لیے قرآن نے بار بار سوچنے یعنی تجزیہ کرنے کی دعوت دی ہے ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ ہم مخصوص نشانیوں کو دیکھ کر غور کریں کہ وہ کیسے کام کر رہی ہیں۔ مثلاً بارش کیسے ہو رہی ہے؟ انسانی حیات کیسے وجود میں آ رہی ہے؟ پودے کیسے اُگ رہے ہیں؟ قرآن جگہ جگہ ''کیسے'' کا سوال پوچھتا ہے۔ جب ہم ''کیسے'' کے بارے میں سوچنا شروع کرتے ہیں تو لامحالہ یہ سوال ہمیں ''کون'' تک لے جاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ''کیسے'' لوہے کا ٹکڑا ہے جو تجزیہ کے مرحلے پر کھنچ کر ''کون'' کے مقناطیس سے چپک جاتا ہے۔ ہر ''کیسے'' کا سوال فطری طور پر ''کون'' کی منزل پر لے جاتا ہے یہ ایک فطری امر ہے جس کو جین پیاجے Jean Piaget نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا۔

انسان ہمیشہ سے ہر چیز کا خالق کسی نہ کسی کو سمجھتا تو آ رہا ہے اب تک وہ سمجھتا تھا کہ خالق کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تجزیہ

بہت سے مدد گار ہیں کیونکہ وہ یہ سب کچھ خود تخلیق کرنے سے یا تو قاصر ہے یا اُسے سب کچھ تخلیق کرنے میں مدد درکار رہے۔ انسان نے دیکھا کہ وہ خود تخلیق کرنے میں تھکن محسوس کرتا ہے اور مدد کا طالب ہے پھر جب خدا کو بہ حیثیت خالق دیکھنے کا وقت آیا تو اُس نے خدا کا موازنہ اپنی ذات سے کرلیا اور تجزیہ کرکے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خدا بھی مدد کے بغیر سب کچھ نہیں بنا سکتا یوں خدا کے شریک وجود میں آگئے۔ مسئلہ یہ ہوا کہ کائنات میں تخلیق کا عمل صرف دو ہستیوں کے اختیار میں ہے ایک اللہ کی ذات ہے اور دوسرا انسان۔ اِن دونوں کے علاوہ سوچ کے بل پر کوئی تخلیق نہیں کرسکتا تو لامحالہ انسان نے بطور تخلیق کار اللہ کو اپنی ذات پر محمول کرلیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ خود ساتھیوں کی مدد کے بغیر کچھ تخلیق نہیں کرسکتا تو اُس نے کائنات کے خالق اور رب کی جو فائل بنائی مشاہدے کے بغیر اُس میں اُس کے مددگار ڈال دیئے۔

اِس لیے قرآن ایسے تجزیہ کو ناقص قرار دیتا ہے کافر کی فائل ناقص ہوتی ہے۔ اُس کا ذہنی نظام تنزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ تقریباً پچھلے دوسو سال سے یہ صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ اب انسان سوچتا ہے کہ وہ خود تو تخلیق کار ہوسکتا ہے خدا نہیں۔ یعنی اُس نے اپنی بنائی ہوئی چیزوں پر تو ''خود ساختہ'' کی مہر لگائی۔ کاپی رائٹ کے قوانین وضع کیے لیکن اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو اتفاق یا ارتقاء کا نام دے دیا۔ انسانی تاریخ میں ایسا دور کبھی نہیں آیا کہ اُس نے اپنے علاوہ کسی خالق کا نام ہی غائب کردیا ہو اور کائنات اور دوسرے موجودات بلکہ اپنی ذات کے ظہور کو خالق کے بغیر تسلیم کرلیا ہو۔ پہلے انسانی تجزیہ ایک سے زیادہ خالق بنالیا کرتا تھا۔ اب انسان خالق کے بغیر چیزوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ ایک سے زیادہ خداؤں کی وجہ سے اُس کی شخصیت بہت سے خانوں میں بٹ گئی تھی۔ ایسا کرنے سے وہ دباؤ کا شکار ہوا اور اُس کی تخلیقی صلاحیتیں سلب ہوگئیں۔ آج کے دور میں جب اُس نے خالق کی ذات سے ہی انکار کردیا ہے تو اب وہ ہر پابندی سے آزاد ہوگیا۔ اُس کی تخلیقی صلاحیتیں کسی بندش کو قبول نہیں کرتیں۔ اُس نے تمام حدود مٹادیں۔ وہ بکھر گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لاتعداد ذہنی، جسمانی، نفسیاتی اور روحانی بیماریوں کا شکار ہے۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ جو تجزیہ اللہ کی ذات کو شامل کرکے کیا جائے وہ Human Brain کی سطح پر ہوتا ہے۔ یہ تجزیہ بہترین ہوتا ہے کیونکہ اِس میں ہم سکون کے ساتھ پچھلی تمام معلومات یعنی فائلوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تجزیہ کرتے ہیں، اگر اللہ کی ذات کو تجزیہ میں شامل نہ کریں تو دوسرا مرحلہ Mammal Brain کا آتا ہے جہاں ہم تجزیہ کرتے وقت لوگوں پر انحصار کرتے ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تجزیہ

دوسرے لوگوں کی رائے، اُن کی پسند، ناپسند ہمارے تجزیہ کا حصہ بن جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں قائم ہونے والے نظریات اور فیصلے کمزور ہوتے ہیں چونکہ وہ لوگوں کو ذہن میں رکھ کر قائم کیے گئے ہیں اور اللہ کی پسند اور ناپسند کو نظرانداز کیا گیا ہوتا ہے اس لیے لوگوں کی رائے تبدیل ہوتے ہی ہمارے نظریات کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی ہم شدید مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ دنیا کے بیشتر لوگ Mammal Brain کی سطح پر سوچتے اور عمل کرتے ہیں اس لیے یہ بتانا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کہ دنیا کے بیشتر لوگوں کے دماغ میں جھانک کر اُن کی فائلوں کو کھولا جائے تو اُن میں اللہ کی ذات بطور رب اور خالق نظر نہیں آئے گی۔ چونکہ ہر نئی فائل کے بننے میں پہلے سے موجود فائل اہم کردار ادا کرتی ہے اس لیے نئی فائلوں میں بھی اللہ کی ذات تجزیہ کا حصہ نہیں بنتی۔ بلکہ عوام کی رائے یا کسی ایک شخص کی ذات تجزیہ کا حصہ ہوتی ہے۔ تو فائل کی معلومات والا نظریہ غلط ہونے کی صورت میں انسان شدید کرب کا شکار ہو جاتا ہے۔

کرب کا شکار ہوتے ہی انسان پر تجزیہ کرنے کے دو راستے کھل جاتے ہیں۔ یا تو وہ ایک سیڑھی اوپر Human Brain کے درجہ پر جا سکتا ہے۔ جہاں پر وہ اپنے ماضی کی تمام فائلوں کو دوبارہ کھولے گا۔ اِن کا تجزیہ کرے گا تو اُسے احساس ہوگا کہ اِن فائلوں میں تو کہیں اللہ کی پسند، ناپسند کا خیال ہی نہیں رکھا گیا اُس کا تجزیہ اسے بتائے گا کہ اُس کی فائلوں کے سارے اجزا تو لوگوں کے حوالے سے تھے کیونکہ اُس نے اپنے آس پاس موجود لوگوں کی رائے کو اہمیت دیتے ہوئے فائلیں بنائی تھیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ اپنی فائلوں کو نئے سرے سے لکھے گا۔ تمام فائلوں کا تجزیہ دوبارہ کر کے اپنی زندگی کو تبدیل کر لے گا۔ تجزیہ اور تبدیلی کا یہ پورا عمل کئی ماہ تک چلتا رہتا ہے کیونکہ ایک ایک کر کے انسان کو بہت سی فائلوں کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا راستہ ہے Reptile Brain کا۔ انسان کو لوگوں سے ٹھیس لگے، اُس کے ارادے ٹوٹ جائیں یا اُس کے نظریات غلط ثابت ہوں تو وہ لوگوں کی غلامی چھوڑ کر اپنے جذبات کی غلامی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہر پابندی اور حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اُسے پہلے تو اللہ کا خیال نہیں تھا۔ اب وہ لوگوں کو بھی نظرانداز کر دیتا ہے۔ ایسا انسان اپنی فائلوں کا جنونی انداز میں دوبارہ تجزیہ کرتا ہے اور چُن چُن کر ایسے لوگوں کے نام محو کر دیتا ہے جن سے متاثر ہو کر اُس نے نظریات قائم کیے تھے۔ اب وہ صرف ''میں،

تجزیہ

میرا شوق، میری لذت، میرا مزا'' کی فکر کرتا ہے۔اور باقی سب کچھ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی بھلا کر خود لذّتی میں مشغول ہو جاتا ہے یہی وہ حالت ہے جس کے بارے میں اللہ نے قرآن میں کہا ہے کہ اُن لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے اُن کو اپنی ذات سے غافل کر دیا۔خود لذتی کی سطح پر بھی انسان کا تجزیہ جاری رہتا ہے وہ مزید لذت کے لیے شب و روز کوشاں ہوتا ہے جو اُس کی جبلت بن جاتی ہے۔

آخر میں ایک دلچسپ بات جین پیاجے Jean Piaget کے حوالے سے۔ دنیا کو یہ بتانے والا کہ ہر بچّہ ہر چیز کے خالق کا نام پوچھتا ہے۔اپنے وضع کردہ نظامِ تعلیم میں اللہ کی ربوبیت کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ بچوں کو اللہ کے خالق ہونے کا درس کیسے دیا جائے۔ وہ اِس بارے میں خاموش رہا۔ اِسی لیے مغربی تعلیم جاندار اشیاء کو ایک ارتقاء کی لڑی میں پرو کر اللہ کی خالقیت اور ربوبیت سے مبرّا کر دیتی ہے۔ اِس نظام تعلیم سے مستفید ہونے والے بمشکل اپنے تجزیئے میں اللہ کی ذات کو شامل کرتے ہیں۔ اِس نظام تعلیم کے زیرِ اثر مسلمان بچے بھی اسی مخمصے کا شکار ہوتے ہیں۔ یوں تو وہ نماز پڑھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں لیکن اُن کے دماغ کی بیشتر فائلیں مغربی نظامِ تعلیم کی مرہونِ منت ہیں۔ اِس لیے اُن میں اللہ کا نام نہیں ۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اللہ کی ذات کا عمل دخل ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی تضاداُن کی فکر کو مفلوج کیے رکھتا ہے۔ جدید مسلم ذہن کی آدھی فائلوں میں اللہ کا ذکر ہے آدھی اِس سے خالی ہیں۔ اِسی لیے ہمیں مسلمان معاشروں میں ہر طرف منافقت نظر آرہی ہے۔ مغربی ذہن اِس کے برعکس کُلیتاً اللہ کے نام سے خالی ہے۔اسلام لانے کی صورت میں مغرب کا مسلمان اپنی ہر فائل اللہ پر ایمان کی روشنی میں نئے سرے سے ترتیب دیتا ہے، مگر پیدائشی مسلمان انتشار اور بے یقینی کی کیفیات میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی ترقی میں تجزیہ کا بڑا ہاتھ ہے جہاں انسان نے مشاہدہ کرنے کے لیے دوربین اور خوردبین ایجاد کی ہیں۔ وہیں تجزیہ کرنے کے لیے بھی مشین بنائی ہے۔ اِس کا نام ہے کمپیوٹر۔آج کمپیوٹر سے بے شمار کام لیے جاتے ہیں لیکن پہلے پہل کمپیوٹر تجزیہ کرنے کے لیے ہی بنا تھا۔اور آج بھی دنیا کا جدید ترین کمپیوٹر تجزیہ کرنے کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔صنعت کاری میں بھی جاپانی ماہرین نے مصنوعات کا معیار جانچنے کے لیے بہت سے تجزیاتی طریقے وضع کیے ہیں۔اور جاپان کی صنعتی ترقی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اِن کا بڑا حصہ ہے۔ اِن کی بدولت اُنہوں نے دنیا بھر کی تجارتی منڈیوں پر قبضہ کرلیا ہے۔

تجزیہ اور میڈیا

تجزیہ کرتے وقت جہاں انسانی دماغ مشاہدے سے حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کرتا اور اُنہیں پہلے سے موجود معلومات سے ملاتا ہے وہیں تجزیہ کے مرحلے میں انسانی ذہن مشاہدے سے حاصل ہونے والی معلومات میں سے سچ اور جھوٹ کو چھانٹ بھی لیتا ہے۔ مثلاً افریقہ کے بارے میں آپ کوئی بات سنیں یا پڑھیں اور آپ کو یہ خبر ملے کہ افریقہ میں کینگروؤں (Kangaroos) کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے تو آپ اپنے دماغ میں موجود افریقہ کی فائل میں دیکھ سکتے ہیں کہ افریقہ میں کینگرو نہیں پائے جاتے۔

سب مشاہدات کا تجزیہ کرتے وقت ہم تیار رہتے ہیں کہ ہمیں سچ کو جھوٹ یا حقیقت کو مبالغہ آرائی سے الگ کرنا ہے۔ قرآن اور حدیث کے علاوہ کوئی بھی ایسا مواد نہیں جسے ہم یقین کے ساتھ اپنی فائل کا حصہ بنالیں۔ زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ اللہ نے قرآن کی طرح اُن کو بھی آیات کہا ہے جس کا مطلب ہے کہ اُن کے سچے ہونے کا ذمہ اللہ کا ہے۔ اور جس چیز کے سچ ہونے کا ذمہ اللہ لے لے اُس کے مشاہدے میں جھوٹ کی آمیزش کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہاں ہمیں تجزیہ کرتے ہوئے یہ خوف نہیں ہوتا کہ جس چیز کا مشاہدہ کیا گیا ہے وہ سچی بھی ہے یا نہیں۔ مسلمانوں کے پاس یہ علم ہے کہ اللہ نے ایک خلیے سے لے کر دور دراز کی کہکشاؤں تک ہر چیز حق کے ساتھ پیدا کی۔ پھر قرآن اور سنت کا علم حق کے ساتھ دیا۔ اِس لیے وہ مطمئن ہیں کہ اِس علم کے ذرائع میں شک نہیں۔ اگر معلومات کی صحت پر اعتراض ہو اور دماغ کی بہت سی قوت اور وقت تجزیہ کرنے کے مرحلے میں سچ اور جھوٹ الگ کرنے میں صرف ہو جائے تو یہ ایک افسوس ناک صورت ہوگی۔

چونکہ مسلمانوں کے تقریباً تمام علوم قرآن اور حدیث سے پھوٹے اِس لیے ان میں جھوٹ کی آمیزش کم رہی۔ یا یوں کہیئے کہ مغرب کے مقابلے میں اب بھی نہایت کم ہے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان مفکرین بہتر طریقے سے مشاہدہ اور تجزیہ کر پائے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے نئے علوم کو وسعت دے گئے۔ بوعلی سینا کی طب سے لے کر ابن خلدون کے مقدمہ تک آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بہت سے مردہ علوم میں جان ڈال دی۔ اِس میں بڑا عمل دخل مشاہدے کی سچائی کا تھا جس کے بعد

تجزیہ

تجزیہ نہایت آسان ہوگیا۔ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں فرق واضح تھا۔ مسلمانوں کے مشاہدے کے منابع ہمیشہ جھوٹ سے مُبرا رہے ہیں اور یہ منابع ہر گھر میں موجود تھے۔ اِس لیے مسلمان گر گر کر سنبھلتے رہے۔ زوال کیا ہے؟ انسانی صلاحیتوں کا زنگ آلود ہو جانا یا غلط سمت اختیار کر لینا، لیکن چونکہ یہ عمل افراد کی ذات کے اندر واقع ہوتا ہے اس لیے کسی قوم کے زوال کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب وہ دوسروں کی غلام بن جائے یا معاشی طور پر مستحکم نہ رہے۔ ورنہ اصل زوال تو اُس قوم کے افراد کی ذاتی سطح پر بہت پہلے شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ ہر قوم کا زوال اُس کے افراد کی ذات سے شروع ہوا اور اپنے افراد کی ذات کی ترقی سے ہی وہ قوم دوبارہ زندہ ہوئی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؂

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

لیکن مسئلہ ہے مشاہدے کی سچائی کا۔ ہر زوال مشاہدے کی کمزوری سے شروع ہوتا ہے۔ ہر ترقی مشاہدے کی سچائی اور قوت سے آغاز پاتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہر قوم نے اپنے تنزل کو دیکھ کر کم از کم ایک دفعہ تو دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُس وقت تک اُن کا مشاہدہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ وہ دوبارہ اُٹھ نہ سکے۔ زیادہ قومیں تو وہ ہیں کہ جن کے بڑے اُن تک معلومات پہنچانے کے ذمہ دار تھے مگر وہ حق و باطل کو گڈمڈ کرتے رہے۔ وہ قومیں اپنے مشاہدے کے لیے اُن پر بھروسہ کرتی تھیں اور یقین رکھتی تھیں کہ اُن کے رہنما اُن کو دی گئی معلومات میں ملاوٹ نہیں کر سکتے۔ وہ آنکھیں بند کر کے سرکاری یا غیر سرکاری ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کو بے چون و چرا مشاہدہ کا نام دیتی رہیں اور مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت کے ہوتے ہوئے بھی وہ غلط نتائج اخذ کرتی رہیں حتیٰ کہ زوال پذیر ہوگئیں۔ اِس لیے قیامت کے دن جب اُن قوموں کے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اُن کا مشاہدہ اور تجزیہ اِس لیے غلط تھا کہ اُن کے رہنما انہیں جو معلومات دے رہے تھے اُن میں باطل کی ملاوٹ تھی تو وہ اپنے رہنماؤں کے لیے دُہرے عذاب کی فرمائش کریں گے۔ ایک تو اس لیے کہ اُن رہنماؤں کا اپنا مشاہدہ اور تجزیہ غلط تھا دوسرے اِس لیے کہ انہوں نے اپنی قوم کو غلط معلومات بہم پہنچا کر اُن کے مشاہدے اور تجزیے کو بھی غلط راستے پر ڈال دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اِن سب کو شدید عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ کیونکہ اللہ نے حق کو باطل سے الگ کرنے کے لیے تجزیہ کی جو قوت عطا کی ہے وہ نہ صرف سب میں یکساں ہے بلکہ اتنی طاقتور ہے کہ وہ با آسانی حق و باطل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تجزیہ

میں تمیز کر سکتی ہے چاہے اُنہیں کتنی ہی خوبصورتی سے ایک لڑی میں پرویا گیا ہو۔

تجزیہ کے ذریعہ حق کو باطل سے الگ کرنا ایک فطری عمل ہے۔ یہ اللہ کا ایک تحفہ ہے جس سے استفادہ کے لیے کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ ہاں انسان خود اُسے روکنا چاہے تو یہ نظام مفلوج ہو جاتا ہے۔ (انسان میں حق کو باطل سے الگ کرنے کے تین اور جسمانی نظام ہیں۔ ذہنی نظام کی طرح انسان ان انظمہ کو تباہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں مزید معلومات کیلیے دیکھئے Appendix B) مسلمان اِس لیے تباہ ہونے کے بعد دوبارہ اُبھرتے رہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو اُبھارنے کے لیے حکمرانوں کی دی ہوئی معلومات کا سہارا نہیں لیا۔ ہر زوال کے بعد اپنے زوال کا مشاہدہ اور اُس کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے لیے یا دُوبارہ اُٹھنے کے راستے ڈھونڈنے کے لیے انہوں نے قرآن اور سنت کا سہارا لیا اور یہ دو کتابیں ہر گھر میں موجود تھیں۔ اور آج بھی ہیں۔ مگر آج مسلمان مشاہدہ کے لیے اُن کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ اُن کی جگہ مسلمانوں کے گھر میں ایک اور آلہ آ گیا ہے جس نے اُنہیں اپنی معاشرت، ثقافت، حکومت بلکہ مذہب کا مشاہدہ یا تجزیہ کرنے کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا ہے اور اِس آلے کی بدولت حق اور باطل کی معلومات اتنی سرعت اور خوبصورتی سے یکجا ہوگئی ہیں کہ تجزیہ کی مدد سے اُنہیں الگ کرنا دشوار ہے۔ یہ آلہ ہے ٹیلیویژن۔ مسلمانوں نے اُسے حقائق کا منبع جان کر قرآن اور سنت کی تعلیم بھی وہیں سے لینا شروع کر دی یوں اُن کے مشاہدے کے سارے ذرائع غلط ہو گئے۔ یہاں تک کہ ٹی وی سے کیا گیا قرآن اور سنت کا مشاہدہ بھی مغالطہ انگیز ہے۔ قرآن کا نہ صرف متن الہامی ہے بلکہ اُس کی ترتیب بھی الہامی ہے۔ جب مسلمان قرآن ایک ترتیب سے پڑھتے ہیں تو ہر مضمون اپنے سیاق و سباق کے ساتھ اُن کے دماغ کی فائلوں میں جگہ پاتا ہے۔ لیکن ٹی وی پر اُنہیں مخصوص آیات کسی خاص مقصد کے لیے دکھائی جاتی ہیں جس سے اُن کا مشاہدہ اور پھر تجزیہ غلط ہو جاتا ہے۔ قرآن براہ راست پڑھتے وقت گویا اللہ اُن سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے۔ ٹی وی پر قرآن کی آیات کے حوالے، کسی اور واسطے سے ہوتے ہیں اور اللہ نے واسطوں کی ممانعت فرمائی ہے۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اُس کا پیغام اِسی کتاب میں ہے۔ اُس کو یا تو پڑھا جا سکتا ہے یا پھر سُنا جا سکتا ہے۔ ٹی وی پر پیش کی جانے والی آیات کا مقصد کسی ایجنڈے کے تحت حق اور باطل کو ملانا ہے۔ یہ بات خدانخواستہ اُن علما کے حوالے سے نہیں کی جا رہی جو ٹی وی پر آ کر قرآن کا علمِ خاص اُس ترتیب سے دیتے ہیں جو اللہ نے قرآن میں رکھی ہے اور جن

تجزیہ

علما کا مقصد اِس کے سواء کچھ نہیں ہوتا کہ عوام میں قرآن کا علم پھیلے۔لیکن اِیسے علما کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔جبکہ دنیا کے زیادہ تر ٹی وی چینل اِس وقت مسلمانوں کے دشمنوں کے اثر یا کنٹرول میں ہیں۔

اگر براہِ راست نہیں تو بالواسطہ دنیا کے ۹۹% ٹی وی چینل اِس وقت ایک مخصوص نسلی گروہ کی سرپرستی میں چل رہے ہیں اور وہ ہیں یہودی۔ٹی وی کی ایجاد کے فوراً بعد ہی یہودیوں کو اِس کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔اُنھوں نے سٹوڈیو بنائے اِس شعبے میں سرمایہ کاری کی اور معلومات بہم پہنچانے کے ذرائع پر قابض ہوگئے آج لوگ اپنے گھروں میں کس موضوع کا مشاہدہ کریں گے اِس کا فیصلہ دنیا کی درجن بھر ذرائع ابلاغ کی کمپنیوں کے مالکان کرتے ہیں جو کہ کم وبیش سب یہودی ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں پر زوال کے سائے گہرے ہوتے جارہے ہیں اور پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ مسلمان قرآن وسنت کے بجائے میڈیا سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ پہلے ہر زوال کے بعد مسلمانوں کی اکثریت قرآن اور سیرت النبی سے رہنمائی لیا کرتی تھی۔قوم کے دانشور، لیڈر، اساتذہ سب قرآن اور سنت کی طرف لپکتے تھے، جو لوگ قوم کا درد رکھتے تھے سب سے پہلے اور سب سے جامع مشاہدہ اور تجزیہ کرتے تھے۔مسلمانوں کے ابتدائی عروج سے جنگِ عظیم دوئم کے آخر تک اُن کی تاریخ دیکھئے سب نے قرآن اور سنت کی مدد سے ہی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا اہتمام کیا۔ٹی وی کے آنے کے بعد اُن کے رہنماؤں اور دانشوروں کی اکثریت یہی رہنمائی ٹی وی سے لینے لگی۔اُنہیں قوم کی حالتِ زار کا احساس تو ہے لیکن انہیں کیا کرنا چاہئے یہ جاننے کے لیے وہ CNN کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔گویا عطار کے جس لونڈے کی بدولت وہ بیمار ہوئے اُسی سے دوا لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔

یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ یہودیوں کے بنائے ہوئے اِس نظام میں حق و باطل کو ملا کر ایسے پیش کیا جاتا ہے کہ انسان تجزیہ کرتے وقت اِس آمیزش کا ادراک نہیں کرپاتا۔اِس سازش کا پردہ چاک کرنے کے لیے یہودیوں میں سے ہی ایک آدمی اُٹھتا ہے۔وہ ہے نوم چومسکی (Noam Choamsky)۔تجزیہ کی بات ہو اور میڈیا کا ذکر نہ آئے تو یہ نامکمل ہے اور یہ بھی محال ہے کہ میڈیا کا تجزیہ کیا جائے اور نوم چومسکی کی بات نہ ہو۔نوم چومسکی امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں لسانیات کا پروفیسر ہے۔یوں تو وہ لسانیات میں سند کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اُس نے دنیا میں زیادہ شہرت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تجزیہ

میڈیا پر تحقیق کی وجہ سے پائی ہے۔ اُس نے واضح کیا ہے کہ میڈیا کس طرح حق و باطل کو گڈمڈ کرتا ہے تاکہ ہمارا تجزیہ غلط ہو سکے اِس حوالے سے اُس کی تمام تر تحقیق کا احاطہ کرنا تو مشکل ہے۔ جو شخص مشاہدہ اور تجزیہ کے بارے میں بالعموم اور میڈیا کے رول پر بالخصوص پڑھنا چاہے وہ نوم چومسکی کا مطالعہ ضرور کرے۔

میڈیا تین منفرد طریقوں سے ہمارے مشاہدات میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتا ہے۔

(۱) تصویریں بدل کر۔

(۲) الفاظ کے ہیر پھیر سے۔

(۳) نام نہاد ماہرین کی رائے دے کر۔

آج کے میڈیا میں یہ تینوں طریقے ایک سائنس کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم اِن میں سے صرف تصویروں کے ذریعے سے مشاہدے پر اثر انداز ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی جنگ کی صورت میں یہودی میڈیا اسرائیل کا مشاہدہ دو طریقوں سے کرانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ ایک مشاہدہ مغربی ناظرین کے لیے، دوسرا مسلمانوں کے لیے۔ جو مشاہدہ وہ مغربی ناظرین کو کرانا چاہتا ہے اُس کا مقصد مغرب میں لوگوں کو یہ تجزیہ کرنے کے لیے مواد مہیا کرنا ہوتا ہے کہ اسرائیلی کتنے مظلوم ہیں اور آپ کی مدد کے کتنے مستحق ہیں۔ مسلمانوں کو وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اسرائیل ناقابلِ تسخیر ہے اور اُسے کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ وہ مسلمانوں کو یہ تجزیہ کرانا چاہتا ہے کہ اسرائیل کے ساتھ جنگ اُن کی کتنی بڑی غلطی رہی ہے اور اِس جنگ کے کیا کیا نقصانات مسلمانوں کو پہنچے ہیں اور کیا کیا فائدے اسرائیل کو حاصل ہوئے ہیں۔

ایسا کرنے کے لیے یہودی میڈیا مغرب کے ٹی وی پر دکھاتا ہے:

۱۔ ٹوٹے ہوئے مکانات۔

۲۔ اسرائیلیوں کے جنازے۔

۳۔ اسرائیلیوں کی قبروں پر روتی ہوئی مائیں، بہنیں۔

دوسری طرف مسلمانوں کو اِن تصاویر کا مشاہدہ کروایا جاتا ہے:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تجزیہ

۱۔ مسلمانوں کی تباہی جو اسرائیلی فضائی بمباری کی وجہ سے ہوئی ہو۔
۲۔ مسلمانوں کی لاشیں۔
۳۔ مسلمان عورتیں اُن لوگوں کو (یعنی مجاہدین) کو لعنت ملامت کرتی ہوئیں جن کی وجہ سے جنگ شروع ہوئی۔

اِس ساری صورتِ حال میں یہودی میڈیا کبھی بھی اپنے نتائج مسلط نہیں کرتا۔ بلکہ جو نتائج حاصل کرنا مقصود ہوں اُن کے حوالے سے ممکنہ آمیزش لوگوں کے مشاہدے میں شامل کردی جاتی ہے۔ بار بار ایک ہی طرح کا مشاہدہ ایک ہی طرح کے تجزیے کی طرف لے جاتا ہے۔ نتیجتاً لوگ وہی سوچتے ہیں جو یہودی چاہتے ہیں اور یوں مشاہدے اور تجزیے کی اہمیت اور طریقہ کار سے آگہی کی بدولت چند لاکھ یہودی اربوں عوام کے دماغ کو کنٹرول کر رہے ہیں۔

اپنا تجزیہ کیجیے:

س۱:۔ کیا آپ تھوڑی سی معلومات حاصل ہونے پر تجزیہ شروع کردیتے ہیں؟

ہاں نہیں

س۲:۔ کیا آپ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں تجزیہ شروع کرتے ہیں؟

جلدی دیر سے

س۳:۔ کیا آپ دوسروں کے مقابلہ میں تجزیہ کر کے نتیجہ اخذ کرلیتے ہیں؟

دیر سے جلدی

س۴:۔ کیا آپ تجزیہ کر کے نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

باقاعدہ بیٹھ کر چلتے پھرتے

س۵:۔ کیا آپ اپنے تجزیہ میں لوگوں کی رائے کو اہمیت دیتے ہیں؟

بالکل نہیں بہت زیادہ کسی قدر

س۶:۔ کیا آپ پر تجزیہ کرتے ہوئے جذبات غالب آجاتے ہیں؟

ہاں نہیں

---

۶. نتیجہ

ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ بیشتر انسان Mammal Brain پر مشاہدہ اور تجزیہ کرتے ہیں جبکہ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے جو Human Brain یا Reptile Brain کے درجہ پر جا کر اپنے دماغ کو استعمال کرتے ہیں Mammal Brain کے درجہ پر مشاہدہ اور تجزیہ انسان دوسروں کو دماغ میں رکھ کر اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے پیشِ نظر جھوٹی انا اور عزت کی خاطر کرتا ہے۔ حیوانی دماغ کی سطح پر لذت، خوف اور نفس حاوی آجاتا ہے جبکہ اشرف المخلوقات کے درجہ پر انسان سکونِ قلب سے مکمل مشاہدہ کرتا ہے اور پھر منطقی انداز میں تجزیہ کرتا ہے جس میں اللہ کے احکام اور خوشنودی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو۔

اِس باب میں ہم نتائج پر تفصیل سے گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ نتائج کیا ہوتے ہیں؟ ہمارے دماغ میں کیسے محفوظ ہوتے ہیں؟ اور پھر آگے چل کر اُن کا ہماری جذباتی کیفیات پر کیا اثر ہوتا ہے؟ اب ہم جانتے ہیں کہ نتائج ایک فائل کی صورت میں ہمارے دماغ میں موجود ہوتے ہیں یہ فائل بہت ہی جامع ہوتی ہے یہاں ہمیں ہر چیز کی پیمائش، وزن، تصویر، استعمال، تاریخ کے علاوہ ایک چھوٹی سی فلم بھی ملتی ہے جسے ہم بوقتِ ضرورت اُس چیز کی یاد تازہ کرنے کے لیے آسانی سے چلا سکتے ہیں۔

اگر ہم اُن کی اقسام کا تعین کریں تو ہمیں پانچ اقسام کی فائلیں ملتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔اشیاء	۲۔شخصیات اور افراد
۳۔جگہیں	۴۔تقریبات و واقعات
۵۔نظریات اور احکام	

اشیاء

اشیاء سے متعلق نتائج ہماری زندگی کے اولین نتائج میں شامل ہیں۔ چند ماہ کی عمر سے ہی بچہ اپنے ماحول میں موجود اشیاء کو پکڑ کر محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اِس عمر میں اُس کے دیکھنے، سونگھنے اور ہاتھ سے محسوس کرنے کی قوت کمزور ہوتی ہے۔ جبکہ چکھنے اور سننے کی صلاحیت کافی طاقتور ہوتی ہے۔ اِس لیے چھوٹا بچہ مشاہدہ کرنے کے لیے اکثر و بیشتر اشیاء کو پکڑ کر اپنے منہ تک لے جاتا ہے، آوازوں سے چونک جاتا ہے، لوری اور ہلکی موسیقی پسند کرتا ہے، جبکہ کسی فرد کے دور جانے پر اُس کا مشاہدہ کرنا بند کر دیتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ چلنے کی صلاحیت حاصل ہوتے ہی مشاہدہ کی رفتار کئی گنا بڑھ جاتی ہے اب بچہ گھر بھر میں ایک کے بعد دوسری چیز کا مشاہدہ کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اُس کے نتائج کا انحصار اِس بات پر ہے کہ اُسے مشاہدہ کرتے ہوئے کون کون سے حواس کتنی دیر تک استعمال کرنے کا موقع ملا۔ مثلاً دو بچے مختلف سمتوں سے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بلی کے بچے کھیل رہے تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر تک اُن کو دیکھتے رہے انہوں نے بلی کے بچوں کو دیکھا اُن کی آوازیں سنیں پھر دونوں مزید مشاہدہ کرنے کے لیے آگے بڑھے تاکہ اُن کو پکڑ سکیں۔ اُس وقت ایک ماں نے اپنے بچہ کو اُٹھا لیا جبکہ دوسری ماں نے اپنے بچے کو بلی کے بچوں کا بغور مشاہدہ کرنے کا مزید موقع دیا۔ ایسا کرنے سے دوسرے بچے کی فائل میں بلی کے متعلق پہلے بچے کی نسبت کہیں زیادہ معلومات جمع ہو گئیں۔

ہمارا دماغ بچپن سے ہی اشیاء کی فائلوں کا ایک بہت بڑا مخزن بن جاتا ہے۔ اِن اشیاء میں سب سے پہلے تو ہمارے گھر کی چیزیں شامل ہوتی ہیں پھر محلے، سکول اور وسیع تر دنیا کی اشیاء کا اضافہ ہوتا ہے۔

افراد اور شخصیات

یوں تو فائلوں میں سب سے پہلی فائل ماں کی ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے گھر میں رہتے ہوئے بچہ کچھ اور لوگوں کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔ جبکہ اشیاء اُس سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ آگے چل کر ہمیں ایک فرد کو جاننے کے لیے بھی اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ خالد بن ولیدؓ بہت اچھے گھڑ سوار تھے تو پہلے ہمیں گھوڑا اور اُس پر سواری کے آداب کی فائل بنانا یا ڈھونڈنا پڑے گی۔ یا یہ کہ حضرت علیؓ تلوار بہت اچھی چلاتے تھے تو اِس کے لیے ہمارے پاس تلوار کی فائل ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ صرف تلوار کی فائل ہونے سے ہم حضرت علیؓ کے تلوار باز ہونے پر رائے قائم نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر ہماری نظر سے اُن کی تلوار الذوالفقار گزری ہو تو اِس خاص تلوار کی ساخت، بناوٹ اور اُس کا وزن ہمیں بتائے گا کہ اِس تلوار کا چلانے والا کتنا بڑا تلوار باز ہوگا۔ اگر ہم کسی شخصیت کے بارے میں بتانا چاہیں مگر اُس فرد سے وابستہ اشیاء کی فائل موجود نہ ہو تو اِس صورت میں ہماری معلومات ناقص ہوں گی۔

یہاں ایک اہم اصول کی وضاحت ضروری ہے۔ اکثر نتائج ایک یا ایک سے زائد دوسرے نتائج سے منسلک ہوتے ہیں۔ اِس لیے اُن کو مدّون کرنے سے پہلے اُن سے منسلک دوسرے نتائج کو

نتیجہ

تشکیل دینا ضروری ہے۔ ایک فرد کی بات کرتے ہوئے بعض اوقات کئی دوسری فائلیں کھلتی ہیں۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی دماغ میں کیسی پیچیدہ (Networking) رابطہ کاری ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں دماغ پر ہونے والی تحقیق نے اِس رابطے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مزید معلومات کے لیے دماغ میں موجود خلیے (Neuron) کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جگہیں

تیسری قسم کی فائل جو دماغ میں موجود ہے وہ جگہوں کی ہے۔ ہمارے دماغ میں سب سے پہلی فائل جس جگہ کی ہوتی ہے وہ ہمارا آبائی گھر ہوتا ہے۔ گھر کے کمرے، نقشہ، باورچی خانہ وغیرہ ایک فائل میں محفوظ ہوجاتا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی بہت سی جگہیں ہیں جن کی فائلیں ہمارے دماغ میں چھ سال کی عمر سے پہلے ہی وجود میں آجاتی ہیں۔ اُن میں اسکول، پارک، کھیلنے کی جگہ، کسی رشتہ دار کا گھر، دوکان اور ہسپتال وغیرہ شامل ہیں۔

تقریبات و واقعات

نئے نئے کپڑوں میں لوگ ایک کُھلے میدان میں نماز پڑھتے ہیں۔ سب لوگ بیٹھ کر کچھ باتیں سُنتے ہیں پھر وہ اُٹھ کر خوشی خوشی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ جی ہاں یہ عید کا موقع ہے۔ ہمارے دماغ میں ایسے بہت سے مواقع کی فائلیں موجود ہیں۔ اِن میں سے بہت سے خوشی کے مواقع ہیں اور بہت سے غم کے۔ شادی بیاہ، بچے کی پیدائش وغیرہ ایسی فائلیں ہیں جن میں خوشی نظر آتی ہے۔ جبکہ موت، حادثات وغیرہ جیسی فائلیں غم کی تصویر پیش کرتی ہیں۔

مختلف تقریبات و واقعات کی فائلیں بھی بہت سی اشیاء، افراد اور جگہوں کے ملاپ سے بنتی ہیں۔ مثلاً عید کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے دماغ میں میدان، امام، کپڑے وغیرہ جیسے بہت سے لوگوں، چیزوں اور جگہوں کی فائلیں کھل جاتی ہیں۔

نظریات اور احکام

یہ سب سے اعلیٰ اور پیچیدہ قسم کی فائلیں ہوتی ہیں۔ یہ دماغ میں سب سے اُوپر کی سطح پر ہوتی ہیں اور ان کا دارومدار اوّل الذکر قسم کی فائلوں پر ہے۔ مثلاً پھول کی فائل بننے میں کسی اور فائل کی ضرورت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجہ

نہیں پڑتی۔ اِسی طرح ماں کی فائل میں بنیادی طور پر کسی شئے یا فرد کی ضرورت نہیں ہوتی۔لیکن اگر ہم ہمدردی کا ذکر کریں تو اِس کے لیے ہمیں اور بہت سی اقسام کے نتائج کی ضرورت پڑے گی۔

اگر ہم چاہیں کہ انسان میں قربانی کا جذبہ پیدا ہو تو اِس کے لیے سب سے پہلے اُس کے دماغ میں قربانی کے نظریہ کی فائل بنوانی پڑے گی۔اِسی طرح دین کے لیے قربانی کی بات پر شائد ایک فائل کھل جائے لیکن اُس فائل میں اُس ایک جملے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فائل ہی نہ بننے پائے، ہم نے اگر یہ بات اپنے استاد سے سنی ہے تو ہم اِس بات کو اپنے استاد کی فائل میں جہاں ہم نے اُن کے اقوال جمع کیے ہیں رکھ سکتے ہیں۔کوئی پوچھے قربانی کیا ہوتی ہے؟ ہمارا جواب ہو ''پتا نہیں لیکن ہمارے استاد قربانی دینے کو کہتے تھے''۔ اِسی طرح ہمارے استاد کے بارے میں کوئی پوچھے تو ہم کہیں ''ہمارے استاد بہت سی باتیں کہتے تھے اُن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ دین کے لیے قربانی دو''۔اب ہم چاہتے ہیں کہ انسان دین کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ظاہر ہے کہ سب سے بڑی قربانی انسان اپنی زندگی کی ہی دے سکتا ہے اِس کے لیے ہم انہیں یہ واقعہ بتاتے ہیں۔

جنگِ احد کا وقت ہے مسلمانوں کی ذراسی غلطی نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ بھاگتے کفار واپس آئے اور پینترا بدل کر مالِ غنیمت جمع کرنے والے مسلمانوں پر پیچھے سے دھاوا بول دیا۔مسلمان بوکھلا گئے اُن کے پاؤں اکھڑ گئے۔کفار کا ہدف رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی مسلمان حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے پیچھے ہٹے یہاں تک کہ اُحد کا پہاڑ اُن کی پشت پر تھا۔دائیں، بائیں اور سامنے سے کفار کا ایک سیلاب تھا جو امڈ آیا تھا۔لیکن صحابہؓ حضور ﷺ کے آگے ڈھال بنے ہوئے تھے۔ایسے میں جب ایک طرف سے کوئی صحابیؓ زخموں سے چُور ہو کر زمین پر گرتے تو حضور ﷺ اُس خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے اور کہتے۔''یہ ہے جنت کا رقبہ۔ یہاں کون آئے گا؟ جنت یہاں ہے''۔صحابہؓ اللہ کے رسول ﷺ پر قربان ہونے کے لیے آگے بڑھتے اور تھوڑی ہی دیر میں اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے قربان ہو جاتے۔ یہ سلسلہ بڑی دیر تک چلا۔حضور ﷺ ہر بار اپنے دفاع کو کمزور محسوس کر کے مسلمانوں سے قربانی مانگتے اور مسلمان آگے بڑھ کر جامِ شہادت نوش کر لیتے۔

یہ واقعہ انسان میں قربانی کی فائل پیدا کرنے کا خوبصورت مشاہدہ ہے۔ یہ واقعہ انسان کے تخیل میں جنگ کا پورا منظر پیدا کر دیتا ہے۔ وہ کانوں سے سن کر یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجه

خون اور گرد کو سونگھ سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی پکار اور ''لبیک یا رسول اللہ ﷺ'' کے نعرے سُن سکتا ہے۔

لیکن اِس کے لیے اُس کے دماغ میں بہت سی فائلوں کا کُھلنا ضروری ہے اِن میں سے کچھ اشیاء کی، کچھ جگہ کی اور کچھ افراد کی ہیں۔ مثلاً اُسے پتا ہونا چاہئے کہ حضور ﷺ کون ہیں؟ اُن کی اہمیت کیا ہے؟ وہ صحابہؓ کون تھے؟ اِس کے علاوہ سننے والے کے دماغ میں اُحد پہاڑ اور تلواروں کی فائل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ یہ سارا منظر دیکھنا محال ہوگا اور قربانی کی فائل بھی تشنہ رہ جائے گی۔

ایک اور فائل جو اِسی قسم سے تعلق رکھتی ہے احکام کی ہے۔ ہم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے حکم بے چوں و چرا تسلیم کرتے ہیں۔ جب ہم سنتے ہیں کہ اللہ نے پانچ وقت کی نماز کا حکم دیا ہے تو ہم اِس مشاہدے کو تجزیہ سے گزارتے ہوئے اِس حکم کی فائل تخلیق کر لیتے ہیں۔ شریعت کے احکام کو تجزیہ کے ہاون دستے میں کُوٹنا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا اللہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے احکام جانچے بغیر نتیجہ میں تبدیل کرنا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ نتائج ہمارے دماغ میں محفوظ کیسے ہوتے ہیں؟ آپ دیکھیں گے کہ نتائج جس ترتیب یا طریقے سے انسان کے ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں اُس کا شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ نتائج تین طرح کے مشاہدوں اور تجزیوں کی بدولت وجود میں آتے ہیں ایک تو وہ اعلیٰ طریقہ ہے کہ جو صرف انسانوں کو سکھایا گیا ہے۔ اِس طریقہ کار میں انسان Human Brain کے زیرِ اثر کام کرتا ہے۔ یہ اعلیٰ شخصیت کے مالک لوگوں کا طریقہ ہے۔ یہ لوگ خودمختار، باحوصلہ، موثر اور صبر والے ہوتے ہیں۔

دوسرے مرحلہ پر Mammal Brain کی مدد سے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے والے افراد ہیں۔ یہ لوگ جلد گھبرا جانے والے ہوتے ہیں۔ معاشرے کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔ اِن کی سوچ پر ہمیشہ لوگوں اور معاشرے کا اثر ہوتا ہے۔ یہ بڑے سے بڑا کام بھی بے عزتی سے بچنے یا عزت بنانے کے لیے کر سکتے ہیں۔ اِسی طرح چھوٹا سا اہم کام شائد اِس لیے نہ کر پائیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ یہ لوگ زمانہ ساز ہیں۔ میڈیا کی بات اپنے مشاہدے کا حصہ بناتے ہیں۔ اِن کے مشاہدے میں ماہرین کے تبصرے اور خبریں رہتی ہیں۔ یہ لوگ تجزیہ کرتے وقت ضرورت، مجبوری اور لوگوں کی فرمائش کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اِن کے فیصلے اور نظریات دوسرے لوگوں یا تنظیموں کو خوش کرنے یا اُن کی ناراضگی سے بچنے کے لیے ہوتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجه

تیسرے قسم کے نتائج Reptile Brain کے حامل لوگ اخذ کرتے ہیں اُن کے مشاہدہ اور تجزیہ پر مکمل طور پر اُن کی خواہشات حاوی ہوتی ہیں۔ اُن کے مشاہدے میں جو چیز بھی آتی ہے وہ اُس کا تجزیہ کر کے اُسے اپنی تسکین کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یہ تسکین عارضی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی وہی حیوانی خواہش عود کر آتی ہے اور اِس کے ساتھ ہی اُس خواہش کی تکمیل کے لیے کیا جانے والا مشاہدہ اور تجزیہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ یہ تسکین ضروری نہیں کسی لذت کو حاصل کرنے سے ہی پوری ہو۔ بسا اوقات یہ تسکین اُنہیں خوف کی حالت سے نجات حاصل کر کے بھی ملتی ہے۔ اُن کے خوف یا وہم بے بنیاد ہوتے ہیں۔ جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ مسلسل اُس خوف یا وہم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ہر نیا مشاہدہ اور تجزیہ انہیں اِس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ اُن کا خوف ایک حقیقت ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اِن تین نتائج سے وجود میں آنے والی شخصیت کیسی ہوتی ہے؟ یہ گفتگو بہت دلچسپ ہے اور یہ بحث قرآن میں بھی کی گئی ہے۔ قرآن میں انسان کی پیدائش پھر اس کی جوانی، بڑھاپا اور پھر مر کر اُٹھنا سب بالکل اِسی ترتیب میں ایک پودے سے مشابہ ہے۔

پودا ایک بیج سے پیدا ہوتا ہے۔ زمین سے نمودار ہوتا ہے کمزور اور محتاج۔ اُسے کھاد سے لے کر پانی تک ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بڑا ہوتا ہے، پھل دیتا ہے اور پھر ایک مقررہ وقت پر اپنی زندگی پوری کر کے خاک میں مل جاتا ہے۔ یہی کیفیت انسانوں کی بھی ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ نفسیاتی طور پر بھی جن تین کیفیتوں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ وہ تین پودوں سے ہی ملتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہو گا کہ انسان جن تین نفسیاتی حالتوں میں اپنا وجود رکھتا ہے وہ پودوں کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتیں۔ یہ تین حالتیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ درخت (Trees)

۲۔ جھاڑیاں (Bushes)

۳۔ بیلیں (Creepers)

درخت ایک مضبوط تنا رکھتا ہے۔ سیدھا اُوپر جاتا ہے۔ اُس کے اندر دھوپ، گرمی، سردی اور طوفان کو سہنے کی طاقت ہوتی ہے اُس کے تنے میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوپر بہت سی ٹہنیوں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجہ

پتوں کو سہارا دے لیتا ہے پھر بھی خود نہیں بکھرتا اور قائم رہتا ہے۔
دوسری قسم ایک جھاڑی کی ہے۔ مثلاً گلاب کی جھاڑی کو لیجیے اُس کا تنا عام طور پر نیچے سے چند انچ کا ہوتا ہے پھر اُس کے اُوپر سے شاخیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں ہر شاخ ایک الگ رُخ پر چلی جاتی ہے۔ ذرا سی تیز ہوا اُس کو اِدھر اُدھر کر دیتی ہے۔ بلکہ اکھاڑ بھی سکتی ہے۔ ایک شاخ ایک حد تک بڑھتی ہے۔ اُس سے زیادہ کی صورت میں وہ شاخ کمزور سے تنے کے لیے نا قابلِ برداشت بوجھ بن جاتی ہے۔

تیسری قسم بیل کی ہے۔ اِس کا تنا بہت کمزور ہوتا ہے اتنا کمزور کہ کدو کی بیل اپنا وزن برداشت نہیں کر پاتی۔ یہ زمین پر رینگتی رہتی ہے۔ ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اس کے بڑے بڑے پتے زمین پر پڑے رہتے ہیں۔ عام طور پر ایسی بیلوں کی عمر کم ہوتی ہے۔ یہ دھوپ برداشت کرتی ہیں نہ ہوا۔ زمین پر رینگتی ہوئی یہ کہاں سے کہاں جا سکتی ہیں۔ کوئی پابندی برداشت نہیں کرتیں جہاں جگہ ملے چلی جاتی ہیں۔ یہی حال تین قسم کے انسانوں کا ہے جن کا ذکر ہم پچھلے ابواب میں کرتے آ رہے ہیں۔ درخت Human Brain رکھنے والے انسان ہوتے ہیں، جھاڑیاں Mammal Brain کی طرح کی ہیں، جبکہ Reptile Brain والے لوگ بیلوں سے ملتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

اِس سوال کے جواب کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا نتائج انسانی شخصیت میں کیسے محفوظ ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم Human Brain کو دیکھتے ہیں۔ Human Brain میں جگہ پانے والے نتائج کی بنیاد تقویٰ ہے۔ اِن نتائج کی بدولت انسان اللہ کی کائنات کو سمجھتا اور اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اِس سلسلے کا ہر مشاہدہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہوتا ہے۔ یہ مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اِس لیے اِن میں لوگوں کو خوش کرنے یا اپنی ہوس کی تسکین کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ مشاہدہ، تجزیہ اور نتائج کی یہ وحدانیت شخصیت کے تضاد کو ختم کر دیتی ہے۔ سینکڑوں نتائج میں سے کوئی ایک نتیجہ بھی دوسرے نتائج سے مختلف نہیں ہوتا۔ چونکہ تمام نتائج اللہ کی خوشنودی کے لیے مرتّب کیے جاتے ہیں اِس لیے کسی خوف کی بجائے قوت اور اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔ اِن کے درمیان ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ ہر نیا حاصل ہونے والا نتیجہ پچھلے نتائج کے اُوپر آرام سے آ کر ''بیٹھ'' جاتا ہے۔ نئے نتائج آتے رہتے ہیں اور پچھلے نتائج کے ساتھ مربوط ہوتے جاتے ہیں۔ اِس طرح درخت کے تنے کی مضبوطی، بلندی اور پھیلاؤ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ Human Brain

نتیجہ

کی کارفرمائی سے جو شخصیت وجود میں آتی ہے۔ اُس کی باتوں کو قرآن نے سورۃ ابراہیم میں کلمہ طیبہ کا نام دیا ہے۔ کلمہ طیبہ کے لیے ایک پاکیزہ درخت کی تمثیل بیان کی ہے جس کی جڑیں مضبوطی سے زمین میں گڑی ہوئی ہیں، اس کی شاخیں کائنات میں چارسو پھیلی ہوئی ہیں اور اللہ کے حکم سے اُس کا پھل سدا بہار ہے۔

اِس کے برعکس Mammal Brain والے انسان کی وفاداریاں کئی لوگوں کے درمیان بٹی ہوتی ہیں۔ وہ کئی کشتیوں کا سوار ہوتا ہے اُسے کئی ایک مصلحتوں، ضابطوں اور قوانین کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اِس لیے اُس کی شخصیت خانوں میں بٹ جاتی ہے۔ آج کل کے مسلمان شہری معاشروں میں سے کسی کا بھی جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ پیدائش، موت اور شادی بیاہ وہ مواقع ہیں جہاں مسلمان خود کو غیر اسلامی رسومات کا پابند کر لیتے ہیں۔ کام، سماج اور عدالت جیسے معاملات میں اکثر مسلمان مغربی اقدار سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ Mammal Brain کی سطح کے لوگ اپنے سے زیادہ با اختیار لوگوں سے دب جاتے ہیں، چاپلوسی کرتے ہیں، رتبہ یا اختیار مل جانے کی صورت میں اُن کے بندھے ہاتھ کھل جاتے ہیں، آواز میں متکبرانہ بھاری پن آجاتا ہے اور اصول بھی بدل جاتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں کئی طرح کے نتائج جنم لیتے ہیں جنہیں انسانی دماغ الگ الگ جگہوں پر نوعیت کے مطابق جمع کرتا ہے۔ مثلاً مذہب سے متعلق نظریات ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ روزگار سے متعلق دوسری جگہ اور رشتہ داروں سے متعلق تیسری جگہ۔ چونکہ اِن سب فائلوں میں ربط نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اِس لیے وہ یکجا نہیں ہوسکتیں۔

پودے کے تناظر میں دیکھیں تو کئی ایک تنے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ہر تنا ایک خاص قسم کے نتائج کو اکٹھا کیے ہوئے ہوتا ہے۔ یعنی انسانی دماغ کئی حصوں میں بٹا ہوتا ہے۔ وقت اور ضرورت کے تحت انسان کی شخصیت کے مختلف روپ دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور اگر قرآن کی زبان استعمال کی جائے تو انسان دینِ حنیف سے ہٹ کر کئی انداز اپنا لیتا ہے۔ وہ اِسے مجبوری اور ضرورت کا نام دیتا ہے ایسا کرنے سے اُس کا تنا یعنی دماغ کمزور پڑ جاتا ہے۔ اِس ساری صورتِ حال کے نتیجے میں کئی ایک پتلے اور کمزور تنے وجود میں آتے ہیں اور کسی بھی ایک تنے کی اونچائی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی۔

ایسے لوگ اپنی توجہ دوسرے لوگوں پر مرکوز رکھتے ہیں اور اُن سے ہی اپنی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ اُن کا مشاہدہ، تجزیہ اور نتائج انہیں چند لوگوں تک محدود رہتے ہیں اِس لیے اُن کی شخصیت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجه

اُتنے ہی حصوں میں بٹ جاتی ہے۔لوگوں یا توقعات کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ تنوں کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی پھر اِن لوگوں میں کوئی نمایاں سوچ بھی پیدا نہیں ہوگی۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یعنی انسان اپنے آس پاس کئی رب بنا لیتا ہے۔ ہر رب ایک الگ دین کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر دین کی وجہ سے انسان کے دماغ میں ایک نیا تنا جنم لیتا ہے۔ جتنے تنے زیادہ ہوں گے وہ اُتنے ہی کمزور ہوتے جائیں گے۔ اُن کی کمزوری اُن کی اُونچائی کم کرتی جائے گی۔ جتنی اوُنچائی کم ہوگی اُتنی ہی سوچ محدود ہوگی اور انسان ذہنی طور پر مفلوج ہوتا جائے گا۔ اِس بات کو ہم دو مثالوں سے سمجھتے ہیں۔

ایک شخص کسی دفتر میں ملازمت کرتا ہے دو بچے ہیں اور سادہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ دفتر میں اُس کا نگراں ایک سخت گیر آدمی ہے۔نوکری کی خاطر یہ شخص دفتر کے اندر ایک شخصیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور دفتر سے باہر مختلف شخصیت کا۔ اگر وہ یہ سوچ کر ایسا کر رہا ہے کہ اُس کا مطلب نکلتا رہے یا یہ کہ اُس کی مجبوری ہے تو اب وہ درخت (Tree) سے جھاڑی (Bush) کی طرف گامزن ہے۔ اُس کے دماغ میں دو متوازی مشاہدے، تجزیے اور نتائج جنم لیں گے۔ اگر وہ اللہ پر بھروسہ کر کے حالات کا مقابلہ کرے اور اللہ سے بہتر حالات کی توقع رکھے تو ضرور اللہ اُس کے لیے ایک بدخواور بدزبان افسر یا مالک کے ساتھ کام کرنے میں بہتری کا پہلو پیدا کردے گا اور اُس کا بُرا وقت بھی سکون سے ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ جو کچھ برداشت کر رہا ہے اِس کے پیچھے صرف حلال روزی کمانے کا جذبہ ہے تو پھر ہر تکلیف کو برداشت کرنا اُس کے لیے ثواب ہوگا۔ لیکن اگر وہ خود کو دو حصوں میں بانٹ لے۔ افسر یا مالک سے تعلق کو ایک بوجھ سمجھے خود کو بدنصیب جانے اور دورُخی شخصیت بنالے تو پھر اُس کی سوچ سے دو تنے وجود میں آجائیں گے یہ جھاڑی کی کیفیت ہے۔ اُس کا ایک مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ دفتر میں نکلے گا جو ایک کمزور سے تنے میں جمع ہوگا، دوسرا دفتر کے باہر جو دوسرے تنے کو سہارا دے گا۔

نتائج کا ایک یا ایک سے زیادہ تنوں میں جمع ہونا Stacking کہلاتا ہے۔ چونکہ درخت میں سٹیکنگ ایک ہی جگہ ہوتی ہے اس لیے درخت کا تنا موٹا ہوتا ہے ہم اسے Tree Stacking کا نام دیتے ہیں۔ Bush میں یہی Stacking دو سے لے کر پانچ تنوں کے درمیان ہوتی ہے اس لیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجه

وہاں تنا کمزور ہوتا ہے۔ اِس قسم کے نتائج کے ایک سے زیادہ جگہ پر جمع ہونے کو Bush Stacking کہیں گے۔

اِس تفصیل کے بعد ہم واپس اُس آدمی کی طرف آتے ہیں جو دفتر میں کام کرتا ہے اور اُس کی Bush Stacking ہو رہی ہے اُس کے دو تنے (Stems) وجود میں آچکے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اُس کا مالک اُسے کمپنی کا مینجر بنا دیتا ہے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں اب اُسے غریب مزدوروں سے بھی تعلق رکھنا ہے۔ کمپنی کے سپر وائزر کو بھی دیکھنا ہے اور پھر گاہکوں سے بھی ڈیل کرنا ہے۔ اُس کا گھر بھی ہے اور اب چونکہ اُس کی تنخواہ بڑھ چکی ہے اِس لیے وہ اپنا معیار بلند کرتے ہوئے کسی کلب کا سیکریٹری بھی بن گیا ہے جہاں اُس کی ذمہ داری اور مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ اب اُس کے دفتر کے حوالے سے دو یا تین تنے ہو گئے اور دو دفتر سے باہر بھی یعنی ایک گھر اور دوسرا کلب۔ یوں اُس کے پانچ تنے ہیں۔ اب وہ ایک بڑی جھاڑی Bush میں تبدیل ہو گیا ہے۔ دن میں وہ کئی دفعہ پانچ مختلف طریقوں سے مشاہدہ، تجزیہ اور نتائج اخذ کرتا ہے۔ اُس کا وقت تنے میں محفوظ کی گئی فائلوں میں اضافہ کرنے یا ان فائلوں سے معلومات اخذ کرنے میں گزرتا رہتا ہے۔ چونکہ Stem Stacking پانچ مختلف جگہوں پر ہے اِس لیے اِسے صحیح وقت پر صحیح تنے کو بروئے کار لانا ہوتا ہے۔ حصوں میں بٹنے سے اُس کے تجزیے اور مشاہدے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ مختلف تنوں (Multiple Stems) میں مشاہدہ کر کے تجزیہ کرنے اور نتائج کو مضبوطی سے سنبھالنے کی وہ صلاحیت نہیں ہوتی جو ایک تنے (Single Stem) میں ہوتی ہے۔

اگر اِس کا نظامِ فکر ایک مضبوط تنے پر قائم ہے تو اُس کی شخصیت اپنی ساری ذمہ داریاں کسی خوف یا غم کے بغیر نبھاتی ہے۔ اُس میں ایک کشش ہوتی ہے۔ اُس کے فیصلے بہت بہتر ہوتے ہیں اور لوگ اُس کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ اُسے سکون ملتا ہے اور کامیابی کا سچا احساس ہوتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایک سے زیادہ تنوں والے نظامِ فکر یعنی جھاڑی کا حامل ہونے کی صورت میں انسان کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ وہ مسلسل اپنے آپ کو منوانے میں لگا رہتا ہے۔ ہمیشہ لوگوں کی رائے کا منتظر رہتا ہے اُسے ناکامی کا خوف ہوتا ہے۔ اگر مزدور نہیں تو سپر وائزر، سپر وائزر نہیں تو گاہک، گاہک نہیں تو کلب کے ارکان، کلب کے ارکان نہیں تو گھر کے لوگ۔ غرض اُسے کسی نہ کسی طرف سے پریشانی کا سامنا رہتا ہے۔ رات سونے سے پہلے جب وہ اپنے دن کا تجزیہ کرتا ہے تو اِس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آج اُس نے فلاں

نتیجه

جگہ پر صحیح کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اُسے دھچکے لگتے رہتے ہیں۔ وہ اُنہیں سہتا رہتا ہے۔ یہ ذہنی دباؤ اُسے حملۂ قلب، فشارِ خون، السر وغیرہ امراض کا شکار کر دیتا ہے اور وہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے یا پھر وہ صدمے (Shock) کی حالت میں رہتا ہے۔

اب یا تو وہ تمام فائلوں کا دوبارہ تجزیہ کر کے Tree Stacking میں تبدیل ہو جائے گا یا پھر وہ ایک تیسری حالت میں چلا جائے گا یعنی Bush Stacking سے Dead Stacking کی طرف۔ جھاڑی (Bush) سے انسان کسی حادثے کی صورت میں یا تو اُوپر جاتا ہے اور درخت (Tree) میں تبدیل ہو جاتا ہے یا پھر نیچے گر جاتا ہے۔ نیچے گرنے کی صورت میں اُس کی قوتِ مشاہدہ ختم ہو جاتی ہے۔ صرف تجزیہ اور نتیجہ باقی رہ جاتے ہیں وہ صورتِ حال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اُس کی خواہشیں اُس پر حاوی رہتی ہیں۔ وہ اپنی تسکین کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اُس کے حواسِ خمسہ اب مشاہدے کے لیے استعمال نہیں ہوتے بلکہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے انسان کو تسکین میسر آ جائے اِس صورتِ حال کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔ ''پھر کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اُس کے دل اور کانوں پر مُہر لگا دی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟'' (الجاثیہ ۲۳)

ہم پھر اُس شخص کا ذکر کرتے ہیں جس نے ترقی کرتے کرتے ایک کمپنی کی سب سے اُوپر کی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ کچھ عرصہ بعد وہ کمپنی کا حصہ دار بن گیا اور پھر اُسے الیکشن لڑنے کا خیال آیا، اُس نے اقتدار کا وہ مزہ چکھا کہ دوسرا ہر نشہ ہیچ نظر آنے لگا۔ اب اُس کی کوشش تھی کہ وہ ہر حال میں حکومت میں رہے اقتدار سے اُسے تسکین ملنے لگی۔ ہر بار جیتنے کے لیے اُسے پیسے کی ضرورت تھی جو اُس نے جائز اور ناجائز ذرائع سے کمانا شروع کر دیا۔ پھر اُس کی خواہش نے اُسے اندھا کر دیا یعنی اُس کے مشاہدے کی قوت سلب ہو گئی۔ اور یوں انسان کی Dead Stacking ہو گئی اب وہ اوندھے منہ زمین پر آن گرا اور خواہشات کی تسکین اُس کی زندگی کا مقصد ٹھہرا۔

اِن ساری باتوں سے دو نتائج اخذ ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ تسکین حاصل کرنے کے کئی ذرائع ہیں۔ یہ اگر کسی حد میں نہ رہیں تو Mammal Brain یعنی Bush Stacking سے ہمیں

نتیجه

Reptile Brain یعنی Dead Stacking کی حالت میں دھکیل دیتے ہیں۔ اگر ہم اللہ سے تعلق استوار کرلیں اور اُس کے شکرگزار بن جائیں تو Human Brain یعنی Tree Stacking کے ارفع مقام پر فائز ہوسکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ کسی نہ کسی مرحلے پر ہمارے مشاہدے، تجزیے اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیتوں میں سے کوئی ایک شدید متاثر ہوجاتی ہے۔ مثلاً Dead Stacking کے درجہ پر مشاہدہ کرنے کی صلاحیت شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔ Mammal Brain یعنی جھاڑی (Bush) کے درجہ پر اگر ہم ذہنی دباؤ (Depression) کا شکار ہوجاتے ہیں تو نتیجہ اخذ کرنے کی طرف نہیں آتے اور اگر پریشانی (Anxiety) میں مبتلا ہوجائیں تو ہماری قوتِ تجزیہ کمزور ہوجاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان کا نظامِ فکر بُری طرح متاثر ہوتا ہے اور زیادہ دیر تک اِس کیفیت میں رہنے کی وجہ سے آخر انسان (Dead Stacking) کی طرف چل پڑتا ہے جہاں وہ جسمانی طور پر تو زندہ ہوتا ہے مگر ذہنی طور پر مردہ ہوجاتا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۷۔ حلقۂ ذہن کی خرابیاں

ذہنی خرابی کا مطلب ہے کہ دماغ تین میں سے کوئی ایک کام کرنا بند کردیتا ہے۔یعنی کسی حادثے، مرض یا ماحولیاتی اثرات کے باعث انسان مشاہدہ اور تجزیہ تو اچھا کرتا ہے لیکن نتیجہ اخذ نہیں کرپاتا۔دوسری صورت میں انسانی ذہن مشاہدہ کرنے کے بعد اچھا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ مشاہدے سے ہی نتیجہ اخذ کرلیتا ہے۔اِس کے اندر معلومات کو پرکھنے اور جانچنے کی صلاحیت کمزور یا ختم ہو جاتی ہے۔تیسری صورت وہ ہوتی ہے جہاں انسان مشاہدہ کرنے کے قابل نہیں رہتا صرف تجزیہ کرتا ہے اور نتیجہ اخذ کرلیتا ہے۔مشاہدہ سے حاصل کی ہوئی معلومات کے بغیر تجزیہ یا نتیجہ بے معنی ہے۔

پچھلے ابواب میں ہم جان چکے ہیں کہ دماغ مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کے کام تین سطحوں پر کرتا ہے۔ Human Brain کی سطح پر یہ کام بہترین ہوتا ہے۔ہم اب اِس کو Tree Model کا نام ہی دیں گے کیونکہ قرآن میں اس ذہنی کیفیت کے لیے یہی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔Tree Model میں بہترین مشاہدہ ہوتا ہے پھر بہترین تجزیہ انجام پاتا ہے اور آخر میں مضبوط تناہی بہترین نتیجہ تخلیق کرتا ہے۔

اُس کے بعد ہم آتے ہیں Mammal Brain کی طرف جس کو قرآن جھاڑی (Bush) کا نام دیتا ہے اور ہم اِسے Bush Model کہہ لیتے ہیں۔اِس حالت میں انسانی دماغ کے تجزیہ کرنے کا عمل بہت کمزور ہو جاتا ہے۔انسان مشاہدہ کرکے مختلف نوعیت کے نتائج اخذ کرتا ہے، ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ نتائج مختلف لوگوں میں الگ الگ ہوتے ہیں۔انسان کی شخصیت مجموعۂ اضداد بن جاتی ہے۔خواہشات اور تحفظات تجزیہ کو کمزور کردیتے ہیں جس کے نتیجہ میں بیک وقت کئی تنے وجود میں آجاتے ہیں اِس لیے ہم اِس نوع کی سوچ کو Bush Model سے تعبیر کرتے ہیں اِس کے بعد Reptile Brain کی قسم کی سوچ ہے جسے ہم Dead Model کا نام دیتے ہیں اِس میں انسان کے مشاہدہ کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے اور بات تجزیہ یا نتیجہ تک پہنچنے ہی نہیں پاتی۔

اِس ماڈل کے تحت انسان اپنی خواہشات کے تابع ہوتا ہے وہ اپنے نتائج کو تبدیل نہیں کرسکتا۔مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو تجزیہ ہو پاتا ہے اور نہ ہی نتائج میں تبدیلی یا بہتری آتی ہے۔وہ کچھ صحیح کچھ غلط نتائج کی مدد سے زندہ رہتا ہے۔بار بار اپنے نتائج میں ترمیم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ اُس کے تجزیہ میں کوئی مشاہدہ شامل نہیں ہوتا اس لئے وہ بدستور اُنہیں نتائج کو قبول کرنے پر مجبور ہوتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔وقتی تسکین ملنے کی صورت میں اُس کو اپنے نتائج کے صحیح ہونے کا گمان رہتا ہےاور وہ اپنی خواہشات میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔خواہشات کی عدم تسکین اُسے خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔اور اُس کا غلط تجزیہ اُسے حزن و یاس کی آغوش میں دھکیل دیتا ہے۔ پھر اُسے صورتِ حال کے ابتر ہونے کی فکر کھائے جاتی ہے۔اِس طرح اُس کے نتائج اور راسخ ہوجاتے ہیں۔

یہی وہ ماڈل ہے جس کے لیے قرآن نے ایسے پاگل کتے کی مثال وضع کی ہے کہ جسے پچکارو تو بھی اُس کی رال بہتی ہے اور اگر دھتکار دو تو بھی اُس کی رال بہتی ہے۔ یہاں اِس بات کی تکرار مناسب ہے کہ دنیا میں اکثر انسان Bush Model یعنی Mammal Brain کی سطح پر ہوتے ہیں اگر اُن کی حالت ابتر ہو جائے تو Dead Model یعنی پاگل کتے کی سوچ کے درجہ پر چلے جاتے ہیں رفتہ رفتہ اُن کا مشاہدہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور جھاڑی کا تنا سوکھ کر زمین پر گر جاتا ہے۔یہی وہ صورت ہے جس کو قرآن نے ''سورہ والتین'' میں ''اسفل السافلین'' کا نام دیا ہے۔اِس کے برعکس وہ کیفیت ہے جس سے انسان Bush Model سے Tree Model میں تبدیل ہو جاتا ہے۔Bush Model کے طور پر وہ سماج اور معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلتا ہے۔اُس کا تجزیہ اللہ کی پسند یا ناپسند سے بے نیاز ہوتا ہے۔وہ تہواروں، محفلوں، لوگوں اور رسموں کا دلدادہ ہوتا ہے۔اُسے اِس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اِس تہوار، محفل یا رسم کی اجازت اللہ نے دی ہے یا نہیں۔

اب اگر وہ ''اسفل السافلین'' کی طرف جائے تو وہ اللہ کو بھولنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو بھی بھول جاتا ہے پھر اُس کی زندگی لذت یا خوف سے عبارت ہوتی ہے۔اِس کے برعکس اگر وہ معرفت کی طرف جائے تو یہ راستہ ''احسن التقویم'' کا ہوتا ہے انسان بتدریج Bush Model سے Tree Model میں تبدیل ہو جاتا ہے اُس کے نتائج ایک ہی نہج پر آ جاتے ہیں۔اور اُس کا دماغ اپنے تینوں حصوں کا بھر پور استعمال شروع کر دیتا ہے اِس ماڈل کے مطابق انسانی ذہن ہر تہوار، واقعہ، شخص، اور تہذیب کا مشاہدہ اللہ کے حکم اور رضا کی روشنی میں کرتا ہے۔وہ اپنے ہر نتیجے میں اللہ کی خوشی اور اُس کے خوف کو مدِ نظر رکھتا ہے۔یہی وہ بات ہے جو انسان کو Bush Model سے Tree Model میں تبدیل کر دیتی ہے۔

توحید کے حوالے سے دنیا میں تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ایک تو وہ جو ظاہری طور پر نہیں تو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

حلقۂ ذہن میں خرابیاں

باطنی طور پر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔ اُن کے خدا تہذیب اور معاشرت ہیں یا پھر اُن کی خواہشیں۔ یعنی اگر تو وہ Bush Model پر ہوئے تو اُن کا خدا معاشرت ہوگی ہم آگے چل کر معاشرت کے مختلف اجزاء کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ انسان کس طرح اپنے ماحول میں سے کسی ایک جزو کو اپنے اُوپر حاوی کر لیتا ہے۔ یا پھر وہ یہی حرکت لذت کوشی کے لیے کرتا ہے اور خواہش کو خدا مان لیتا ہے ایسا کرنے کی صورت میں وہ Dead Model بن جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اللہ کو خالق تو مانتا ہے اور بوقت ضرورت رازق بھی تسلیم کر لیتا ہے ایسے لوگ عام طور پر Mammal Brain کی سطح پر ہوتے ہیں اگر معاشرے میں خدا کا ذکر عام ہو تو وہ مان لیتے ہیں کہ خدا اُن کا خالق ہے لیکن اس سے زیادہ وہ کسی بات پر یقین نہیں رکھتے۔ اِس عقیدے کی وجہ سے اُن کے دماغ میں موجود سینکڑوں فائلوں میں سے صرف چند ایک متاثر ہوتی ہیں۔ باقی کسی چیز میں تبدیلی نہیں آتی۔ ہاں اگر مشکل وقت آن پڑے تو وہ اچانک خدا کو رازق اور بعض حالات میں مشکل کشا جان کر اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مگر حالات سدھرتے ہی وہ اپنی عمومی سوچ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

اگر ناگوار حالات دیر تک رہیں تو جیسا پہلے ذکر ہوا وہ اللہ کو بطور خالق بھی بھول جاتے ہیں اور Dead Model میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں ورنہ وہ اللہ کے ساتھ آخرت پر بھی ایمان لے آتے ہیں اور کوئی مشکل اُن کے لیے مشکل نہیں رہتی۔ اور یوں وہ Tree Model میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حاصل گفتگو یہ ہوا کہ اللہ کے ساتھ اگر آخرت کا یقین نہ ہو تو انسان کا Tree Model میں تبدیل ہونا مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کے بیشتر مسلمان جو مغربی تعلیم اور میڈیا کے زیر اثر یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ اللہ کے کاموں کو اپنے نتائج کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور اُن کے اور غیر مسلم کے نتائج میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

اتنا ضرور ہے کہ مسلمان مشکل وقت میں اللہ کی طرف فوری رجوع کرتے ہیں اور اُس صورت میں اُن کا Bush Model سے Tree Model کا سفر تیز تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص معاشرتی تقاضوں کی پیروی کرتے ہوئے شراب نوشی کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُس کی حالت ابتر ہوتی جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اُس کی صحت جواب دے جاتی ہے۔ اور وہ شدید مایوسی کا شکار رہنے لگتا ہے اب

حلقۂ ذہن میں خرابیاں

اگر اللہ کی ذات کہیں اُس کے نتائج کا حصہ ہوگی تو وہ اللہ کی سمت رجوع کرے گا اور بتدریج Bush Model سے Tree Model میں تبدیل ہوگا ورنہ وہ اِس مایوسی کے عالم میں بلا نوشی میں مبتلا ہوجائے گا اور پھر Dead Model ہوکر پہلے ذہنی اور جذباتی طور پر مفلوج ہوگا اور بالآخر اُسے جسمانی موت آدبوچے گی۔

اِسی طرح کی ایک مثال اُس لڑکی کی ہے جسے اچھی زندگی گزارنے کی خواہش تھی اِسی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ایک متمول شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اُس کا محبوب اُسے نہ ملا۔ اب اُس کے لیے دو راستے تھے۔وہ تقدیر کے فیصلے پر راضی ہوجاتی اور خود کو Bush Model سے Tree Model میں تبدیل کرلیتی۔ورنہ وہ ناکامی کے غم کو سینہ سے لگا کر خود اذیتی کا شکار ہوجاتی۔آخر کار اُسے اِس خود اذیتی میں تسکین ملنا شروع ہوجاتی۔اُس صورتِ حال میں وہ نہایت خودغرض ہوجائے گی۔اور اپنی ناکامیوں سے فرار کی راہیں ڈھونڈے گی۔وہ یہ نتیجہ اخذ کرے گی کہ زندگی میں ابھی بہت سے حادثات اور ناکامیاں اِس کا مقدر ہیں جن سے بچنے کے لیے وہ تگ ودو میں مصروف رہے گی مگر اُس کے لیے صرف اُس کی ذات مقدم ہوگی اور اُسے کسی اور کا کوئی احساس نہ ہوگا۔یوں وہ Bush Model سے نکل کر Dead Model کا لقمۂ تر بن جائے گی۔

زندگی کا اہم ترین دور وہ ہوتا ہے جب انسان Bush Model میں تبدیل ہورہا ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے اپنی عزت، ناموس، تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں بہت حساس ہوتا ہے اپنے مشاہدات سے حاصل ہونے والی معلومات سے نتائج اخذ کرنے میں اُسے دشواری کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ کسی ایک شخص کی پسند یا ناپسند، کوئی ایک سماجی مجبوری یا محرومی اُس کے فیصلے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔وہ سوچتا ہی رہ جاتا ہے۔مگر یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔اُسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے ہر تجزیہ میں لوگ اور معاشرہ کی دیواریں حائل ہیں وہ اپنی فائلوں کا جائزہ لیتا ہے تو اُنہیں ہر لحاظ سے ناقص پاتا ہے کیونکہ پچھلے کچھ عرصے میں اُس کی فائلوں میں سے اللہ کی خوشنودی نکل گئی ہے اور صرف لوگوں کی خوشنودی باقی رہ گئی ہے۔احساسِ زیاں ہوتے ہی وہ اپنی فائلوں کو ٹھیک کرتا ہے اور پھر سے Tree Model میں تبدیل ہوجاتا ہے۔دوسری صورت میں اِس کے فیصلے لوگوں کے گرد گھومتے ہی وہ اپنی ماں اور بیوی میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتا ہے یا وہ اپنے دفتر میں ایک کے مقابلے میں دوسرے ساتھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ فیصلہ کچھ بھی ہو ہر حال میں انسان کو انسانوں سے امیدیں بندھ جاتی ہیں۔ جو کبھی پوری نہیں ہوتیں اور قدم قدم پر انسان کو دھچکے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ تیزی سے Bush Model سے Dead Model میں جانا شروع کر دیتا ہے اسی کیفیت کو اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں۔

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے ؟

ذاتی خواہشات، لوگ، معاشرہ، رسم و رواج وغیرہ بُت ہی تو ہیں جو انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکا دیتے ہیں۔ اب تک کی گفتگو سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اِن تینوں میں سے Tree Model ٹائپ سوچنے کا انداز مکمل اور جامع ہے جبکہ دوسرے دونوں نقائص سے پُر ہیں۔ یہاں دو سوال اٹھتے ہیں Bush Model اور Dead Model سے انسان میں کیا نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اُن کی شناخت کیسے کی جا سکتی ہے؟

سب سے پہلے Dead Model ٹائپ کو لیتے ہیں۔ Dead Model والے لوگ اپنی آنکھوں سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں یا تو اپنے دامن پر رہیں گی یا پھر ہر طرف تیزی سے حرکت کرتی نظر آئیں گی۔ آنکھیں دامن پر ہونے کی صورت میں یہ لوگ گفتگو کرتے ہوئے بھی کسی کو نہیں دیکھتے۔ اُنہیں چیزوں کے مشاہدہ سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ صرف اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا خیال اُن کو دامن گیر رہتا ہے جس کو وہ کسی صورت پورا نہیں کر سکتے۔ اور اگر کبھی پورا کر بھی لیں تو آرزو اور بھی بڑھ جاتی ہے جس کے بعد وہ تجزیہ اور نتیجہ کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ عام طور پر کم ہمت اور بزدل ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے نہ تو اُن کے پاس وسائل ہیں اور نہ ہی قوت۔ بلکہ بعض اوقات اُنہیں احساس بھی ہوتا ہے کہ ان کی خواہش اور خوف بے بنیاد ہیں پھر بھی وہ اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔

Dead Model ٹائپ میں دوسری قسم اُن لوگوں کی ہوتی ہے جن کی آنکھیں ایک جگہ زیادہ دیر رُک کر مشاہدہ نہیں کر سکتیں۔ وہ مسلسل ایک چیز کے بعد دوسری چیز کو سرسری طور پر دیکھتے رہتے ہیں اُن کی آنکھ مسلسل اپنی خواہش کی تسکین کے ذرائع ڈھونڈتی ہے یا پھر وہ اپنے خوف کو کم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حلقۂ ذہن میں خرابیاں

اُن لوگوں میں خاص قسم کے امراض جنم لیتے ہیں Dead Model ٹائپ کی پہلی قسم کے لوگ جو آنکھیں بوجھل کیے دنیا سے لاتعلق بیٹھے رہتے ہیں عام طور پر السر کی شکایت کرتے ہیں ان کا سر بوجھل رہتا ہے رات کو نیند نہیں آتی۔ جگر اور معدے کی بیماریاں اُن کو گھیرے رکھتی ہیں اور Obsessive Compulsive Disorder کا شکار رہتے ہیں یعنی انہیں ایک ہی کام بار بار کرنے کی عادت ہوجاتی ہے۔ اُنہیں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ڈوب رہے ہوں۔ بھوک نہیں لگتی۔ رونا آتا ہے اور شدید مایوسی ہوتی ہے۔ اگر یہ ذرا سا کھانا کھالیں تو متلی ہونے لگتی ہے۔ وہ لوگ گھنٹوں تنہائی میں خاموش رہ سکتے ہیں۔ اُن کا رنگ زرد ہوجاتا ہے اور بال تیزی سے گرنے لگتے ہیں اُن میں خون کی کمی ہوجاتی ہے جسم میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے اِس لیے اُن کے بال گچھوں کی شکل میں گرتے ہیں۔

دوسری قسم Dead Model ٹائپ لوگ وہ ہوتے ہیں جو موٹے ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا وزن بہت بڑھ جاتا ہے۔ اُن کی بیماریاں غائب ہونا شروع ہوجاتی ہیں اُن کے اندر تشدد اور چُستی آجاتی ہے وہ دیکھنے میں انتہائی متحرک نظر آتے ہیں اُن کا بڑا مسئلہ وزن کی زیادتی ہوتا ہے۔ پھر اچانک ایک دن انہیں ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔ یہ ہارٹ اٹیک ۳۵ سال کے بعد کبھی بھی ہوجاتا ہے اور عام طور ۴۵ سے ۵۰ سال کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر وہ اس ہارٹ اٹیک سے جانبر ہوجائیں تو طبّی معائنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اُن کا دل تو کافی عرصے سے ''بلاک'' تھا۔ اور اب مستقل علاج کی ضرورت ہے۔ بہت سے Dead Model ٹائپ کے لوگ یہ سنتے ہیں تو اُن میں اچانک ایک بڑی تبدیلی آتی ہے یا تو وہ Dead Model ٹائپ کی دوسری قسم میں تبدیل ہوجاتے ہیں یعنی اب وہ آنکھیں جھکائے ایک کونے میں پڑے رہتے ہیں۔ پہلے وہ ہر کسی معاملے میں دخل دیتے تھے، اپنی بات منواتے تھے اور اب وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرتے۔ ضرورت سے زیادہ حرکت اچانک حد سے بڑھی ہوئی سستی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور وہ ہار مان کر پڑے رہتے ہیں۔

یا پھر اُن کے اندر دوسری تبدیلی آتی ہے اور وہ Dead Model ٹائپ سے Tree Model ٹائپ میں تبدیل ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اُن کے نتائج کی فائلیں اچانک کُھل جاتی ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی فائلوں میں اللہ کی محبت ہے نہ ہی اللہ کا خوف۔ اُنہیں احساس ہوتا ہے کہ اُن کی ہر فائل دنیا کو مستقل جان کر بنائی گئی ہے۔ یہ اِدراک انہیں اپنی ہر فائل میں ترمیم و تنسیخ پر مائل کرتا ہے۔ اُن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا مشاہدہ شروع ہوجاتا ہے۔ اُن کے تنے آپس میں مل جاتے ہیں۔ اور ایک مضبوط تنا وجود میں آجاتا ہے۔خیالات میں یکسوئی آجاتی ہے اور وہ Tree Model ٹائپ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

اب ہم آتے ہیں Bush Model ٹائپ کے لوگوں کی طرف۔ اُن کو پہچاننا بھی کوئی اتنا مشکل نہیں۔ اُن سے بات کرتے ہوئے آپ کو احساس ہوگا کہ اُن کی گفتگو میں دوسرے لوگوں کی رائے کو بہت دخل ہے۔ یہ دوسرے لوگ کئی طرح کے ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کسی خاص پروگرام کو بہت مشاہدہ اور تجزیہ کے بعد ترتیب دیں لیکن اِس کے بارے میں اُنہوں نے معلومات ٹیلیویژن سے جمع کی ہوں یا اُنہیں کسی رشتہ دار یا دوست نے مجبور کیا ہو۔ یا پھر کسی پسندیدہ شخصیت کی خوشی کے لیے وہ سب کچھ کررہے ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ اُن کے فیصلے لوگوں اور واقعات کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ اپنے نتائج صرف اِس لیے تبدیل کردیتے ہیں کہ فلاں شخص جس کی خوشی کے لیے وہ کوئی کام کررہے تھے اب وہاں نہیں یا وہ اب اُس کام سے خوش نہیں ہوتا۔ اُنہیں اگر یہ معلوم ہوجائے کہ جو کام وہ کررہے ہیں دوسرے وہی کام کرنے والے دوسروں کی نظر میں عزت نہیں پاتے تو یہ دیکھ کر وہ خود بھی وہ کام چھوڑ دیتے ہیں۔ وجہ پوچھنے پر بتائیں گے کہ لوگوں کی نظر میں اِس کام کی کوئی عزت نہیں۔ ایسے لوگ چھوٹی چھوٹی کامیابیوں اور تعریفوں پر بہت خوش ہوجاتے ہیں۔ بچوں کی طرح اُچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ اُن کا بس نہیں چلتا کہ وہ ساری دنیا کو اپنی کامیابی کے بارے میں چیخ چیخ کر بتائیں۔ دوسری طرف ذراسی ناکامی اُنہیں مایوس کردیتی ہے۔ پھر اُن کی باتیں سننے کے قابل ہوتی ہیں یوں لگتا ہے کہ اُن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی بناوٹی ہوتی ہے۔ وہ اکثر کام ''فیشن'' سمجھ کر کرتے ہیں۔ اُنہیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر کام ''فیشن'' کے مطابق نہ ہوا تو اِن کو وہ عزت نہیں ملے گی جس کی خواہش اُن کے دل میں مچلتی ہے۔ اُنہیں لوگوں کے تمسخر کا خوف ہوتا ہے۔ Bush Model ٹائپ کے اکثر لوگوں کے اصول، عقائد اور طرزِ زندگی پر کسی اور انسان کی مہر بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ اُن کا مشاہدہ کرنے پر پتا چلے گا کہ اُن کے ہر کام کا مقصد دوسروں کو خوش کرنا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ یہ اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ اُن کے اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ اپنے قریبی لوگوں کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتے تھے یا اپنے آباواجداد کے زیرِ اثر بنائے گئے نتائج کو تبدیل کرنے میں خوف محسوس کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو آپ ہمیشہ دوسروں کا مشاہدہ کرتے پائیں گے۔ وہ لوگ آیات کا مشاہدہ کرنے میں دلچسپی نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھتے۔ آپ ساحلِ سمندر پر اُنہیں قدرتی مناظر کا مشاہدہ کرتے نہیں پائیں گے بلکہ وہ ایک گروہ میں بیٹھ کر خاندان کے لوگوں کے بارے میں باتیں کریں گے، دور پانی میں نہاتے ہوئے لوگوں پر تبصرہ کرنے میں مزہ لیں گے لیکن اُن کے اُوپر اُڑنے والے دو Seagull کی پرواز اُنہیں متاثر نہیں کرے گی۔

اُنہیں بھی کئی قسم کے جسمانی عارضے لاحق ہوتے ہیں جن میں سب سے نمایاں خشکی ہے۔ جو سر سے لے کر پاؤں تک کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ اُنہیں نزلہ زکام بھی اکثر ہوتا ہے۔ اُن کا ایک اور مسئلہ قبض یا بدہضمی ہوتا ہے۔ اُن کو مزے مزے کے کھانے کھانے میں بڑا مزا آتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ دستر خوان بھرا ہوا ہو۔ اُن کا پیٹ جلدی نکل آتا ہے اور اُس کے بعد اُن کو کھٹی ڈکاروں کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اُن کی ٹانگوں میں کمزوری کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور وہ معجون سے لے کر ملٹی وٹامن تک ہر چیز خوب استعمال کرتے رہتے ہیں۔

اِن ساری علامات کی روشنی میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دماغ کا بہترین استعمال ایک بہترین زندگی کو جنم دیتا ہے جبکہ اِس میں پیدا ہونے والے نقائص کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دماغی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے ہمیں اپنے علاوہ کسی کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم اپنے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ کے طریقِ کار کو درست رکھیں اور احسن طور پر استعمال کرتے رہیں تو ہم ایک مطمئن، با مقصد اور کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے صرف دماغی صلاحیتوں کی ضرورت ہے؟ یا ہمارے جذبات کا بھی کچھ دخل ہے؟ اگر ہے تو یہ جذبات کہاں ہیں؟ کیسے وجود میں آتے ہیں؟ اور کس طرح ہمارے دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ اِن سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں دل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۸. حلقۂ قلب

دل و دماغ کے معاملے پر قرآن حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ اپنے رب کی تلاش میں نکلے۔آپؑ نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا۔سورج کے حجم، نور اور تمازت نے جادو جگایا آپ نے تجزیہ کیا کہ سورج سے زیادہ طاقتور شے کائنات میں کوئی اور نہیں۔آپ نے فیصلہ کیا کہ سورج ہی رب ہے۔آپ کا یہ فیصلہ شام کو مغرب کے وقت غلط ثابت ہوا جب سورج بھی ڈوب گیا۔پھر چاند نظر آیا۔ آپ کو وہی گمان گزرا مگر وہ بھی باطل ثابت ہوگیا۔رات کے ستارے کی چمک دمک نے متاثر کیا وہ سمجھے وہی اُن کا رب تھا جب وہ ڈوب گیا تو آپ پکار اُٹھے ''ڈوبنے والا رب نہیں ہوسکتا''۔دراصل آپ نے نہایت ہی کم مشاہدے پر تجزیہ کر کے نتیجہ اخذ کرلیا تھا۔لیکن یہ مشاہدات آپ کے دماغ میں یکجا ہوئے آپ نے تجزیہ کیا کہ کوئی اور قوت ہے جو اِن سب کو اور باقی لاکھوں کروڑوں اشیاء کو اپنے قبضۂ قدرت میں لیے ہوئے ہے اور جس کے حکم سے یہ اپنے اپنے راستے پر رواں دواں ہیں۔انہوں نے ایک نیا اور جامع فیصلہ کیا یعنی کائنات کا مالک ہی میرا رب ہے جو ہمیشہ موجود رہتا ہے، زندگی اور موت جس کے اختیار میں ہے، جو سب کو پالتا ہے۔

یہ تو معاملہ ہوا دماغ کا۔قرآن کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا کردار مثالی ہے۔کوئی بھی شخص مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کو استعمال کر کے اپنے رب تک پہنچ سکتا ہے لیکن اِس کے لیے ضرورت ہے قلبِ سلیم کی۔یعنی انسان کا دل انسان کے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور قرآن نے دماغی صلاحیت کے مثبت استعمال کے لیے قلبِ سلیم کی شرط عائد کی ہے۔اِس لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ انسانی شخصیت میں دل کا کردار کیا ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ دل دراصل جذبات کی پناہ گاہ یا نرسری ہے۔جہاں انسان کے جذبات جمع ہوتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔حسد، نفرت، محبت، خلوص اور ایسے بہت سے دوسرے الفاظ جو جذبات کو بیان کرتے ہیں دماغ سے ہوتے ہوئے دل میں داخل ہوتے ہیں۔اب اگر دل جذبات کا گہوارہ ہے تو پھر تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔

س۱: دل میں جذبات کہاں سے آتے ہیں؟

س۲: دل میں موجود جذبات کتنی اقسام کے ہوتے ہیں؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

س۳:	اِن جذبات کا انسانی شخصیت پر کیا اثر ہوتا ہے؟

ہم اِن تین سوالوں کے جواب کی روشنی میں دل کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اِس لیے ہم پہلے سوال سے شروع کرتے ہیں۔دل میں جذبات کہاں سے آتے ہیں؟ ایک نوزائیدہ بچہ اپنی ماں کی گود میں دودھ پی رہا ہے۔ دودھ پیتے ہوئے وہ اپنی ماں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کی ماں اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ بچے کا مشاہدہ اور تجزیہ اُس کے اندر نتائج کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ نتیجہ کیا ہے؟ بچہ اپنی ماں کے بارے میں کیا رائے قائم کر رہا ہے؟ یہ دودھ پیتا بچہ اپنی ماں کے بارے میں جو فائل بنانے میں مصروف ہے اُس میں دو قسم کی معلومات ہیں۔ایک ٹھوس اور دوسری مجرد۔یا سائنسی زبان میں یوں کہیے کہ اُس کی فائل میں دو قسم کے نتائج ہوتے ہیں ایک تو مشاہدہ اور اُس کی تصدیق پر مبنی ہیں جبکہ دوسرے نہ تو ناپے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں سائنسی بنیادوں پر بیان کیا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر بچہ دیکھتا ہے کہ اُس کی ماں کا رنگ کیسا ہے؟ وہ کیسے ہنستی ہے؟ وہ کیسے کپڑے پسند کرتی ہے؟ اُس کے ہاتھ میں کنگن کیسے ہیں؟ اور اُس نے کیسی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے؟ اگر اُس کی ماں اُسے لوری سناتی ہے تو کون سی؟ اور کیسی؟ کیا اُس کی ماں آرام سے باتیں کرتی ہے یا چیخ کر؟ پھر اُس کی ماں کی خوشبو کیسی ہے؟ وہ کون سی خوشبوئیں پسند کرتی ہے؟ اُس کے ہاتھوں کالمس کیسا ہے؟ جو دودھ وہ اُسے دیتی ہے اُس کا ذائقہ کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب معلومات کسی قدر ٹھوس ہیں یعنی بوقتِ ضرورت اِن ساری معلومات کو بیان کرنے کے لیے الفاظ، مثالوں یا بصری وسائل کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔

کئی سال کے بعد بھی یہ فرد کہہ سکتا ہے کہ اُس کی ماں کی آواز فلاں گلوکارہ سے ملتی تھی۔اُس کی ماں کے ہاتھ میں دو چوڑیاں ہمیشہ رہتی تھیں۔اُسے نیلا رنگ پسند تھا اور وہ اُسے کھانا نہ تو زیادہ گرم دیتی تھی نہ ہی زیادہ ٹھنڈا۔اِس سارے مشاہدے کی بدولت اُس فرد میں اپنی ماں کے لیے محبت کے جذبات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ''میں اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتا ہوں''۔اُس کی فائل میں یہ جملہ بھی موجود ہوگا۔لیکن محبت ٹھوس نہیں اُس کا تخمینہ نہیں لگ سکتا وہ کسی ترازو میں نہیں تولی جاسکتی ہاں کچھ تمثیلات اور استعارے ہیں جو اُس کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں وہ بھی واضح نہیں۔ پھر ہر معاشرے میں ان کی نوعیت بھی جدا جدا ہے۔تمام جذبات اِسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔اُن کی پیمائش نہیں ہوسکتی۔اُن کو جاننے کا دعویٰ کچھ ماہرینِ نفسیات اور سائنس دان کرتے تو ہیں لیکن آج تک وہ بھی یہ ثابت نہیں کر سکے کہ جذبات کی شدت کا ادراک اُنہیں کیسے ہوجاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حلقۂ قلب

دماغ مشاہدہ اور تجزیہ کر کے جو نتائج اخذ کرتا ہے اُس میں سے ٹھوس حقائق کو تو وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے جبکہ مجرد جذبات کو وہ آگے دل کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اور یہی بنیادی فرق ہے دل و دماغ کا۔ دماغ حقائق کو محفوظ کرتا ہے دل اُسی سے متعلق جذبات کو جذب کر لیتا ہے۔ دماغ حرکات و سکنات، آوازوں، رنگوں، تعداد اور ذرائع کو ایک فائل میں جمع کر لیتا ہے جبکہ دل اُسی فرد، چیز، جگہ، موقع یا نظریہ کے بارے میں جذبات کو سنبھال لیتا ہے۔ یاد رہے کہ نتیجہ کی حد تک دماغ میں یہ دونوں چیزیں یکجا ہوتی ہیں نتیجہ پر پہنچ کر دماغ میں جیسے کوئی چھلنی (Strainer) لگی ہوتی ہے۔ جس سے گزر کر جذبات نیچے دل کی طرف چلے جاتے ہیں اور ٹھوس حقائق دماغ کی فائل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اب ہم جانتے ہیں کہ جب ہم کسی چیز کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اُس سے متعلق فائل ہمارے دماغ میں کھل جاتی ہے۔ پھر ہم اپنے خیالات کا اظہار اُس فائل میں درج معلومات اور نتائج کی مدد سے کرتے چلے جاتے ہیں۔

اصل میں کسی موضوع پر بات کرتے ہوئے ہمارے اندر اُس حوالے سے دو فائلیں کھلتی ہیں ایک دماغ میں اور دوسری دل میں۔ دماغ میں تو ہم اُس سے متعلق ٹھوس حقائق جمع کرتے ہیں جبکہ دل سے ہم اُسی کے بارے میں جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک انسان سے ماں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اِس وقت معلومات کس فائل سے آ رہی ہیں۔ دل سے یا دماغ سے۔ دماغ کی فائل سے معلومات اخذ کرتے وقت ہم اکثر سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ رُک رُک کر حقائق پیش کرتے ہیں بعض معلومات جو ہماری فائل سے حذف ہو گئی ہوتی ہیں انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ دل کی فائل سے معلومات نکال کر پیش کرتے وقت ہر فرد ایک جذباتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ یا تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے یا پھر آنکھوں میں آنسو۔ دل سے معلومات اور جذبات پیش کرتے وقت کسی قسم کی دقّت نہیں ہوتی۔ کیونکہ دل میں محفوظ معلومات حذف نہیں ہوسکتیں۔ جذبات بڑی روانی سے سامنے آجاتے ہیں۔ گفتگو میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے جبکہ دماغ کی گفتگو عام طور پر خشک ہوتی ہے۔

ہم ماں کے موضوع کو دوبارہ مثال بناتے ہیں آپ ایک فرد سے اُس کی ماں کے بالوں کا رنگ پوچھیں، اُس کا آبائی شہر دریافت کریں، اُس کی تعلیم کہاں کہاں اور کن اداروں میں ہوئی معلوم کریں تو شاید وہ ان سب سوالوں کا جواب سوچ کر دینے پر مجبور ہو۔ لیکن اُس سے پوچھیں کہ اُسے اپنی ماں سے کتنی محبت ہے تو وہ اُس کا اظہار برملا اور کسی رکاوٹ کے بغیر کر سکتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب اِسی کیفیت کو ایک اور انداز سے دیکھیں، ہم ایک ایسے فرد کے بارے میں سوچتے ہیں جو پچھلے کئی دن سے شدید بخار میں مبتلا ہے اُسے غشی کے دورے بھی پڑ رہے ہیں۔ آپ اُس کے پاس بیٹھے ہیں آپ کے سامنے اُسے پھر غشی کا دورہ پڑتا ہے۔ ہوش میں آنے پر آپ اُس سے اُس کی ماں کے بارے میں ایسا سوال کریں جس کا جواب اُس کے دماغ کی فائل میں موجود ہو تو زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ جواب نہ دے پائے گا اور اُس کی معذرت کی وجہ بھی یہی ہوگی کہ بیماری کے باعث اُس کا دماغ کام نہیں کر رہا۔ اُسی فرد سے دریافت کریں کہ وہ اپنی ماں سے کس قدر محبت کرتا ہے تو اِس جواب کے لیے اُسے زیادہ سوچنا نہیں پڑے گا۔ بخار اور غشی کی مثال تو ایک انتہائی صورت ہے۔ بیشتر افراد تو نیند پوری نہ ہونے کی صورت میں یا پیٹ خراب ہونے کی کیفیت میں ہی دماغی معلومات یا نتائج پیش کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اِس گفتگو سے ظاہر ہے کہ دل و دماغ:

۱: اپنے اپنے اندر الگ الگ فائلیں مرتب کرتے ہیں۔

۲: دماغ کی فائلوں میں حقائق ہوتے ہیں۔

۳: دل کی فائلوں میں جذبات ہوتے ہیں۔

۴: کسی موضوع پر بات کرتے ہوئے دونوں فائلیں کھُل جاتی ہیں۔

اِسی طرح دل و دماغ کی فائلیں منفرد نوعیت کی حامل ہوتی ہیں۔

۱: ا۔ دل کی فائلیں ٹھوس حقائق پر مبنی نہیں ہوتیں۔

ب۔ دماغ کی فائلیں ٹھوس حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔

۲: ا۔ دل کی فائلوں سے معلومات حذف نہیں ہوتیں۔

ب۔ دماغ کی فائلوں سے معلومات حذف ہو سکتی ہیں۔

۳: ا۔ دل میں جذبات کی فائلوں کو منضبط کرنے کی لامحدود صلاحیت ہوتی ہے۔

ب۔ دماغ میں حقائق کو جمع کرنے کی ایک محدود استعداد ہوتی ہے۔

یہ آخری فرق اتنا اہم ہے کہ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے۔ دماغ میں فائلوں کے ترتیب پانے کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے اُن کے زائل ہونے کی رفتار بھی اُتنی ہی تیز ہوتی ہے۔ دماغ اپنے اندر ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خاص تعداد میں ہی فائلیں جمع کر سکتا ہے۔ جب یہ تعداد پوری ہو جاتی ہے تو پھر اُسے کوئی بھی نئ فائل بنانے کے لیے دو میں سے کوئی ایک کام کرنا پڑتا ہے۔

ا: کوئی فائل سرے سے تلف کرنا پڑتی ہے۔

۲: کئی فائلوں کا حجم کم کرنا پڑتا ہے۔

اِن دو صورتوں میں سے ایک سے گزر کر ہی انسان کوئی نئ فائل بنانے کے قابل ہوتا ہے۔ دل کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ دل کے اندر جذبات سے متعلق فائلیں بنانے کی نہ صرف لامحدود صلاحیت ہے بلکہ ہر فائل کو محفوظ کرنے کا بندوبست بھی دماغ سے کہیں بہتر ہے۔

مثلاً آپ کسی جنگل سے گزرے۔ وہاں آپ نے ایک خوف ناک سانپ دیکھا۔ اِس واقعہ کے کئی سال بعد شاید آپ کو اُس دن کی تاریخ اور وقت یاد نہ رہے بلکہ اُس جگہ کا نام بھی یاد نہ ہو جہاں آپ نے وہ سانپ دیکھا تھا۔ لیکن آپ کے دل سے سانپ کا خوف نہیں نکل سکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کو یاد کرنا پڑے کہ آپ سانپ کو پسند کرتے ہیں یا آپ اُس سے ڈرتے ہیں۔ اِسی طرح ایک بچے کو آپ اُس لڑکے کی کہانی سنائیں جو بکریاں چرانے جاتا تھا اور پھر مذاق میں ''شیر آیا'' ''شیر آیا'' کی آوازیں لگاتا تھا۔ اِس کہانی میں واقعات کا تسلسل بچے کے دماغ میں محفوظ ہوگا۔ جبکہ لڑکے کی نادانی پر افسوس دل میں ثبت ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے بڑھاپے میں یہ فرد بھول جائے کہ کہانی میں گاؤں کا نام کیا تھا، لڑکے کی عمر کتنی تھی، اُس کے پاس کتنی بھیڑیں تھیں، لیکن اُس کی کم عقلی پر افسوس پھر بھی ہوگا۔ یہ کہنے میں مشکل پیش نہیں آئے گی کہ لڑکے نے نادانی کا مظاہرہ کیا تھا۔

دنیا کی ہر تحریر دماغ میں محفوظ ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اُس کے کچھ حصے یا تو حذف ہو جاتے ہیں یا پھر آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں۔ اِس اصول سے نبی ﷺ کی ذات اور قرآن مستثنیٰ ہیں۔ قرآن معجزاتی طور پر نبی ﷺ کے دل میں محفوظ ہوا جہاں کبھی جذبات کے علاوہ کوئی اور چیز جگہ ہی نہیں پاتی۔ اللہ نے قرآن کی حفاظت کے لیے نبی ﷺ کے دل کو منتخب کیا کیوں کہ وہاں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوسکتی اور قرآن کو ایک کیفیت کی صورت میں محفوظ کر دیا تاکہ قرآن کا ہر لفظ ویسے ہی ثبت رہے جیسے جذبات مرتکز ہوتے ہیں۔ اِسی لیے رسول اللہ ﷺ بھی چلتا پھرتا قرآن تھے کیونکہ قرآن اُن کے جذبات کا حصہ تھا اور وہ اپنے جذبات یعنی قرآن کے خلاف عمل نہیں کر سکتے تھے آخری نبی ﷺ کی ذات کی یہ ایک منفرد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خصوصیت ہے جو اُنہیں کائنات کے ہر دوسرے ذی حیات سے ممتاز کرتی ہے۔

ہم نے اِس باب کے شروع میں دل کے بارے میں جو تین سوال کیے تھے اب ہم اُن میں سے دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں، دل میں جذبات کتنی قسموں کے ہوتے ہیں؟ کیا محبت، نفرت، حسد وغیرہ جذبات اپنی اصلی صورتوں میں دل پر مسلّط ہوتے ہیں؟

اِس کا جواب ہمیں قرآن سے ہی ملتا ہے۔قرآن کے مطابق تمام جذبات بنیادی طور پر پانچ جذبات کے ملاپ سے بنتے ہیں۔ اِس کی وضاحت کے لیے ہم رنگوں کا سہارا لے سکتے ہیں۔ دنیا کا ہر رنگ تین بنیادی (Primary) رنگوں سے مل کر بنتا ہے۔ یہ تین بنیادی رنگ سرخ، زرد اور نیلا ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی بھی اور رنگ بنیادی رنگ نہیں ہوگا بلکہ اُسے ہم ثانوی (Secondary) رنگ کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً سبز رنگ: زرد اور نیلا رنگ ملانے سے وجود میں آتا ہے، اِسی طرح بھورا رنگ: سرخ، سیاہ اور زرد رنگ ملانے سے بنتا ہے۔ رنگ آمیزی میں سب سے دلچسپ سفید رنگ ہے۔ جو تینوں بنیادی رنگوں کو ایک ہی تناسب سے ملا کر بناتے ہیں۔ اِس کو آپ دوسری طرح دیکھیں یا کسی بھی ثانوی رنگ کا تجزیہ کریں تو دو یا تین بنیادی رنگ آپ کے سامنے مختلف تناسب میں نظر آئیں گے۔ رنگ بنانے والی کمپنیاں اب ایسے کمپیوٹر استعمال کرتی ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔ آپ ایسے کمپیوٹر میں کسی رنگ کا کپڑا یا کاغذ رکھیں اور کمپیوٹر سے دریافت کریں کہ اِس میں کون کون سے بنیادی رنگ کس تناسب سے پائے جاتے ہیں تو کمپیوٹر آپ کو چند ہی سیکنڈ میں بنیادی رنگوں کا تناسب بتا دے گا۔ اِسی طرح انسانی جذبات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک بنیادی اور دوسرے ثانوی۔ کوئی بھی جذبہ جو بنیادی نہ ہو کسی دو یا دو سے زیادہ بنیادی جذبوں سے مل کر بنا ہوگا۔

دل کے بارے میں جاننے کے لیے حسبِ ذیل پانچ بنیادی جذبوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

۱۔ خوشی یا لذّت
۲۔ دکھ یا غم
۳۔ خوف
۴۔ اُمید
۵۔ انعام

ہر جذبہ یا احساس ہمارے دل میں جاتے ہی اِن پانچ جذبات میں بٹ جاتا ہے۔ پھر وہ اِس قسم کے دوسرے جذبات کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ مثلاً خوف کو لیجیے۔ ہمارے دل میں سانپ کا خوف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوگا اِس کے علاوہ کسی ناگہانی حادثے کا خوف بھی ہوگا۔ سانپ کا ذکر آتے ہی سانپ کے حوالے سے خوف کے خانے میں پڑی سانپ کے خوف کی فائل کُھل جائے گی وہیں ہمیں اور بھی بہت سی فائلیں ملیں گی جن سب کا موضوع خوف ہوگا۔

ہمارا دل اپنے اندر پانچ خانے رکھتا ہے۔ دل میں داخل ہوتے ہی ہر جذبہ پانچ میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد ثانوی جذبات میں بٹ جاتا ہے۔ پھر وہ فائلیں اُسی جذبے کے خانے یا کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ اُس کے بعد ہم جب بھی اُس چیز کا ذکر کریں گے تو اُس سے متعلقہ خانوں سے وہ فائلیں نکال لی جائیں گی۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ دل میں توازن قائم رکھنے کے لیے اِن خانوں کا سائز ایک سا ہونا چاہیے یا یوں کہیں کہ اِن پانچ بنیادی جذبات کی فائلیں یکساں تعداد میں ہونی چاہئیں۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں انسانی شخصیت کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ مثلاً اگر خوف کی فائلیں زیادہ اور امید کی کم ہوں تو انسان کی شخصیت میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ اِسی طرح اگر غم کا خانہ بڑھ جائے اور لذت کا چھوٹا ہو تو بھی توازن برقرار نہیں رہتا۔ ہم اِس پر مفصل گفتگو اگلے باب میں کریں گے یہاں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری شخصیت میں دل کا کیا کردار ہے یعنی ہم اپنے تیسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔

دل میں موجود جذبات کا انسانی شخصیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

اِس کا جواب ہم شروع کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی اُس حدیث سے کہ انسان کے جسم میں ایک ایسا عضو ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو تو سارا جسم ٹھیک ہوتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور وہ عضو دل ہے۔ ہمیں قرآن میں بھی اس حوالے سے کئی آیات ملتی ہیں۔ مثلاً کافروں کے دلوں پر کفر کی وجہ سے مہر لگ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ یعنی دل کی خرابی انسان کو قوتِ مشاہدہ سے محروم کر دیتی ہے جو انسانی شخصیت کی ترقی کی بنیاد ہے۔ یہی بات ایک دوسری آیت میں یوں کہی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر سینوں کے اندر دل اندھے ہوتے ہیں۔

دل کی اہمیت اِس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ دل کی خرابی انسانی دماغ کے پہلے فعل یعنی مشاہدے کو متاثر کر دیتی ہے جس کے بعد انسان کسی اور قابل نہیں رہتا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مشاہدہ ختم ہونے کی صورت میں انسان تجزیہ اور نتیجہ تک محدود ہو جاتا ہے۔ اِس کی وجہ دل ہی ہوتا ہے۔ دل میں اگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حلقۂ قلب

کوئی جذبہ شدت اختیار کرلے یعنی کوئی خوف، لذت، انعام کی خواہش، امید یا غم حد سے بڑھ جائے تو ہمارا دماغ مکمل طور پر دل کی تحویل میں آجاتا ہے ایسا ہونے کی صورت میں دل دماغ کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اُس کے جذبے کا احترام کرے بلکہ دل کا وہ جذبہ ہی دماغ کو اپنی ترویج اور ترقی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اِس طرح دماغ کا اپنا کردار ختم ہوجاتا ہے اور اُس کا واحد کام دل میں موجزن کسی جذبے کی تکمیل رہ جاتا ہے۔ اِس حالت میں انسان کے مشاہدہ کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے اور وہ نئے نتائج اخذ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ یعنی قرآن کے مطابق دل کو کوئی ایک جذبہ اندھا کر دیتا ہے۔

اِس کے برعکس قرآن میں اللہ کی طرف رجوع کرنے کے لیے قلبِ سلیم کی شرط ہے۔ یعنی وہ مشاہدہ اور تجزیہ جس کی بدولت انسان اللہ کی ذات کے بارے میں صحیح نتائج اخذ کرتا ہے قلبِ سلیم کی بدولت ممکن ہوتے ہیں۔ دل کی تیسری اہمیت عمل سے وابستہ ہے۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰؑ کی دعا مذکور ہے کہ جب انہیں فرعون کو دعوت دینے کا حکم ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے جو دعا مانگی وہ اپنے دل کی وسعت کے لیے تھی یعنی انہوں نے اپنے جذبات کا استحکام طلب کیا کیونکہ کوئی بڑا کام کرنے سے پہلے دل میں جذبات کا مضبوط اور مستحکم ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہی بات اللہ نے اپنے آخری نبی ﷺ کو بھی یاد دلائی ہے کہ دنیا میں اسلام کی دعوت سے پہلے اللہ نے اُن کے دل کو اِس مشکل کام کے لیے قوّت عطا کی تھی۔

اب ہمارے سامنے دل کی اہمیت تین طرح سے واضح ہوتی ہے۔ ایک تو وہ حالت جب انسان کی قوّتِ مشاہدہ سلب ہوجاتی ہے اور وہ صحیح نتائج اخذ نہیں کر پاتا اُسے ہم Dead Model سے تعبیر کرتے ہیں Dead Type اُس وقت واقع ہوتا ہے جب دل پانچ میں سے کسی ایک جذبے سے مغلوب ہوجائے۔ دوسری حالت اِس کے متضاد ہوتی ہے۔ جب انسان صحیح مشاہدہ کرتا ہے، ٹھیک تجزیہ کرتا ہے اور پھر درست فیصلہ کرتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے اُسے قلبِ سلیم درکار ہوتا ہے۔ قلبِ سلیم کے بغیر دماغ کا بھرپور استعمال ممکن ہی نہیں۔ دل کی تیسری حالت وہ ہے جب انسان پر دین کی اشاعت اور تبلیغ کی ذمہ داری ڈال دی جاتی ہے جس کے لیے اُس کے دل کا مضبوط ہونا ضروری ہوتا ہے یعنی پانچوں جذبات کا توازن بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اِس ساری گفتگو سے ظاہر ہے کہ سیکھنے سے لے کر عمل کرنے تک انسانی دل ہر جگہ ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اور یہ پانچ بنیادی جذبات ہی ہیں جن کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حلقۂ قلب

موجودگی دل کوانسانی شخصیت میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

اگلے باب میں ہم اُن پانچ جذبات پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ تاہم دل کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہم قرآن کے دو واقعات نقل کرتے ہیں۔ پہلا واقعہ موسیٰؑ ،فرعون اور جادوگروں کا ہے۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں نشانیاں لے کر پہنچے۔ جو اتنی طاقتور تھیں کہ اِن کا مشاہدہ اور تجزیہ انسان کو بآسانی اِس نتیجہ کی طرف لے جاسکتا ہے کہ اِس ساری کائنات کا رب ایک ہے جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔لیکن فرعون کا دل سخت ہو چکا تھا۔یعنی اُس کے دل کے اندھے پن نے اُس کے مشاہدے کو مفلوج کردیا تھا۔اُس کے نتائج میں اللہ کے حوالہ سے کسی نئے نتیجہ کا اضافہ نہ ہوا سوائے اُس کے دل میں اِس خوف کے کہ اُس کی حکومت کو خطرہ ہے۔ اِس خوف نے اُس کے دماغ کو کوئی چال سوچنے پر اُکسایا اور دماغ نے مشورہ دیا کہ بھرے میدان میں سب لوگوں کے سامنے اگر مصر کے ماہر جادوگر موسیٰؑ کے جادو کا توڑ کردیں تو اُن کا حکومت پر قبضہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو پائے گا۔ لہٰذا دن مقرر ہوا اور بہترین جادوگروں کا ایک پینل حضرت موسیٰؑ کے مدِ مقابل موجود تھا۔ جادوگروں نے اپنے رسے پھینکے جو سانپوں کی طرح رینگنے لگے۔اُن کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا جو اژدھا بن کر اُن کو نگل گیا۔

یہ اللہ کی ایک آیت تھی جس کا مشاہدہ ایک اہم نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کافی تھا۔لیکن ایک دفعہ پھر اِس نتیجہ کو اخذ کرنے میں فرعون کا دل آڑے آیا اور اُس نے انکار کردیا۔ جبکہ جادوگر وہاں قلبِ سلیم لے کر آئے تھے۔اُن آیات کا مشاہدہ اُنہیں اِس نتیجہ کی طرف لے گیا کہ ساری کائنات کا ایک ہی رب ہے جو موسیٰؑ کا رب ہے اور انہیں اُسی کی اطاعت کرنی چاہیئے یوں ایک ہی واقعہ نے ایک فرد کا کفر بڑھادیا اور دوسروں کو اللہ کے قریب کردیا۔ اور دونوں صورتوں کا باعث تھا انسان کا دل۔ دوسرا واقعہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اپنے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ کی صلاحیتوں سے اللہ کو پہچان لینے کے بعد وہ اللہ کے دوست ٹھہرے اور نبی مقرر ہوئے۔لیکن اللہ کی ربوبیت کا ایک مظاہرہ ایسا تھا جس کا مشاہدہ کرنے کی خواہش اُن کے دل میں مچلتی تھی۔ یہ بھی قلبِ سلیم کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ ایسی چیزوں اور نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کی خواہش مسلسل رکھتا ہے جس سے اُس کو حقیقی خوشی ملے اِس لیے قلبِ سلیم رکھنے والا فرد فطرت سے قریب ہوتا ہے۔ چاند، تارے، پھول، پانی اور دوسرے مناظرِ فطرت کا مشاہدہ کرنا اُس کا مشغلہ ہوتا ہے اور قیامت کے روز اللہ کے چہرے کا مشاہدہ کرنے کا شوق اُس کے دل میں ہمیشہ مچلتا رہتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔

اِسی قسم کا مشاہدہ کرنے کی خواہش حضرت ابراہیمؑ کے دل میں بھی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اللہ مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ اُنہوں نے جب اپنی اِس خواہش کا ذکر اللہ سے کیا تو اللہ نے وجہ جانتے ہوئے بھی اُن سے پوچھا ''کیا تمہیں یقین نہیں؟'' اِس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے کہا ''یقین تو ہے لیکن میں اپنے دل کے سکون یا خوشی کے لیے یہ مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں''۔ قرآن میں اُن کا یہ قول نقل کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ مشاہدے کے شوق کی اہمیت ہم پر واضح ہو جائے اور ایسے فطری مشاہدے کا شوق جو انسان کو اللہ سے مزید قریب لے جائے اتنا اہم ہے کہ اللہ نے اُس شوق کا احترام کرتے ہوئے حضرت ابراہیم کو چار پرندے ذبح کر کے اُن کا گوشت مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھنے کے لیے کہا جہاں سے وہ اُڑتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کے پاس چلے آئے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۹. لذت

حضرت بلالؓ سے پوچھا گیا کہ جب کفارِ مکہ اُن کے سینہ پر بھاری پتھر رکھ کرانہیں اذیت دیتے تھے تو انہیں کیسا محسوس ہوتا تھا۔ جواباً حضرت بلالؓ نے کہا کہ انہیں تکلیف نہ ہوتی تھی بلکہ ایک لذت کا احساس ہوتا تھا جسے انہوں نے ''حلاوہ ایمان'' کا نام دیا۔یعنی انہیں ایمان کی لذت محسوس ہوتی تھی۔

لذت انسان کے دل میں موجود ایک بنیادی جذبہ ہے۔انسان کے بیشتر کام اِسی جذبے کی بدولت انجام پاتے ہیں۔نشہ آور دوائیوں کے استعمال سے لے کر نماز تک اور اپنے جسم کو کسی تیز دھار آلے سے اذیت دینے سے لے کر اللہ کا ذکر کرنے تک یہ سب ذرائع ہیں جن کا بنیادی مقصد لذت کا حصول ہے۔آج کل لذت کے حصول کے بے شمار طریقے ہیں اور پچھلے سو سال میں لذت کوشی کے جتنے نئے طریقے دریافت ہوئے ہیں پچھلے دس ہزار سال میں بھی کیا ہوئے ہوں گے۔ بلکہ یوں کہیے کہ لذت حاصل کرنا انسان کا اتنا بڑا مسئلہ کبھی نہیں رہا جتنا آج ہے۔دنیا کا پورا جدید معاشی نظام تقریباً لذت کی بنیاد پر قائم ہے۔لذت کوشی کے جذبے میں صرف ۱۰ فیصد کمی کر دیجیے تو جدید معاشی نظام ریت کا گھروندا ثابت ہوگا۔

چاکلیٹ (Chocolate) کی مثال ہی لے لیں۔ یہ کھانے والے کو ایک خاص لذت مہیا کرتا ہے۔مغربی دنیا کی اکثریت چاکلیٹ کی لذت پر فریفتہ ہے۔جس کے اہتمام کے لیے برازیل میں چاکلیٹ کا بنیادی عنصر کاشت ہوتا ہے کوکا فارمز (Cocoa Farms) سے لے کر سوئٹزر لینڈ اور امریکہ کے چاکلیٹ بنانے والے کارخانوں تک لاکھوں لوگ چاکلیٹ کی صنعت سے وابستہ ہیں۔اِس کی وسعت کا اندازہ اِس بات سے لگائیں کہ سوئٹزر لینڈ کی معیشت کا ایک بڑا حصہ چاکلیٹ کی صنعت پر قائم ہے۔دلچسپ بات یہ کہ امریکہ کی چاکلیٹ بنانے والی کمپنی مارس (Mars) کے مالکان کا شمار دنیا کے ۳۰۰ امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔چاکلیٹ کھانے سے صرف لذت ہی نہیں بلکہ وزن تیزی سے بڑھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے انسان نہ صرف جسمانی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ موٹاپے کی وجہ سے نفسیاتی مسائل میں بھی گھِر جاتا ہے۔اب ایک طرف تو وہ بیماریوں سے نجات کے لیے ادویات خریدتا ہے جس

سے ادویات کی صنعت فروغ پاتی ہے دوسری طرف وزن کم کرنے کے طریقے سیکھنے کے لیے کتابیں خریدتا ہے۔ پھر اُسے خاص خوراک (Diet) کی ضرورت پڑتی ہے اِس کے لیے وہ کسی وزن کم کرنے والے ادارے میں داخل ہوجاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وزن کم کرنے کی ترکیبیں پڑھنے، ادویات کھانے اور ورزش کرنے سے شاید وزن تو کم ہوجاتا ہے لیکن چاکلیٹ کی لذت کم نہیں ہوتی اور یہی وہ خاص بات ہے جو لذت کو دل میں موجود باقی چار جذبات سے ممتاز کرتی ہے۔ لذت صرف لمحۂ موجود میں ہوتی ہے۔ لذت کے حصول سے پہلے صرف لذت کی خواہش ہوتی ہے۔ اور لذت پالینے کے بعد لذت کی یاد رہ جاتی ہے اور وہ یاد ہی انسان میں مزید لذت کی تڑپ پیدا کرتی ہے۔ لذت کا صرف لمحۂ موجود میں ملنا ایک مسئلہ بھی ہے اور رحمت بھی۔ اگر یہ لذت ہمیں لذت کے ذریعہ کے غائب ہوجانے کے بعد بھی ملتی رہے تو شاید ہم اور کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہیں۔ لیکن لذت اپنے پیچھے جو یاد چھوڑ جاتی ہے وہ ہمیں کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔

مثلاً جن لوگوں کو چاکلیٹ کی لذت پسند ہے اُن کے لبوں کو چھوتے ہی اُس میں موجود مخصوص مادے اُن کی زبان میں سرایت کرتے ہیں۔ یہ مادے اُن میں سرور کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور جب تک چاکلیٹ اُن کے منہ میں رہے یہ لذت اُنہیں ملتی رہتی ہے۔ چاکلیٹ کے نگلتے ہی یہ لذت ختم ہوجاتی ہے۔ دوسرا ٹکڑا زبان تک پہنچتے ہی یہ لذت دوبارہ ملنا شروع ہوجاتی ہے اور اُس کے ختم ہونے تک جاری رہتی ہے۔ یوں چاکلیٹ کے ختم ہوتے ہی لذت کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ اِس کے بعد انسان کے پاس صرف دو چیزیں رہ جاتی ہیں ایک تو اُس لذت کی یاد اور دوسرا موٹاپا۔

جنسی لذت دنیا کی چند شدید اور ناقابلِ مزاحمت لذتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اِس لذت کی شدت انسانی بقاء کے لیے انتہائی ضروری ہے اگر یہ لذت مفقود ہوجائے تو انسان جنسی تعلق قائم ہی نہ کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں دنیا کی آبادی کا بڑھنا رُک جائے۔ اور صرف ۴۰ سے ۵۰ سال میں کرۂ ارض پر انسانی نسل معدوم ہوجائے۔ اگر اللہ نے یہ خواہش انسان میں پیدا نہ کی ہوتی اور جنسی تعلق قائم کرنا ایک مذہبی ذمہ داری ہی بنایا ہوتا تو شاید گنتی کے لوگ ہی اِسے ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے اور انسانی آبادی کی بقا اور تسلسل خطرے میں پڑ جاتے۔ اِس لیے اللہ نے جنسی لذت کے حصول کو ایک طاقتور داعیہ میں ڈھال دیا ہے۔ اِس لذت کی خواہش بلوغت کو پہنچتے ہی دنیا کے ہر انسان میں پیدا ہوجاتی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے (بشرطیکہ اسے کوئی جسمانی یا نفسیاتی عارضہ لاحق نہ ہو)۔جنسی لذت کا دورانیہ نہایت ہی قلیل ہوتا ہے اگر حقیقی لذت کے اُن تمام لمحوں کو شمار کیا جائے تو یہ انسان کی پوری زندگی میں چند گھنٹے بھی نہیں بنتے۔لیکن چونکہ یہ لذت شدید ہوتی ہے اس لیے اِس کی یاد بھی بہت آتی ہے۔یاد مزید کی خواہش پیدا کرتی ہے۔اور انسان اِن لمحوں کو پانے کے لیے بیقرار رہتا ہے۔

اِس ساری گفتگو سے بتانا یہ مقصود ہے کہ لذت وہ واحد جذبہ ہے جس کا تعلق حال سے ہے۔ ماضی کی لذت یاد بن جاتی ہے اور مستقبل کی لذت خواہش اب ہم لذت کی اقسام کی طرف آتے ہیں۔جیسا کہ پہلے ذکر ہوا لذت کی بہت سی اقسام ہیں۔اور ان میں سے ہر ایک کو حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں۔مثلاً اگر کسی کو نکوٹین کی لذت کی عادت ہو تو اُسے یہ لذت پوری کرنے کے لیے تمباکو کا دھواں یا رس اپنے جسم میں داخل کرنا پڑے گا۔اب اِس لذت کو حاصل کرنے کے لیے جدید صنعتی دور میں بے شمار ذرائع دستیاب ہیں صرف سگریٹ کو ہی لیجیے درجنوں اقسام کے سگریٹ مارکیٹ میں ملتے ہیں۔فلٹر والا، بغیر فلٹر والا یہاں تک کہ مختلف ذائقوں والے سگریٹ بھی موجود ہیں۔اِسی طرح ہر قسم کی لذت کا احاطہ کرنا بذاتِ خود ایک کتاب کا موضوع ہے۔ہاں یہ ممکن ہے کہ لذت کی اقسام کو بنیادی حصوں میں بانٹ دیا جائے۔اِن اقسام کی قرآنی تصریح تمام لذتوں کی تقسیم کے لیے ایک بنیادی ڈھانچہ مہیا کرتی ہے۔یہ ۴ اقسام درج ذیل ہیں:

۱۔جسمانی لذت	۲۔مادی لذت
۳۔معاشرتی لذت	۴۔روحانی لذت

جسمانی لذتیں جسم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔اِن میں سے دو اہم جسمانی لذتوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔یعنی خوراک اور جنس۔خوراک کی لذت ہمیں منہ سے حاصل ہوتی ہے جبکہ جنس کی لذت کا ذریعہ جنسی اعضا ہیں۔اِن اعضا کی غیر موجودگی میں یا غیر فعال ہونے کی صورت میں یہ لذتیں صرف یاد بن کے رہ جاتی ہیں۔ممکن ہے یاد کے ساتھ خواہش بھی موجود ہو لیکن اِن لذتوں کو حاصل کرنے کے ذرائع ناپید ہونے سے خواہش کی تکمیل ممکن نہیں رہتی۔شراب کا نشہ بھی جسمانی طور پر حاصل ہونے والی لذت ہے۔اِس کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں جسم کی ضرورت پڑتی ہے۔نشہ، خوراک اور جنس تین بنیادی جسمانی لذتیں ہیں۔انسان کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق جسمانی لذت سے آشنا نہیں۔خوراک ہر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لذت

جانور کی ضرورت ہے لیکن اُس میں اُنہیں لذت نہیں ملتی بلکہ وہ اُسے بطور ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ صرف انسان ہی وہ ذی حیات ہے جو خوراک کو صرف لذت کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ لذت اگر قابو سے باہر ہو جائے تو خوراک برائے ضرورت کُل خوراک کا ۱۰ فیصد بھی نہیں رہتی۔ جبکہ خوراک برائے لذت ۹۰ فیصد ہوتی ہے۔ خوراک برائے لذت میں آج کی جنک (Junk) یا گاربیج (Garbage) فوڈ آتی ہے۔ یہ وہ خوراک ہے جس کی ہمیں ضرورت نہیں ہوتی ہم اِسے صرف لذت کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی مارکیٹ یا دوکان پر دیکھ لیجیے وہاں آپ کو خوراک برائے ضرورت کی اشیاء چند ایک نظر آئیں گی جبکہ خوراک برائے لذت کے حوالے سے سب کچھ ہوگا۔ بدقسمتی سے خوراک برائے ضرورت انسانی جسم کو صحت مند بناتی ہے جبکہ خوراک برائے لذت بیماری کو دعوت دیتی ہے۔ اِس کے باوجود ہم چپس، کولڈ ڈرنک اور چیونگم جیسی اشیائے خورد و نوش سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ایک دفعہ بچے بچپن میں خوراک برائے لذت کے عادی ہو جائیں تو وہ تمام عمر اِس لذت کے حصول کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ جہاں تک جنس کا تعلق ہے تو ایک جدید تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ کرۂ ارض پر موجود تمام ذی حیات میں صرف انسان اور ڈولفن ہی جنسی عمل سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ہر جاندار یہ عمل ضرورت کے تحت کرتا ہے یعنی افزائشِ نسل کے لیے، وہ ایسا کرنے کے لیے اللہ کے حکم کا تابع ہے۔ صرف انسان یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ جنس کو جب چاہے اور جیسے چاہے لذت حاصل کرنے کے لیے کام میں لائے۔

اب ہم آتے ہیں مادی لذت کی طرف۔ مادی لذت دراصل نفسیاتی لذت کا نام ہے۔ مادی لذت ہمیں مادی چیزوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اِن میں سرِ فہرست تو دولت اور آسائش کی چیزیں ہیں جنہیں حاصل کر کے ہمیں لذت ملتی ہے۔ انسان جب بھی اپنا بینک بیلنس پوچھتا ہے تو بینک میں پڑی دولت کے بارے میں سُن کر اسے لذت محسوس ہوتی ہے قرآن میں گیارہ مادی لذتوں کا ذکر ہے۔ جو یہ ہیں۔

۱۔ مال	۲۔ نقدی	۳۔ مکان
۴۔ زمین	۵۔ زراعت	۶۔ مویشی
۷۔ سواری	۸۔ لباس	۹۔ پانی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لذت

۱۰۔سونا ۱۱۔جواہرات

اِن میں سے ہمارے لیے کون سی لذت اہم ہے اس کا دارومدار اُس ماحول پر ہے جس میں ہم آنکھ کھولتے ہیں۔مثلاً پاک و ہند کے اکثر لوگوں کے لیے سونا اور جواہرات اپنے اندر شدید لذت رکھتے ہیں۔کیونکہ اِس معاشرے میں دھات کے دور سے لے کر آج تک دھات کی ہی اہمیت چلی آرہی ہے اور دھاتوں میں سونا ہی سب سے اہم ہے۔

پچھلے کچھ سال سے دنیا کی شہری آبادی میں سواری ایک اہم لذت کے طور پر سامنے آئی ہے۔ اِس میں اہم دخل میڈیا پر چلنے والے اشتہارات کا بھی ہے۔انسان کو اگر کوئی چیز میسر نہ ہو لیکن اُس کا ذکر اکثر ہوتا رہے تو جوانی تک پہنچتے پہنچتے اُس کا احساسِ محرومی ایک لذت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔مثلاً اگر بچپن میں کسی فرد کو اچھا لباس نصیب نہ ہو تو جوانی میں اُسے لباس کے حوالے سے احساسِ محرومی ہوگا۔اگر اچھے کپڑوں کی فراوانی ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا احساسِ محرومی یاد کی صورت میں ڈھل جاتا ہے اور یہ یاد اُسے ساری زندگی لباس کی لذت حاصل کرنے کی جستجو میں مصروف رکھتی ہے۔ اِس کیفیت کے پیدا ہونے کی ذمہ داری ماں باپ پر ہوتی ہے۔اگر بچپن میں بچے کو دوسری چیزوں کے ساتھ لباس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کی تربیت دی جائے تو پھر وہ دوسروں کے اچھے لباس اور اپنے معمولی لباس کو یاد نہ کرتا رہے۔بدقسمتی سے آج کے TV دور میں اِس لذت کی خواہش ماں باپ کی گفتگو کے بغیر ہی پیدا ہو جاتی ہے۔اور اِس کے شکار انسان عمر بھر بہتر سے بہتر لباس کی لذت کو پورا کرنے میں کھوئے رہتے ہیں۔

انسان کی اکثر لذتیں اُن یادوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جو بچپن میں جنم لیتی ہیں۔اِن کی تخلیق میں ہمارے بچپن کے ماحول اور ماں باپ کی تربیت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔اگر بچپن میں بچوں کو لذتوں پر قابو پانا نہ سکھایا جائے تو آگے چل کر یہ لذتیں جنون کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

ایک اور لذت وہ ہے جو معاشرے کی وجہ سے جنم لیتی ہے یعنی معاشرتی لذت۔جن معاشرتی لذتوں کا ذکر قرآن میں ملتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔خاندان	۲۔شوہر یا بیوی	۳۔والدین
۴۔اولاد	۵۔دوست	۶۔دشمن
۷۔سماج	۸۔رہنما	۹۔قبیلہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۰۔رتبہ ۱۱۔جنسِ مخالف

یہ تمام لذتیں اپنا وجود اُن لوگوں کی وجہ سے رکھتی ہیں جن کے درمیان ہم رہتے ہیں۔ہمیں اپنے ماں باپ کو خوش کر کے لذت ملتی ہے اپنی اولاد کی خوشی اور کامیابی سے حاصل ہونے والی لذت کا شمار تو چند ایک طاقت ور ترین لذتوں میں ہوتا ہے۔ہم یہاں اِس لذت کا ذکر جنسی لذت کے حوالے سے کرتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں لذتوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔جنسی لذت کی بدولت ایک ننھا سا بے سہارا انسان عدم سے وجود میں آتا ہے۔ یہ بچہ نہ تو خود کھا پی سکتا ہے اور نہ ہی اپنا اچھا بُرا سمجھتا ہے۔ بلکہ یہ نوزائیدہ انسانی بچہ تو اپنا اچھا بُرا سمجھنے میں بندر کے بچے سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اس تحقیق کے بعد سامنے آئی کہ جب ماہرین نے ایک بندر اور ایک انسان کے بچے کو سانپ اور آگ کے سامنے بٹھایا حیرت انگیز طور پر بندر کا بچہ سانپ اور آگ دونوں کو دیکھ کر ڈرا اور پیچھے ہٹ گیا۔جبکہ انسان کا بچہ بے خوفی کے ساتھ ان دونوں چیزوں کی طرف لپکا۔ اِس تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کے علاوہ تمام جانوروں میں خوف پیدائشی طور پر ودیعت کیے ہیں۔یعنی جن چیزوں سے ڈرنا کسی جانور کی بقاء کے لیے ضروری ہے وہ اِن چیزوں کا خوف پیدائشی طور پر اپنے اندر رکھتا ہے۔لیکن انسان کے ساتھ ایسا نہیں انسان کے اندر خوف اس کے ماحول میں موجود لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے ماں باپ بچے کو بچاتے ہیں اور اُس کی ہر آسائش کا خیال رکھتے ہیں۔ ماں باپ کا بچے کی زندگی میں یہ کلیدی کردار نہ ہوتا اگر اُن کے اندر اولاد کی لذت نہ ہوتی۔ فقط جنسی لذت ہونے کی صورت میں انسان طبعی طور پر تو بچہ پیدا کرنے کے قابل ہوتا لیکن وہ نفسیاتی اور جذباتی طور پر اولاد کا خیال نہ کر پاتا۔اللہ نے ایک بے سہارا انسان کو دنیا میں لانے کے بعد اُس کے والدین کے دل میں اُس کو پھلتا پھولتا دیکھنے کی لذت پیدا کر دی۔ یہ وہ لذت ہے جس کا ذکر قرآن میں انسان پر اللہ کی رحمت اور مہربانی کے طور پر کیا گیا ہے۔اور اللہ نے انسان کو یاد دلایا ہے کہ اگر وہ اُس کے ماں باپ کے دل میں اُس کی بھلائی کی لذت نہ ڈالتا تو وہ بے سہارا مر جاتا۔

اِس لذت کے حوالے سے ایک دلچسپ حقیقت ماہرین نے دریافت کی ہے۔ پیدائش کے وقت ماں کے دل سے ایک خاص مادہ خارج ہوتا ہے اور ماں کے دل میں بچے کا خیال کرنے کی لذت اس مادے کے اخراج سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ ہر مادّہ میں اُس وقت راسخ ہوتا ہے جب وہ بچے کو جنم دیتی ہے۔اِس مادے کی غیر موجودگی میں کسی ماں کے دل میں اپنے بچے کے لیے کیا جذبات پائے جاتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لذت

ہیں یہ جاننے کے لیے ماہرین نے ایک مادہ بندر کے دماغ میں اُس عمل کو عین اُس وقت روک دیا جب وہ بچے کو پیدا کرنے والی تھی۔ بندریا نے بچہ تو پیدا کر دیا لیکن اُس مادے کو دماغ تک لے جانے والی نالی بند تھی اِس لیے اُس کے دماغ میں یہ مادہ داخل نہ ہوسکا۔ حیرت انگیز طور پر بندریا اپنے بچے کی محبت سے قطعی طور پر عاری تھی۔ اُس کا بچہ ایک کونے میں بلکتا رہا اور وہ اُس سے بے پروا دوسرے کونے میں بیٹھی رہی اُس نے ایک بار بھی بچے کو گود میں نہ لیا اُس کے نزدیک اُس بچے کی حیثیت گوشت کے ایک لوتھڑے سے زیادہ نہیں تھی۔ ذرا غور کیجیے انسان ذاتی غرض کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کی عبادت بھی جنت کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ کم ہی لوگ ایسے ہیں کہ جو کوئی کام کسی معاوضے کے بغیر کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن اولاد کی پرورش ہر شخص کسی غرض کے بغیر کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس بچے کے بڑے ہونے تک شاید وہ زندہ بھی نہ رہے پھر بھی اُسے اپنے بچے کی پرورش میں وہ لذت ملتی ہے کہ وہ اِس کے حصول کے لیے اپنے بچے کی پرورش پر مجبور ہوتا ہے۔

ایک آدمی کی ۱۵ سالہ بیٹی گردوں کے عارضے میں مبتلا ہوگئی اُسے ایک گردے کی شدید ضرورت تھی۔ اُس کے باپ نے اپنا ایک گردہ اپنی بیٹی کو دینے کا فیصلہ کیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُسے اپنی بیٹی سے آگے چل کر کچھ فائدہ نہیں مل سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ اُس لڑکی کی شادی کسی دوسرے شہر میں ہوجائے اور وہ اُسے چند سال بعد بھی نہ مل سکے پھر بھی وہ اپنی بیٹی کو صحتمند دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اُس نے اپنی بیٹی کو اپنا گردہ عطیہ کر دیا۔ دونوں کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ پہلے باپ کا گردہ نکالا گیا۔ پھر وہ گردہ اُس کی بیٹی میں منتقل ہوا۔ دونوں کچھ گھنٹوں بعد ہوش میں آئے۔ دونوں کے بستر ہسپتال میں برابر ہی رکھے تھے۔ باپ نے ہوش میں آکر فوراً اپنی بیٹی پر نظر ڈالی بیٹی نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور مسکرائی۔ باپ نے بیٹی کو مسکراتے دیکھا تو بولا۔ ’’اِس مسکراہٹ نے میرا دل خوشی سے بھر دیا ہے۔‘‘

انسان کو اللہ نے کمزور، بے صبرا اور خود غرض پیدا کیا ہے۔ پھر اُس میں جسمانی قوت بھی دوسری مخلوق سے کم ہے نہ تو یہ ہاتھی جیسا طاقتور ہے اور نہ ہی یہ چیتے کی طرح تیز ہے۔ پھر بھی بچے جننے والی تمام مخلوقات میں سے سب سے زیادہ عرصہ انسان کو اپنی اولاد کی پرورش کرنی پڑتی ہے اور یہ سب وہ صرف اُس لذت کی خاطر کرتا ہے کہ جو اُسے اپنی اولاد کی صحت، مسکراہٹ، شادی، ترقی وغیرہ کی صورت میں ملتی ہے انسان جیسی خود غرض مخلوق کا کسی دوسرے انسان کی پرورش محض لذت کی خاطر کرنا ایک انہونی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لذت

سی بات ہے۔اتنی انہونی کہ صرف اِس فطری لذت کا مشاہدہ جس کے زیرِ اثر انسان یہ سب کچھ کرتا ہے اللہ کی قدرتِ کاملہ کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے۔لذتوں کی کچھ خاص اقسام ہیں جو فرد اور معاشرہ دونوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔معلومات

۲۔ماضی

۳۔نظریہ

اِن تین لذتوں کا ذکر فرد اور معاشرہ میں سے کسی ایک قسم میں ہوگا اور اس کا انحصار انسان کی ذات پر ہوتا ہے۔ایک انسان کو معلومات جمع کرنے میں لذت ملتی ہے۔وہ گھنٹوں TV کے سامنے بیٹھا معلومات جمع کرتا رہتا ہے۔وہ بہت سی کتابیں، رسالے بھی پڑھتا ہے۔سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اُسے اس سے کس قسم کی لذت ملتی ہے؟ اِس کا جواب ہمیں اُن معلومات کا تجزیہ کرکے ملے گا جو اُس فرد کے پاس ہیں اگر اُس کی معلومات انفرادی نوعیت کی ہیں تو اُن کی لذت مادی لذتوں کے زمرے میں جائے گی اور اگر یہ معلومات دوسرے انسانوں کو متاثر کرنے کے لیے ہیں تو یہ معاشرتی لذتوں میں شمار ہوگی۔مثلاً آج کے دور میں سٹاک مارکیٹ پر حصص کی معلومات جمع کرنا ایک لذت ہے۔انسان یہ معلومات جمع کرکے اگر پیسہ کمانے کی کوشش کرے تو اِن معلومات کا تعلق انفرادی مادی لذتوں سے ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ اُس فرد سے یہ معلومات حاصل کریں اور اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔دوسری طرف آپ دیکھیں کہ وہ اِن معلومات سے خود کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھا رہا بلکہ دوسرے لوگ اُس کی معلومات سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں جبکہ وہ اِن معلومات کو لوگوں کے سامنے پیش کرکے لذت محسوس کرتا ہے تو اِن معلومات کو جمع کرنے کی لذت درحقیقت معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی خاطر ہے۔یا کسی ایسے احساسِ محرومی سے نجات پانے کے لیے جو انسان میں بچپن سے پایا جاتا ہو۔مثلاً اُس کے سامنے کسی بچے کی معلومات کی تعریف کی گئی تھی۔یا اُس سے کسی ملک کا دارالخلافہ پوچھا گیا تھا اور نہ بتا سکنے پر یا تو مذاق اُڑایا گیا یا ڈانٹا گیا۔تب سے اُس انسان کو مختلف ممالک کے بارے میں معلومات جمع کرنے میں لذت ملنا شروع ہوگئی اِس طرح احساسِ محرومی میں وقتی طور پر کمی واقع ہونے لگی۔

اِس بات سے ہم ایک دلچسپ حقیقت کی طرف آتے ہیں۔بعض لذتیں بالواسطہ ہوتی ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لذت

یعنی وہ کسی اور لذت کے حصول کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔ مثلاً روپیہ پیسہ جمع کرنے کی لذت کو لیجیے۔ ایک شخص کو اپنی اولاد سے بہت محبت ہے اُس کی یہ محبت اِس لیے شدید ہے کہ اس کے اپنے ماں باپ نے اُسے بچپن میں محبت نہ دی تھی اُس کے اندر احساسِ محرومی تھا اُس نے اِس کی وجہ مالی بدحالی کو قرار دیا۔ اُس کا خیال ہے کہ اگر اُس کے والدین کے پاس پیسہ ہوتا تو وہ اُسے بہت سی چیزیں دلا دیتے اور زبانی پیار پر نہ ٹرخاتے۔ اب اُسے اپنی اولاد سے شدید محبت ہے وہ اپنی اولاد کو خوش کر کے بہت لذت محسوس کرتا ہے۔ اُسے اپنے ماں باپ کی فکر ہے نہ بیوی کی، کپڑے کا شوق ہے نہ گاڑی کا۔ اُسے صرف اپنی اولاد کو خوشی دے کر لذت ملتی ہے۔ اُسے احساس ہوتا ہے کہ پیسے کے بغیر بچوں کو خوشی نہیں دی جا سکتی۔ اس غلط نتیجہ پر پہنچتے ہی وہ نہایت جانفشانی سے پیسہ کمانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ صبح میں نوکری کرتا ہے اور شام کو اپنا کاروبار شروع کر دیتا ہے۔ اِس طرح حاصل ہونے والی آمدنی میں اُس کے لیے کوئی لذت نہیں سوائے اِس کے کہ اس آمدنی سے وہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھ سکتا ہے۔ بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ یہ آدمی شب و روز کی محنت پیسے کی محبت میں کر رہا ہے لیکن درحقیقت اصل لذت اولاد ہوگی اور پیسہ اُس لذت کو حاصل کرنے کا ذریعہ۔ جب وہ اپنی دولت کے بل پر اپنے بچوں کو مہنگے کپڑے خرید کر دے گا تو اُسے لذت محسوس ہوگی۔ لیکن یہ صورتِ حال تبدیل بھی ہو سکتی ہے۔ ۲۰ سال تک اگر یہ شخص دن رات دولت کمانے میں لگا رہے تو اُس کے لیے اولاد کی لذت کم ہو سکتی ہے اور اب واقعی اُس کے اندر دولت کی لذت پیدا ہو جائے گی۔ اتنے سالوں میں رفتہ رفتہ اولاد کی لذت کم ہوگی اور دولت کی لذت اُسی تناسب سے بڑھتی جائے گی۔ تبدیلی کا یہ عمل اتنا آہستہ ہوگا کہ انسان کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ وہ اولاد جس کے لیے وہ دولت کمانے چلا تھا اپنے باپ سے بات کرنے کو ترسے گی۔ باپ ویسے ہی رات کو دیر سے گھر آئے گا۔ پھر گھر آنے پر وہ اتنا تھکا ہوا ہوگا کہ اپنے بچوں سے بات چیت بھی نہیں کر پائے گا حالانکہ اُن کے لیے دولت کمانا اُس کا نصب العین تھا۔ ویسے بھی انسان جہاں لذت محسوس نہیں کرتا وہاں اُس کا دل نہیں ہوتا، جہاں اُس کا دل نہیں ہوتا وہاں اُس کا دماغ بھی نہیں ہو سکتا اور جہاں انسان کے دل و دماغ نہ ہوں وہاں اُس کا جسم تو ہوتا ہے اُس کی ذات نہیں ہوتی۔

کسی چیز کے حوالے سے لذت پیدا کرنے کے لیے وہاں کافی عرصہ رہنا پڑتا ہے۔ تاکہ پہلی لذت کم ہو اور نئی لذت پیدا ہو جائے۔ یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ ہم اِس کا تفصیلی تجزیہ کریں گے۔ امریکہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لذت

اور پاکستان کی جیلوں میں قیدیوں کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ قیدی جو جیل کے اندر رہ کر اپنا ماحول مذہبی بنا لیتے ہیں اُن کے اندر روحانی لذت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ رہا ہونے پر کبھی قانون شکنی نہیں کرتے۔ اِس کے برعکس وہ قیدی جو جیل میں عادی مجرموں کے ساتھ رہتے ہیں سزا بھگتنے کے باوجود جرم میں لذت محسوس کرتے ہیں اور جیل سے رہا ہوتے ہی دوبارہ جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اِس طرح جیل میں اُن کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ امریکہ کی جیلوں میں قیدی تیزی سے مسلمان ہو رہے ہیں۔ جیل میں ہی نماز پڑھنا سیکھتے ہیں، قرآن کا ترجمہ انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ وہاں مسلمان قیدیوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے لیکن وہ ایک ماحول بنا کر رکھتے ہیں۔ اِس ماحول کی وجہ سے گناہ کی لذت اُن کے دل سے ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایمان کی لذت کے دلدادہ ہو جاتے ہیں ایمان کی لذت اُنہیں جرم سے دور رکھتی ہے اور امریکی جیلوں کے شماریات ظاہر کرتے ہیں کہ جیل میں مسلمان ہونے والے قیدیوں میں سے کوئی بھی واپس جیل نہیں آیا۔ یہی صورتِ حال ہمیں پاکستان کی جیلوں میں نظر آتی ہے۔ پاکستانی جیلوں میں یوں تو مسجد بھی ہوتی ہے اور درسِ قرآن بھی ہوتا ہے۔ لیکن قیدیوں کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ مسجد کے ماحول میں رہنا چاہتے ہیں یا مجرموں کے ماحول میں۔ جیل ایک عجیب جگہ ہے جہاں آ کر یا تو جُرم کی لذت بڑھ جاتی ہے یا پھر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اِس کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ جیل میں یا تو مسجد کا ماحول ہوتا ہے یا پھر مسجد سے باہر مجرموں کا۔ درمیان کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جیل جانے کے کچھ ہی دنوں بعد قیدی ان دونوں میں سے ایک ماحول قبول کر لیتا ہے اور پھر اُس کی لذتوں میں ماحول کے مطابق تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ ہم نے ایسے بہت سے قیدیوں کے انٹرویو کیے جن کے اندر روحانی لذت پیدا ہو چکی تھی۔ ہمارے تجزیہ کے مطابق ان لوگوں میں زیادہ تبدیلی دو وجوہات سے آئی اول تو مسجد کے ماحول سے وابستہ ہونے کی وجہ سے، دوئم قرآن کا مطالعہ کرنے کی بدولت۔ اِن دو ذرائع سے انسان کے اندر ایمان کی جو لذت پیدا ہوتی ہے وہ انسان کو یکسر تبدیل کر دیتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایمان کی لذت کیا ہے؟ دوسری تمام لذتوں کے مقابلے میں اس ایک لذت کا بیان کرنا سب سے مشکل ہے۔ ہم اِس لذت کو مزید دو قسموں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک اسلامی اور دوسری غیر اسلامی۔ اسلام میں روحانی لذت کی تفصیلات تو آگے آئیں گی۔ یہاں ہم غیر اسلامی طریقے سے حاصل ہونے والی روحانی لذت کا ذکر کرتے ہیں۔ غیر اسلامی طور پر حاصل ہونے والی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لذت

لذتوں کو بھی مزید دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اِن میں سے ایک تو وہ لذتیں ہیں جو کسی نہ کسی مذہبی تجربہ کے زیر اثر آتی ہیں اور دوسری وہ لذتیں ہیں جو مذہب سے تعلق نہیں رکھتیں اور جدید مغربی نفسیاتی تحقیق کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں۔ غیر اسلامی مگر مذہبی طریقے سے حاصل ہونے والی روحانی لذتوں میں قابلِ ذکر عیسائی، ہندو اور بدھ مت کے طریقہ کار ہیں۔ عیسائی، ہندو اور بدھ مت تینوں طریقوں میں روحانی لذت دنیاوی لذتوں کو ترک کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تینوں مذاہب انسان کو دنیاوی لذتوں اور تکلیفوں سے جدا کر کے ایک نئی لذت سے روشناس کراتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لذت کیا ہوتی ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ دنیاوی لذتوں کی وجہ سے انسان کے ساتھ کیا ہوتا ہے جنہیں ترک کرنے سے انسان ایک نئی قسم کی لذت محسوس کرتا ہے۔ اِس سوال کے جواب کے لیے ہم چلتے ہیں واپس دماغ کی طرف۔ ہم جانتے ہیں کہ دماغ تین طریقوں سے کام کرتا ہے۔ سب سے بہتر تو Tree Type ہوتی ہے۔ دوسری قسم Bush Type کی ہوتی ہے جو بہت سے سماجی اور معاشی مسئلوں میں بٹی ہوتی ہے اور تیسری قسم Dead Type کی ہوتی ہے Bush Type اپنے ماحول، معاشرہ اور دیگر معاشی مسائل کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ اِسی لیے Bush Type اور Dead Type شدید ذہنی بحران کا شکار ہوتے ہیں۔ اُن کی راتوں کی نیند اُڑ چکی ہوتی ہے وہ غصہ اور غم کی ملی جلی کیفیات میں رہتے ہیں۔ ہیجان اور نفرت میں جکڑے ہوئے ایک راہ گم کردہ راہی کی طرح جو شدید پیاس سے بے تاب ہو اور ہر سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو چکا ہو۔ یہ تینوں مذاہب ایسے انسان کو دنیاوی کشمکش سے نکال کر مراقبہ کی دعوت دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے انسان اپنی پریشانیوں، دنیاوی لذتوں اور غموں سے آشنا ہوتا ہے۔ اپنی کمزوریوں سے آشنائی آدھا مسئلہ ختم کر دیتی ہے۔ تھوڑے دنوں کی توجہ اور دنیا سے دوری شخصیت کو سمیٹنے لگتی ہے اور انسان لذتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے انسان خود کو ہلکا محسوس کرتا ہے گویا بہت بھاری بوجھ اُس کے کاندھوں سے اُتر جاتا ہے۔ اُسے ایک سکون محسوس ہوتا ہے۔ اِسی سکون کو مذہبی یا روحانی لذت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جدید مغربی نفسیاتی علاج بھی انسان کے تمام مسئلوں پر بیک وقت غور کے بجائے فرداً فرداً سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر فرق ہے تو ماحول اور طریقہ کار کا۔ مذہبی یا روحانی تجربہ ایک مذہبی رنگ میں ہوتا ہے۔ اِس

لذت

کے لیے عام طور پر ایک مذہبی عمارت میں جانا پڑتا ہے یا پھر آبادی سے دور جا کر یہ تجربہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائی روحانی لذت کے لیے گرجے کا رخ کرتے ہیں جبکہ بُدھ مت کے پیروکار آبادی سے دور چلے جاتے ہیں اس کے علاوہ ماحول کو مذہبی رنگ دینے کے لیے خوشبو اور لباس کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ روحانی لذت کے بعض ماہرین رنگ کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جس ماحول میں انسان روحانی لذت حاصل کرنا چاہتا ہے اُس کا رنگ اُن کی ہدایت کے مطابق ہو تو روحانی لذت جلد حاصل ہو جاتی ہے۔

جدید نفسیاتی طریقہ کار اِن بندشوں سے آزاد ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے نزدیک دماغی سکون کی لذت حاصل کرنے کے لیے نہ تو کسی مذہبی عمارت کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی خاص قسم کے لباس کی ۔ اگر ضرورت ہے تو قوتِ ارادی کی۔ آپ جس قدر اپنی سوچ کو ایک جگہ مرکوز کر سکیں اِسی قدر خود کو پریشانیوں سے آزاد رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ جدید نفسیاتی طریقہ کار اور غیر اسلامی روحانی تجربوں میں کیا فرق ہے اور یہ دونوں اسلام سے کس طرح مختلف ہیں؟ جدید نفسیاتی اور غیر اسلامی لیکن مذہبی روحانی واردات کا ذکر تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ جدید نفسیاتی طریقے انسان کو ہر عقیدے، رسم اور ماحول سے آزاد رکھتے ہیں۔ جبکہ مذہبی تجربے کے لیے ان تینوں کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کو پہلے تو کسی عقیدے پر ایمان لانا ہو گا۔ ایک خاص طریقے یا نصاب کی پیروی کرنا ہو گی پھر ایک خاص ماحول کا حصہ بننا ہو گا۔

لیکن یہ دونوں طریقے انسان کو دنیاوی پریشانیوں اور لذتوں سے کنارہ کش کروانا چاہتے ہیں اور بس۔ اور اِن میں یہ قدرِ مشترک انہیں اسلام کے روحانی طریقہ کار سے جدا کرتی ہے۔ اسلام انسان کو دنیاوی لذتوں سے محروم نہیں کرنا چاہتا بلکہ اُن کو اعتدال پر لانا چاہتا ہے۔ اسلام کا روحانی تجربہ دنیاوی مشکلات پر قابو پانے کا نام ہے نہ کہ اُن سے فرار کا، اسلام روحانی لذت کو پانے کے لیے دنیاوی لذتیں ترک کرنے کا حکم نہیں دیتا۔

دوسرا بڑا فرق نظریۂ توحید کا ہے۔ اسلام کا روحانی تجربہ اللہ کی قربت سے منسوب ہے۔ روحانی لذت پانے کے لیے ترکِ دنیا کرنا ضروری نہیں بلکہ اللہ کا قُربِ ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک فرد اپنے خاندان اور رشتے داری کو منقطع کر کے جنگل میں جا بسے اور دنیاوی لذّتوں سے آزاد ہو۔ لیکن اُسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خدا نہ ملے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک آدمی اپنی حلال کمائی میں سے اپنے اُوپر بھی خرچ کرے اُس کی دو بیویاں ہوں جن کے ساتھ وہ خوش وخرم اپنے خوبصورت گھر میں رہے اور اللہ سے قربت کے نتیجہ میں اُسے روحانی لذت بھی نصیب ہو رہی ہو۔

رمضان کا روحانی تجربہ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ رمضان میں مسلمان بہت سی چیزوں سے اجتناب برتتے ہیں۔ بہت سی دنیاوی لذتوں کو وہ اِس مہینے میں ایک خاص وقت تک کے لیے ترک کیے رکھتے ہیں۔ اِس سے انہیں وقتی طور پر ایک روحانی لذت ضرور نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہ روحانی لذت مستقل نہیں ہوتی کیونکہ وہ رمضان میں فقط دنیاوی لذتوں سے دور ہوتے ہیں۔ اور اللہ سے قریب نہیں ہو پاتے۔ وہ دماغ کی فائلوں اور دل کے جذبات کو اللہ کی منشاء کے مطابق دوبارہ تخلیق نہیں کر پاتے جس کی وجہ سے رمضان کے ختم ہوتے ہی اُن کی روحانی لذت بھی مفقود ہو جاتی ہے۔

لیکن کیا وجہ ہے کہ اکثر اوقات انسان لاکھ کوشش کے باوجود کوئی بھی لذت حاصل نہیں کر پاتا؟ اُسے کسی زمانے میں چاکلیٹ بہت اچھی لگتی تھی لیکن آج اُسے اس میں کوئی ذائقہ محسوس نہیں ہوتا۔ اُسے اچھے کپڑے پہننا اچھا لگتا تھا۔ آج نہیں لگتا۔ یہاں تک کہ وہ روحانی لذت کو حاصل کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر یہاں بھی اُسے ناکامی ہوتی ہے اُسے لذت کی خواہش تو ہوتی ہے۔ اُس کے پاس ماضی میں حاصل کی گئی لذتوں کی خوبصورت یادیں تو ہوتی ہیں لیکن آج اُسے لذت کے حصول پر بھی لذت نہیں ملتی۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی وجہ جاننے کے لیے ہمیں دل میں موجود ایک بنیادی جذبے کا تجزیہ کرنا پڑے گا اور وہ ہے غم۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۰. غم

حضرت سلیمانؑ سے زیادہ طاقتور بادشاہ کرۂ ارض پر نہیں گزرا۔ بادشاہ کی طاقت کا اندازہ اُس کی فوج اور اسلحہ کے انبار سے لگتا ہے۔ ٹینک، میزائیل، بحری اور ہوائی جہازوں کے بیڑے، پیدل فوج یہ سب اور اِس کے علاوہ اور بہت کچھ ایک اچھی فوج کا حصہ ہوتے ہیں اور انہی سے ایک بادشاہ دنیا میں اپنی عظمت کا لوہا منواتا ہے۔ تاہم انسانی جنگ میں ابھی تک وہ ترقی نہیں ہوئی کہ لڑائی میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت انسان کے علاوہ کسی اور کے پاس آجائے۔ بلکہ میدانی جنگ میں تو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی انسانوں کی فوج ہی فیصلہ کن قوت ہوتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی قوّت انسانوں کی طاقت سے کہیں بڑھ کر تھی۔ کرۂ ارض کے تمام جن اُن کے غلام تھے۔ ایک ایک جن اکیلا ہزاروں انسانوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے پہاڑوں کو اکھاڑ پھینکنا ان جنوں کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کے پاس اُس سے بھی بڑی ایک طاقت تھی اور وہ تھی ہوا۔ یہ کوئی عام ہوا نہ تھی یہ تھے Tornado اور Cyclone (یا Hurricane)۔

ایک Tornado کی قوت کا اندازہ لگانا محال ہے۔ یہ زمین سے لے کر آسمان تک پھیلا ہوتا ہے۔ Cyclone یا Hurricane کے برعکس کہ جو پانی پر رہتے ہیں یہ زمین پر ہی پیدا ہوتا ہے اور زمین پر ہی دم توڑ دیتا ہے۔ اگر ایک جن کی قوت ایک ہزار انسانوں کے برابر ہے تو ایک Tornado کی قوت ایک ہزار جنوں کے برابر ہے۔ بڑے بڑے گھر، گاڑیاں، پتھر ایسے نگل جاتا ہے جیسے ویل مچھلی ایک سوئی کو کھا جائے۔ جس جگہ سے ایک Tornado گزر جائے وہاں مجال نہیں کہ ایک بھی درخت، گھر یا کھیت سلامت بچے۔ اور اب آیئے Cyclone کی طرف جو شمالی امریکہ میں Hurricane کے نام سے جانا جاتا ہے۔ Cyclone سمندر میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے بعد اللہ کی مرضی کہ اسے سمندر ہی میں ختم کر دے یا خشکی پر چڑھ دوڑنے کا حکم دے دے۔ Hurricane میں تیز ہواؤں کے ساتھ بارش بھی ہوتی ہے۔ بادو باراں، بجلی اور بادل کئی سو میل کے وسیع دائرے میں گول گول گھومتے ہیں۔ ہوا کا تو کیا ذکر Hurricane میں تو بارش کے قطرے ہی اتنے زور سے زمین کا رُخ کرتے ہیں کہ انسانی جلد اُن کی شدت کو برداشت نہیں کر پاتی۔ حضرت سلیمانؑ وہ واحد بادشاہ تھے جن کے تسلّط میں یہ تینوں قوتیں تھیں۔ جنات، Tornado، Cyclone اُن کی فوج کے ادنیٰ ملازم تھے۔ وہ اپنی اِس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غم

فوج سے اسلام کی سربلندی کا کام لیا کرتے جب کفر اور طاغوت کے خلاف جنگ ختم ہوجاتی تو یہ فوج زمین پر بھلائی کے کام کرتی۔ ایک دن حضرت سلیمانؑ اپنی فوج کے ساتھ محل سے نکلے اور نہایت تیزی سے ایک محاذ کا رُخ کیا۔ اُن کا تخت فضا میں اُڑا جا رہا تھا اُن کے ایک طرف جنات کی فوج تا حدِ نگاہ رواں دواں تھی۔ دوسری طرف Tornado اور Cyclone آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اتنے میں آپ کو زمین پر چیونٹیوں کی ملکہ کی آواز سنائی دی۔ چیونٹیوں کی ملکہ اپنی قوم کو ہدایت کر رہی تھی کہ جلدی سے بلوں میں چلی جاؤ ورنہ آج سلیمانؑ کا لشکر نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں فنا کر دے گا۔ حضرت سلیمانؑ نے یہ سنا تو انہیں اپنی قوت اور رتبہ کا احساس ہوا۔ یکا یک انہیں محسوس ہوا کہ وہ واقعی دنیا کے طاقتور ترین انسان ہیں، بلکہ وہ انسانی تاریخ کے سب سے عظیم بادشاہ ہیں۔ رتبہ بڑی لذت ہے۔ ایک دفعہ انسان کو رتبہ کی لذت کا احساس ہوجائے تو اُس کے بعد ہر لذت ہیچ نظر آتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے جب یہ سُنا تو انہیں بھی اپنی طاقت کی لذت کا احساس ہوا۔ وہ لمحہ جس میں ہمیں لذت کا احساس ہو بہت ہی خاص ہوتا ہے اُس وقت ہمارے دل و دماغ میں یا تو اُس لذت کے حوالہ سے نئی فائل بنتی ہے۔ یا پھر پہلے سے موجود فائل میں اضافہ ہوتا ہے۔

اُس حساس وقت میں لذت ہمارے دل و دماغ کو دو طرح سے متاثر کر سکتی ہے۔ یا تو شکر کے ساتھ یا پھر ناشکری کے ساتھ۔ اگر ہم اِس کو ایک خاکہ کی مدد سے پیش کریں تو کچھ یوں ہوگا۔

لذت ۔۔۔۔شکر۔۔۔۔فائل میں درج

لذت۔۔۔۔ناشکری۔۔۔۔فائل میں درج

کوئی بھی لذت اگر ہماری یادداشت کا حصہ بنے اور اُس میں شکر شامل نہ ہو تو وہ دو میں سے کسی ایک یا دونوں کو جنم دیتی ہے اور وہ دو جذبات ہیں خوف اور غم۔

ہم خوف پر آگے بات کریں گے۔ یہاں ہم ذکر کرتے ہیں غم کا جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان لذت حاصل کرنے کے بعد شکر نہیں کرتا۔ انسانی شخصیت کی باتیں روزمرہ کی مثالوں سے بخوبی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ہم نے لذت کے باب میں اُس آدمی کا ذکر کیا تھا جس نے اپنی بیٹی کو اپنا گردہ عطیہ کیا اور وہ صحت یاب ہوگئی۔ ہوش آنے پر جب لڑکی نے مسکرا کے دیکھا تو باپ کو بے پناہ لذت محسوس ہوئی۔ اب اگر یہ لذت اللہ کے شکر کے ساتھ باپ کی یادداشت کا حصہ نہ تھی تو خوف جنم لے گا یا غم۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غم

اللہ کا شکر لذت کو غم پیدا کرنے سے روکتا ہے۔ یہ ایک عجیب عمل ہے جو انسانی شخصیت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لذت کے ملتے ہی انسان خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہ لذت اُسے اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ اُسے یہ خیال نہیں رہتا کہ اللہ ہی نے اُسے عقل دی، مواقع دیے، اسباب پیدا کیے، یہاں تک کہ اُس کام کو کرنے کی ہمت دی جس کے بعد وہ لذت پیدا ہوسکی۔ جب وہ اللہ کو اپنی لذت کے پیچھے کارفرما نہیں سمجھتا تو وہ اس کا شکر کیوں ادا کرے۔ اگر بیٹی کو مسکراتا دیکھ کر باپ کے دماغ میں یہ نہ آئے کہ اللہ نے اُس کو آپریشن کے وسائل دیے۔ اُس کے دل میں بیٹی کی محبت ڈالی۔ اُس کو صحت مند بنایا اُس کو ایسا کرنے کا خیال دیا پھر اُس کو ہمت دی کہ وہ یہ مشکل کام کر سکے تو یہ سارا واقعہ اُس کے دل و دماغ میں ایک غم کے ساتھ محفوظ ہوگا۔ جب بھی اُسے اپنی بیٹی کی مسکراہٹ یاد آئے گی تو اُس کے ساتھ حسرت اور غم بھی ملیں گے۔

جذبۂ شکر کے بغیر لذت کے ساتھ جمع ہونے کو بہت سے غم ہو سکتے ہیں۔ یہ شیطان کے لیے ایک سنہری موقع ہوتا ہے وہ لذت کے ساتھ غم کو ضرور شامل کر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ آدمی کوشش تو لذت حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے لیکن لذت کا لمحہ گزرنے کے بعد اُس لذت کی یاد میں صرف غم ملتا ہے پھر انسان جتنی بھی لذت حاصل کرلے جو چیز باقی رہ جائے گی وہ لذت کی یاد ہے جو غم پیدا کرتی ہے۔

شکر کے احساس سے عاری کسی فرد کو گرمی کی چھٹیاں گزارنے کا موقع کسی بہت ہی خوبصورت جگہ پر ملے تو اُس کے پاس اُس جگہ کی خوبصورت یادیں نہیں بلکہ غم ہوتے ہیں۔ آپ اُن سے پوچھیں:

آپ: ماشاءاللہ آپ اتنی خوبصورت جگہ پر گئے۔

غمزدہ: اُس سے بھی خوبصورت جگہیں ہیں۔

آپ: سنا ہے پورا ہفتہ وہاں رہے۔

غمزدہ: لوگ تو مہینہ مہینہ بھر رہتے ہیں۔

آپ: لیکن آپ رہے بھی تو ایک اچھے ہوٹل میں تھے۔

غمزدہ: لوگوں کے تو اپنے عالیشان گھر ہیں وہاں پر۔

آپ: چلو آپ نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ تو اُس خوبصورت جگہ کی سیر کرلی۔

غمزدہ: اب عمر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ اب کیا فائدہ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غم

اگر اُس فرد کی فائل میں جذبۂ شکر ہوتا تو پھر یہ گفتگو کچھ یوں ہوتی:

آپ: ماشااللہ آپ اتنی خوبصورت جگہ پر گئے۔

شاکر: الحمداللہ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ اللہ نے بھی کیا خوبصورت چیزیں بنائی ہیں۔

آپ: سنا ہے پورا ہفتہ وہاں گزرا۔

شاکر: بس اللہ نے توفیق دی۔ بہت اچھا وقت گزرا۔ ہم تو وہاں سے اچھی یادیں لے کر لوٹے ہیں۔

آپ: ایک اچھے ہوٹل میں رہے تھے۔

شاکر: جی ہاں ہماری خوش قسمتی۔ ورنہ لوگ تو کافی غیر معیاری جگہوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ ہم اُن سے اچھے رہے۔

آپ: چلو آپ نے ایک اچھی جگہ دیکھ لی۔

شاکر: بالکل بالکل اللہ سب کو ایسی خوبصورت جگہ دیکھنے کا موقع دے، اگر آپ کا کبھی جانے کا پروگرام بنے تو بتایئے گا میں آپ کو گائیڈ کر دوں گا۔

غم ڈپریشن کی بنیاد ہے۔ انسانی جذبات میں خلا قائم نہیں رہ سکتا۔ وہاں کوئی جذبہ تو آئے گا۔ شُکر نہیں تو غم سہی۔ غم بڑھتے بڑھتے ڈپریشن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ڈپریشن غموں کے بوجھ کا نام ہے۔ وہ بوجھ جو ہم اُٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ غم تو ہر کسی کے ساتھ لگے ہیں۔ لیکن اُن کی عمر عارضی ہوتی ہے ایک دن، دو دن یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتے۔ اُس کے بعد اُنہیں ختم ہو جانا چاہیے۔ بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ یا تو ایک ہی غم جان لیوا ثابت ہوتا ہے یا انسان کو یکے بعد دیگرے اتنے غم ملتے ہیں کہ وہ ایک کو بُھولتا ہے تو دوسرا مل جاتا ہے دوسرے کو بُھولتا ہے تو تیسرا شروع ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر؎

میری قسمت میں غم گر اتنے تھے
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غم

دنیا میں دونوں قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کی شادی 40 سال رہی اور 40 سال کی رفاقت کے بعد اُس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ فرد اس ایک غم سے نہیں نکل پاتا۔ اُس کا غم بڑھتا جاتا ہے۔ اُس نے تنہا زندگی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ یہ غم آگے چل کر شوگر یا کینسر جیسے موذی مرض میں تبدیل ہو کر فرد کی جان لے لیتا ہے۔ دوسری قسم اُس فرد کی ہے جس کا گھر بار سب ٹھیک ہے لیکن چھوٹی چھوٹی باتیں اُس کو غم دیتی رہتی ہیں۔ کبھی اُسے اپنے رشتے دار کی کوئی بات ستاتی ہے۔ کبھی اُسے اپنی گاڑی کے خراب ہونے کا غم ہوتا ہے۔ کبھی وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے غم زدہ ہو جاتا ہے تو کبھی معاشرے کی بے راہ روی اُسے اداس کیے رکھتی ہے۔ ایسا فرد ایک مدت تک چھوٹے چھوٹے غموں میں ڈوبا رہتا ہے اور پھر اُسے ایک بڑا غم ملتا ہے جو اُس کے کسی قریبی کی موت یا بیماری کی صورت میں ہوتا ہے اُس کی نوکری جاتی رہتی ہے، کاروبار تباہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ فرد اپنے چھوٹے چھوٹے غم بھول کر ایک بڑے غم کا شکار ہو جاتا ہے۔

قرآن میں جتنی لذتوں کا ذکر آیا ہے وہی غم کا موجب بھی بنتی ہیں۔ یعنی ہمیں جو بھی لذت ملے اگر ہماری فائل میں شُکر کے بغیر چلی جائے تو غم کا موجب بنتی ہے۔ قرآن میں ایسے 25 ذرائع کا ذکر ہے جن کی موجودگی لذت بھی دیتی ہے اور غم بھی۔ اُن کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔ یہاں غم کے باب میں ضروری ہے کہ ہم غم کی مختلف کیفیات کا ذکر کریں اور دیکھیں کہ غم ہماری شخصیت پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن غم کی کیفیات اور اثرات کا ذکر کرنے سے پہلے ہم ایک چھوٹی سی بات بتاتے چلیں۔ پچھلے 40 سالوں سے دنیا میں ڈپریشن میں شدید اضافہ ہو گیا ہے۔ صرف سو سال پہلے شاید سو میں سے ۵ لوگ ڈپریشن سے متاثر ملتے ہوں لیکن آج تو مغربی دنیا کے بڑے شہروں میں ۱۰ میں سے ۵ لوگ ڈپریشن کے مریض ہیں۔ اور یہ وبا تیزی سے مشرقی معاشروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

صنعتی دور میں جب انسان مختلف مصنوعات کو مشین پر بنانے کے قابل ہوا تو پیداوار میں یکا یک کئی سو گُنا اضافہ ہو گیا۔ ایک مشین اب اتنی مصنوعات ایک گھنٹے میں پیدا کر سکتی تھی جتنی مصنوعات ۱۰ لوگ ایک ہفتے میں پیدا کرتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ اتنی مصنوعات کی کھپت کیسے ہو۔ مصنوعات بنانے کی مشین تو انسان نے ایجاد کر لی لیکن اُن کو کھپانے کا کوئی طریقہ اس کے سامنے نہ تھا۔

کیا اُن مصنوعات کے استعمال سے حاصل ہونے والی لذت پیدا کر دینے سے مصنوعات کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غم

کھپت بڑھ سکتی تھی؟ جی نہیں۔ کسی چیز کو خریدنے کے لیے آپ کے اندر اُس چیز کی لذت ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ آپ کو کسی چیز کے استعمال سے لذت ملے اور آپ اُس کے استعمال پر شُکر کریں تو ایسی لذت آپ کو یاد بن کر ستائے گی نہیں۔ لذت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اُس کا غم زدہ یاد بننا ضروری ہے اور یہ ایک اہم حقیقت ہے۔ صرف ایک دفعہ کی لذت اُس چیز کی مستقل خواہش میں تبدیل نہیں ہوتی۔ اُس کے دوبارہ نہ ملنے کا غم اِس لذت کو دوبارہ حاصل کرنے کی رغبت پیدا کرتا ہے۔

مثلاً آپ نے ایک اچھے ریسٹورنٹ میں ایک دفعہ کھانا کھایا اللہ کا شُکر ادا کیا۔ اب آپ اکثر وہ دن یاد کر کے لطف اُٹھائیں گے۔ لیکن شُکر کے بغیر آپ کو جب بھی یاد آئے گی آپ کو یہ غم ہوگا کہ آپ نے صرف ایک دفعہ وہاں کھانا کھایا ہے۔ آپ کو یہ حسرت ہوگی کہ کاش آپ کو دوبارہ وہاں کھانا کھانے کو ملے۔ اِسی طرح آپ کو کسی سے کوئی تحفہ ملتا ہے۔ وہ تحفہ ملتے ہی آپ سوچیں گے کہ اگلی دفعہ آپ کو کیا تحفہ ملے گا۔ اوروں کو کیا تحائف دیے گئے ہوں گے۔ آپ نے اُس کے ساتھ جو نیکیاں کی ہیں اُس کا صلہ یہ ادنیٰ سا تحفہ تو نہیں تھا آپ کو اُس سے بہتر چیز ملنی چاہیے تھی۔

دراصل مصنوعات کی طلب پیدا کرنے کے لیے آپ کو لذت سے زیادہ لذت کے دوبارہ نہ ملنے کے غم کا احساس دلانے کی ضرورت ہے۔ جدید مادی دنیا میں لذت کے نہ ملنے کا غم بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہم نے شروع میں چاکلیٹ کی بات کی تھی۔ چاکلیٹ کی لذت اِس غم کے ساتھ یاد کا حصہ بنی کہ ہمیں اور میسر نہیں۔ اب چاکلیٹ کھانے والا وسائل پیدا کرتا ہے تاکہ وہ مزید چاکلیٹ خرید سکے۔ پھر وہ مزید چاکلیٹ کھاتا ہے۔ پہلے ہفتے میں ایک دفعہ کھاتا تھا۔ پھر اُسے یہ غم ہوا کہ اُس کی یہ لذت ہفتے میں دو دفعہ پوری نہیں ہو پاتی اور اُس نے وہ صلاحیت پیدا کر لی کہ اب ہفتے میں دو بار چاکلیٹ کھا سکتا ہے۔ اِس خواہش کی تکمیل ہوتے ہی اُسے یہ غم لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ خواہش روز کیوں نہیں پوری ہوتی۔ یا یہ کہ اُس کے گھر میں چاکلیٹ کا ایک ڈبہ ہر وقت موجود کیوں نہیں رہتا۔ یہی صورتِ حال کئی دوسری لذتوں کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً بہت سے کپڑے نہ ہونے کا غم، معاشرے میں عزت نہ ملنے کا غم، ایک اچھا گھر نہ ہونے کا غم۔

ہم نے ذکر کیا تھا کہ لذتوں کے نہ ملنے کا غم پیدا کرنے سے مصنوعات بکتی ہیں۔ تو پھر یہ غم آج کے صنعتی دور میں کیسے پیدا کیا گیا؟ تین جدید ایجادات صنعت کار کی مدد کو آ گئیں جنہوں نے کروڑوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غم

لوگوں کو گھر بیٹھے کسی لذت کے میسر نہ آنے کے غم میں مبتلا کر دیا اور یہ تین ایجادات تھیں، روزنامہ کا اخبار، سینما اور TV۔ انہوں نے لذتوں کے مزید حصول کی آگ بھڑکا دی۔ صارف کو قائل کر دیا کہ وہ ناکام ہے، بہت بدقسمت ہے اگر وہ ایک لذت کو بار بار حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اِن تین ایجادات کے ذریعہ صنعت کار نے تو لوگوں کو ان لذتوں کی طرف بھی مائل کیا جن کا اُن کے پاس پہلے کبھی تصور بھی نہ تھا۔ ایک لذت جس کا آپ کو تجربہ ہوا اور آپ اُس کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مثلاً آپ نے ایک بار آئس کریم کھائی اب آپ کے پاس اِس لذت کی یاد ہے۔ ایک خوبصورت احساس۔ آپ اس لذت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہیں گے۔ اگر آپ کا غم صرف انہی لذتوں کے حصول تک محدود رہتا جن کا تجربہ آپ کم از کم ایک دفعہ کر چکے تھے تو شاید یہ اتنا خطرناک نہ ہوتا۔ مسئلہ تب ہوا جب اخبار، سنیما اور TV اُن لذتوں کے غم کو بھی پیدا کرنے میں کامیاب رہے جن کا انسان نے کبھی تجربہ ہی نہ کیا تھا۔

آپ سگریٹ کی ہی مثال لے لیجیے۔ صدیوں تک انسان تمبا کو کو ہاتھ سے سگریٹ کی شکل دیتا تھا جسے بیڑی کہتے تھے۔ یہ بیڑی بہت ہی کم لوگ پیتے تھے۔ بیشتر لوگ نہ صرف اِس لذت سے ناآشنا تھے بلکہ ناپسند بھی کرتے تھے۔ پھر انسان نے مشین سے سگریٹ بنانا شروع کیا۔ ایک ہی دن میں صنعتکار اتنے سگریٹ بنانے کے قابل ہوگیا جتنے لوگ ہاتھ سے ایک سال میں بناتے تھے۔ اتنی بڑی کھپت کے لیے صنعت کار کی مدد کو آیا سینما۔ بڑی سکرین پر پہلی دفعہ ایک خوبرو اداکار نے مردانگی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے جیب سے سگریٹ نکال کر دانتوں میں دبایا اور اُسے سلگانے کے لیے ایک اداکارہ نے ماچس کی تیلی جلائی تو ہزاروں نوجوان ایک لمحے میں سگریٹ کی لذت سے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی سگریٹ کی لذت کے غم میں مبتلا ہوگئے۔ یہی کچھ عورتوں کے وارڈروب کے حوالے سے ہوا۔ 20 ویں صدی کے اوائل تک عورتوں کے پاس ملبوسات کے لیے وارڈروب کا کوئی تصور نہ تھا۔ اُن کے پاس چند کپڑے گھر میں پہننے کو اور چند خوشی کے خاص مواقع کے لیے ہوتے تھے۔ اِسی دور میں کپڑا ہاتھ کی کھڈی کے بجائے بڑے پیمانے پر مشین پر بننا شروع ہوا اب اتنے کپڑے کو کیسے بیچا جائے۔ اخبار میں صرف ایک تصویر چھپی جس میں ایک عورت ایک نئے لباس میں ملبوس نظر آتی ہے اور کئی مرد اُسے پیار سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر چھپی اور بس۔ اب عورت معاشرے میں رتبہ حاصل کرنے کے لیے لباس کی لذت کے غم میں

غم

مبتلا ہوگئی۔ اُن مثالوں سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ بہت سی لذتوں کا غم انسان کو اس لیے ہوتا ہے کہ وہ دوسری لذتیں ملنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ خواتین کے لیے میک اپ، خوشبویات اور زیورات معاشرے میں عزت اور رتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر عورت کو زیورات نہ ہونے کا غم اِس لیے ہو کہ اُسے زیورات پہن کر لذت ملتی ہے۔ عین ممکن ہے اُسے اپنے گھر اور معاشرے میں عزت نہ ملنے کا غم ہو۔ اُس کی خواہش ہو کہ لوگ اُسے دیکھیں اور پیار سے بات کریں۔ اُسے یہ احساس ہو کہ لوگ اُسے تب ہی عزت اور وقار سے نوازتے ہیں جب اُس نے خود کو زیورات سے آراستہ کیا ہو۔ اِس لیے زیورات ناکافی ہونے کا غم دراصل معاشرے میں اُسے عزت نہ ملنے کے غم سے منسلک ہوگیا۔

اخبار، سینما اور TV کے آتے ہی انسان ایسی بہت سی لذتوں سے متعارف ہوا جن کے بغیر اچھی زندگی کا تصور ہی بے سود تھا۔ صنعت کار کی مدد کے لیے اِن سے بہتر ایجادات کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ مصنوعات بنانے کے لیے مشین اور مصنوعات بیچنے کے لیے اخبار، سینما اور TV ۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اخبار، سینما اور TV کے بغیر صنعتی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا۔ اِس حقیقت کا ادراک سب سے پہلے یہودیوں نے کیا۔ جوں ہی یہ بات اُن کی سمجھ میں آئی اُنہوں نے دو کام کیے ایک تو انہوں نے اخبار، سینما اور TV بنانے والے ادارے خریدنا یا قائم کرنا شروع کیے۔ دوسرے اُنہوں نے بینک قائم کیے جہاں سے سود پر پیسہ ملتا ہے۔ اُن مالی اداروں کے تعاون سے ہی صنعتیں قائم ہوئیں اور میڈیا کی نئی تنظیموں کا وجود ممکن ہوا۔ انٹرنیٹ کی صورت میں میڈیا کا ایک اور موثر ہتھیار ایجاد ہوگیا۔ جس نے اخبار، سینما اور TV کو پیچھے چھوڑ دیا آج دنیا کے بڑے صنعت کار میڈیا کی بڑی شخصیات کے ساتھ گہرے روابط رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دونوں کے خاندانی مراسم ہیں۔ اِس گٹھ جوڑ نے انہیں پچھلے سو سال میں بالعموم اور پچھلے 50 برس میں بالخصوص بے پناہ دولت کمانے کا موقع دیا۔ اتنی دولت کہ عام آدمی اُس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اور عام آدمی کو کیا ملا؟ غم۔ جتنا غم بڑھتا ہے اُتنا ہی ہم زیادہ خریدتے ہیں، جتنا ہم زیادہ خریدتے ہیں اُتنی ہی میڈیا، بینک کار اور صنعت کار کی تجوریاں بھرتی ہیں۔

غم نے بڑھتے بڑھتے ڈپریشن کی صورت اختیار کرلی۔ ڈپریشن کے آتے ہی جسمانی امراض پیدا ہوگئے۔ زندگی اجیرن ہوگئی۔ لیکن دنیا کے چند امیر ترین لوگوں کے لیے یہ بھی گھاٹے کا سودا نہ تھا۔ یہ دوائیوں کی ایک نئی منڈی تھی۔ کپڑا خریدتے وقت تو انسان فیصلہ کل پر ٹال سکتا ہے۔ لیکن ڈپریشن سے

غم

پیدا ہونے والے السر کا علاج تو آج ہی ہونا ہے بلکہ اسی وقت۔ یوں دوائیوں کی صنعت بھی کپڑے اور چاکلیٹ کی طرح کئی بلین ڈالر کی صنعت ہے جس کے حصص بھی اُنہی لوگوں کے پاس ہیں جو لوگوں کو غم دیتے ہیں۔ اب کچھ ذکر ہو جائے غم کی کیفیت اور اُس سے پیدا ہونے والے اثرات کا۔

لذت کے نہ ملنے سے پیدا ہونے والا غم حقیقی نہیں ہوتا اِس لیے اُس کی کیفیات بھی غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ یعنی جب ہماری لذت شُکر کے جذبے سے عاری ہو اور پھر اُس کی افراط ہو جائے تو اس سے پیدا ہونے والی کیفیات میں بھی کثرت پائی جاتی ہے۔ یہ کثرت کا ایک عجیب تسلسل ہے۔ مصنوعات کی کثرت، تعداد کی کثرت، لذتوں کی کثرت اور اُس سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات میں کثرت۔ غموں میں ڈوبا انسان یا تو کثرت سے جھگڑتا ہے یا ضرورت سے زیادہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اُس کے دماغ میں شدید خالی پن پیدا ہو جاتا ہے جس کے بعد وہ کسی ایک موضوع پر زیادہ دیر غور نہیں کر سکتا یا اُس کے دماغ میں کوئی خیال الجھ جاتا ہے۔ پھر وہ مسلسل اُسی موضوع پر کئی ہفتے غور کرتا رہتا ہے۔ ایسے انسان سے بات چیت کے دوران آپ کچھ پوچھیں تو آپ اُسے خالی الذہن پائیں گے۔ وہ آپ سے کہے گا۔ ''دوبارہ کہنا۔ کیا کہا؟ میں سمجھا نہیں۔ ارے وہ ایک اور بات میرے ذہن میں آ گئی تھی میں نے سُنا نہیں۔ مجھے ابھی ضروری کام ہیں میں آپ سے پھر بات کروں گا۔ یا یہ کہ میرے پاس اور بھی مسائل ہیں''۔ یا پھر اُس سے کوئی بھی بات کریں اُسے صرف سیاست سے دلچسپی ہوگی اُس کے نزدیک ساری بیماریوں کی جڑ سپریم کورٹ کا کوئی ایک فیصلہ ہوگا۔ آپ تعلیم کی بات کریں وہ کہے گا ''ہاں یہ نہ ہوتا اگر سپریم کورٹ فلاں فیصلہ ٹھیک کرتی''۔ آپ موسم کی خرابی کا ذکر چھیڑیں وہ کہے گا ''بھائی جس ملک کی سپریم کورٹ ایسے فیصلے کرے گی وہاں ایسا شدید موسم ہی ملے گا''۔ یا تو وہ ہر کام خود کرے گا اور کسی کو فیصلے میں شریک کرنا پسند نہیں کرے گا۔ اُسے اپنے دل کی بات کسی سے کہنے میں بہت مشکل ہوگی۔ یا پھر وہ اپنی باتیں محفل میں سُنا سُنا کر ہنسے گا اور دوسروں کو بھی ہنسائے گا۔

ایسے لوگوں کو ایک ہفتہ لگ جاتا ہے صرف یہ بتانے میں کہ اُن کے سر میں شدید درد ہے یا اُن کی فلاں چیز گم ہو گئی ہے۔ یا پھر وہ دوسرے لوگوں کی کمزوری جس کا اُنہیں پتا ہے چٹخارے لے کر سناتے ہیں۔ کسی کا راز اُن کی محفل میں ایک گرما گرم خبر بن جاتا ہے۔ یہی حال اُن کے رونے اور ہنسنے کا ہے۔ کبھی وہ روئیں گے اور ڈپریشن بڑھنے کی صورت میں کئی کئی دن روتے رہیں گے۔ یا پھر اُنہیں ہنسی کے دورے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑیں گے۔ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر ہنستے نظر آئیں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بہتے لہو کو دیکھ کر بھی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ غموں کی کثرت کے لیے وہ ہر کسی کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ انہیں کسی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ وہ دوسروں کے طرزِ گفتگو سے لے کر اُن کے نظریات تک ہر چیز میں کیڑے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اور پھر اُنہیں اس فرد کے سامنے پیش کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اِن کے نزدیک ایسا کرنے سے ''حق کا بول بالا ہوتا ہے''۔ ''کسی کو حقیقت کا احساس ہوتا ہے''۔ وغیرہ۔ اُنہیں یوں لگتا ہے کہ ساری دنیا غلط ہے اور اُن کے مشوروں اور فیصلوں کی منتظر ہے۔ یہ لوگ اپنے کپڑوں، صحت اور وزن سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں اور آپ اُن کو بے ترتیب، موٹا اور بیمار ہی پائیں گے۔ دوسری صورت میں آپ دیکھیں گے کہ یہ اپنی صحت اور خاص طور پر وزن کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ اُنہیں اپنے رنگ، بالوں، جلد اور کپڑوں کی فکر لاحق رہتی ہے۔ آپ اُنہیں تنگ کپڑے پہنے دیکھیں گے۔ اُن کے پاس ہر قسم کی کریم اور شیمپو بھی ملیں گے۔ یعنی یا تو کثرت سے انکساری بڑھ جائے گی یا انا پرستی حد سے نکل جائے گی۔

ایسے لوگ خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں اُنہیں مسلسل یہ خیال ڈستا رہتا ہے کہ وہ لوگوں کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ لوگوں کے طعنے اُن سے برداشت نہیں ہوتے۔ بہت نروس ہونے کی وجہ سے اکثر غلطیاں کرتے ہیں مثلاً لکھنے میں Spelling کی غلطیاں، بولنے میں تلفظ کی غلطیاں۔ اِسی طرح اُن سے برتن زیادہ ٹوٹتے ہیں اور کھانے میں نمک یا مسالے یا تو زیادہ ڈال دیتے ہیں یا سرے سے ڈالنا ہی بھول جاتے ہیں۔ اُنہی لوگوں میں مذہبی شدت پسندی پائی جاتی ہے۔ مذہبی انتہا پسندی دراصل ڈپریشن کی ایک بہت ہی واضح علامت ہے۔ وہ اسراف اور بخل میں بھی انتہا پسند ہوتے ہیں۔ یا تو سب کچھ لُٹا دیتے ہیں یا پھر اُنہیں ایک پیسہ خرچ کرتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ انتہا پسندی ہی ڈپریشن یعنی غم کی شدت ہے۔

یہ تو ہو گئیں کچھ کیفیات اب آیئے اثرات کی طرف۔ غم انسانی جسم پر شدید اثرات مرتب کرتا ہے۔ بالوں کا گرنا اور سر میں خشکی اُس کی واضح نشانیاں ہیں۔ خشکی اُس طبعی نظام کا حصہ ہے جس کے ذریعہ انسانی جذبات میں غم کی شدت کا اظہار جلد کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ خشکی ہی بالوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ مسوڑھوں میں سے خون بہنا بھی اِسی دبے ہوئے غم کی ایک نشانی ہے۔ اِس کے علاوہ گلے میں درد اور نزلہ زکام کی فراوانی بھی اِسی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں۔ پٹھوں میں کھنچاؤ تو اُس کا واضح

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غم

اظہار ہے۔جسم پر خارش بھی غموں کی انتہاء کو ظاہر کرتی ہے۔ایسے لوگوں کو یا تو اکثر قبض رہتا ہے یا پھر اُنہیں اسہال لگے رہتے ہیں۔نظامِ انہضام جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے حقیقت پسند نہیں رہتا اور اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔

آخر میں ایک دلچسپ سوال کی طرف آتے ہیں۔کیا دنیا میں غم صرف اُن کو ملتے ہیں جو شُکر نہیں کرتے اور لذتوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں؟ کیا مومنوں کو ڈپریشن نہیں ہوتا؟ کیا اللہ کے نیک بندے غموں سے آزاد ہیں؟

جی نہیں اللہ کے نیک بندے بھی غموں کا شکار ہوتے ہیں اُنہیں بھی دُکھ پہنچتا ہے۔لیکن اُن کے دکھوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔اُن کے غم دو اقسام کے ہوتے ہیں ایک تو ذاتی نوعیت کے۔دوسرے لوگوں سے متعلق ہوتے ہیں۔سب سے پہلے تو اللہ کے نیک بندوں کو اُن لمحوں کے گزر جانے کا غم ہوتا ہے جب وہ اللہ کی عبادت ٹھیک طرح سے نہ کرسکے اُنہیں اُن مواقع سے بھرپور فائدہ نہ اُٹھا سکنے کا غم ہوتا ہے جب وہ کوئی نیکی کرسکتے تھے لیکن اُن کا دھیان اُدھر نہ گیا۔پھر ایک غم کی کیفیت اِس سے بھی بڑھ کر ہے جو شائد بہت ہی کم لوگوں پر طاری ہوتی ہے۔اللہ کے کچھ خاص بندے دنیا کو ایک پنجرہ سمجھتے ہیں اُنہیں اِس زمین وآسمان سے پرے اللہ کے عرش کی وسعت یاد آتی ہے۔وہ اُس ابدی دنیا کو یاد کر کے غمگین ہو جاتے ہیں۔ پھر اُنہیں اللہ کا دیدار نہ ہونے کا غم سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

اُن لوگوں کے لیے اللہ کے دیدار سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں ہوتی۔وہ ہر پل اُس لذت کو حاصل کرنے کے لیے تڑپتے ہیں۔لیکن اُس کے لیے اُنہیں زندگی کے دن اِس دنیا میں پورے کرنا ہوتے ہیں۔اُنہیں اپنی زندگی پر اختیار نہیں ہوتا۔وہ ایک جہاد سے دوسرے جہاد میں شوقِ شہادت لیے لڑتے رہتے ہیں کہ کسی طرح شہادت نصیب ہو اور وہ اللہ کے عرش کے نیچے جگہ پائیں۔لیکن اللہ نے اُس ملاقات کا ایک وقت متعین کیا ہوتا ہے۔جب تک وہ وقت نہیں آتا یہ لوگ اُس ملاقات کے نہ ہونے کے غم میں تڑپتے ہیں۔ اِسی غم میں شامل کر لیجیے ایک اور غم۔یہ لوگ اللہ کے محبوب ﷺ،اللہ کے رسول ﷺ سے ملنے کا بھی بے پناہ شوق رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح وہ دنیا میں کامیاب ہو کر جنت میں پہنچ جائیں اور کہیں ''یارسول اللہ ﷺ میں آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہوں''۔جب تک یہ لمحہ نہیں آتا وہ بے چین رہتے ہیں۔

مومنوں کو ایک اور غم بھی لاحق ہوتا ہے۔اُنہیں اُن لاکھوں کروڑوں لوگوں کا دکھ ہوتا ہے جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایمان کی دولت سے سرشار نہیں ہوئے۔اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ اسلام کا نور ہر دل کو منور کرے۔وہ اُن تاریک دلوں کا سوچ سوچ کر روتے ہیں۔اُن کی ہدایت کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔پھر وہ اُن لوگوں کو دینِ اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے عملی طور پر مصروف ہو جاتے ہیں۔بہت سے لوگ اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں۔اُن پر پھبتیاں کستے ہیں۔کوئی پاگل کہتا ہے کوئی برا بھلا کہتا ہے۔لوگوں کا یہ رویہ اُنہیں غمگین کرتا ہے۔اُنہیں گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ اپنی ذمہ داری ٹھیک طرح سے نبھا نہیں پائے۔ناکامی کا یہ دکھ اُنہیں اداس کر دیتا ہے۔وہ اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں دعائیں مانگتے ہیں ''یا اللہ ہمیں یہ صلاحیت دے کہ ہم تیرا دین لوگوں تک پہنچا سکیں''۔یہ ہیں وہ دکھ جو اللہ کے نیک بندوں کو لاحق ہوتے ہیں۔اللہ اُن کو تسلی دیتا ہے۔تاہم کبھی کبھی اُن کا دُکھ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے اور پھر وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں نہ پہنچنے کا اُنہیں دُکھ تھا۔ اللہ نے قرآن میں بار بار اُنہیں تسلیاں دی ہیں۔بس کچھ دیر انتظار کرو۔کچھ دن اور دنیا میں بسر کرو پھر نہ تو تمہیں کوئی دکھ ہوگا اور نہ کوئی غم۔

دکھ کی یہی صورتِ حال اللہ کے نبی ﷺ کو درپیش رہی۔ایک واقعہ تو اُن کے طائف کے دورۂ تبلیغ کا ہے۔آپ بڑی اُمیدیں لے کر وہاں گئے۔وہاں آپ کا مذاق اُڑایا گیا اور لوگوں نے پتھر مار مار کر آپ کو لہولہان کر دیا آپ شہر سے نکال دیے گئے۔دُکھ میں شرابور اللہ کے آخری نبی ﷺ طائف سے باہر ایک پتھر پر آ بیٹھے۔وہاں آپ نے اللہ کے سامنے اپنے دُکھ کا اظہار کیا۔اللہ کو آپ کے دُکھ کا احساس تھا۔ اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو آپ کے پاس بھیجا۔جبرئیل علیہ السلام نے آ کر اجازت مانگی کہ طائف والوں کے اِس رویہ پر اُنہیں تباہ کر دیا جائے۔اللہ کے نبی ﷺ کے جواب نے تاریخ کا دھارا تبدیل کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔''نہیں مجھے اُمید ہے کہ اُن کی اولاد اسلام قبول کرلے گی''۔

یہی اُمید انسان کے بنیادی ۵ جذبات میں سے ایک جذبہ ہے کہ جس کے بارے میں ہم اگلے باب میں گفتگو کریں گے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۱. اُمید

اللہ کے نبی ﷺ نے طائف میں اسلام کی تبلیغ کرنے کی ٹھانی اور اُس پہاڑی شہر کا رُخ کیا۔ مگر مکہ کی طرح یہاں بھی کفار نے آپ کی ایک نہ سُنی ۔آپ دن بھر گلی گلی تنگ کیے جاتے رہے اور بالآخر شہر سے نکال دیے گئے ۔ایسے میں جبریل علیہ السلام نے طائف کو ملیا میٹ کرنے کی اجازت مانگی جس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اُمید ظاہر کی کہ طائف والوں کی اگلی نسل کو مسلمان ہونا ہے اس لیے آج کے طائف کو تباہ نہ کیا جائے۔

امید انسان کے بنیادی جذبوں میں سب سے طاقتور اور شاید بہت ہی ناقابلِ فہم جذبہ ہے۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب امید کا درس دیتے ہیں،فتوحات اور ایجادات اُمید کے زیرِ اثر ہی ممکن ہوتی ہیں۔ اُمید کی کوئی انتہا نہیں اِس لیے اُمیدوں کی وسعت کا اندازہ لگانا بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔لذت کا شکار انسان با آسانی پہچانا جا سکتا ہے۔اُس کی سادہ سی گفتگو چند سادہ خواہشات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔اِس لیے غم کو پہچاننا مشکل نہیں رہتا۔یہی حال باقی کے بنیادی جذبات کا ہے۔یوں تو ان جذبات کی اپنی کوئی انتہا نہیں لیکن ایک مرحلے پر پہنچ کر اُن چار بنیادی جذبات کا اثر ہمارے جسم پر اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ ہم مزید جذبات کو دل میں سمیٹنے کے متحمل نہیں ہو پاتے۔

اُمید کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں۔پُر اُمید لوگ اور زیادہ مطمئن ہوتے جاتے ہیں۔اُن کے اندر بُردباری آتی جاتی ہے۔اُمید کا جذبہ چونکہ مستقبل سے متعلق ہوتا ہے اس لیے پُر اُمید لوگ نہ تو حال کی لذت کے چکر میں رہتے ہیں نہ ہی ماضی کے غم انہیں ڈستے ہیں۔وہ ماضی اور حال کو فقط مستقبل میں حالات کو اپنے رُخ پر موڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اُمید کی یہی خصوصیات اُسے دوسرے جذبات سے ممیّز کرتی ہے۔اُمید مستقبل بین ہے۔وہ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا سکھاتی ہے۔اور آنے والے اُس دور میں لے جاتی ہے جس کا تصور آج ممکن نہیں ہوتا۔اس لیے اُمید کا جذبہ غم اور لذت پر قابو پانے سے پیدا ہوتا ہے۔یہ ممکن ہے کہ انسان غم میں ڈوبا ہوا اور اپنے غم سے نکل کر اُمید کے جذبے میں چلا جائے۔ایسا ہوتے ہی اُس کی سوچ میں تبدیلی آ جاتی ہے۔اُس کا رویہ اور عمل بھی بدل جاتا ہے اور پھر وہ دنیا میں کوئی مثبت کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اِس ابتدائی تعارف کے بعد ہم اُمید کی تفصیل میں جاتے ہیں:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

غم کا تعلق ماضی سے ہے۔ یہ ماضی قریب چند لمحے پہلے کا بھی ہوسکتا ہے اور ماضی بعید کئی سال پہلے کا کوئی دردناک واقعہ بھی ہوسکتا ہے۔ چند لمحے پہلے ہمارا ایک دوست ہم سے روٹھ گیا ہے لیکن یہ واقعہ بہرحال ماضی ہو چکا اور اسی لیے اِس کا غم بھی ہے۔ اِسی طرح بہت سال پہلے کا حادثہ جس میں ہم صدمے سے دوچار ہوئے ماضی بعید کا ایک غم ہے جو ہماری یادداشت میں محفوظ ہے۔ لذت لمحۂ موجود کا جذبہ ہے۔ جبکہ اُمید کا تعلق مستقبل سے ہے۔ اُمید آنے والے کل سے ہوتی ہے۔ جبکہ دُکھ گزرے ہوئے کل کا ہوتا ہے۔ لیکن اُمید کو آنے والے کل میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اُمید ایسا طاقتور جذبہ ہے کہ بڑھتے بڑھتے وقت کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اِس لیے اُمید کے جذبے کو سمجھنے کے لیے ضرورت ہے وقت کو سمجھنے کی۔

وقت کیا ہے اور اس کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے؟ وقت تبدیلی کا نام ہے۔ وقت ایک سفر ہے۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وقت واقعات کی تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ وقت کی بہت سی اقسام ہیں۔ ایک وقت تو اللہ کا ہے جس کا ایک لمحہ ہمارے کروڑوں سالوں سے بھی بڑا ہے۔ ۶۰ سے ۸۰ سال کی اوسط زندگی پانے والا انسان اس وقت کا احاطہ نہیں کر سکتا بلکہ اس وقت کا احاطہ یہ پوری دنیا نہیں کر سکتی جس کی کُل عمر ہی اللہ کے وقت کے مطابق چند لمحوں کی ہے۔ اللہ کے اِس لامتناہی وقت کے بعد آتا ہے وہ وقت جو اس کائنات کی پیدائش سے شروع ہوا۔ کائنات کی پیدائش ایک زبردست دھماکے سے ہوئی۔ اِس سے پہلے کائنات کا کُل مادہ یکجا تھا۔ شدید دباؤ اور گرمی کی وجہ سے یہ مادہ ہر طرف بکھرنا شروع ہوا اور اس حرکت کے ساتھ ہی کائنات کے وقت کا آغاز ہوا۔ کائنات کے پھیلنے کا سلسلہ سال ہا سال تک جاری رہا اور اب بھی جاری ہے کائنات کی وسعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس وقت کو صرف سالوں میں ہی ناپا جا سکتا ہے یہاں گھنٹوں یا دنوں کا کوئی شمار نہیں ہے۔

کائنات سے ہم آجاتے ہیں کرۂ ارض پر۔ جہاں سب سے پہلے نباتات اور پھر حیوانات کا ظہور ہوا۔ یعنی اِن دونوں کی تخلیق کا عمل ناپا جا سکتا ہے۔ نباتات عام طور پر موسموں کے مطابق ہوتے ہیں یعنی گرمی میں فلاں پھل یا سبزی ہوتی ہے۔ گلاب کے پھول فلاں موسم میں آتے ہیں وغیرہ۔ حشرات کی زندگی ایک خاص Life Cycle کے ماتحت ہوتی ہے۔ اور یہ چکر چند دنوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ تبدیلی ایک حالت سے دوسری حالت میں ہوتی ہے اس لیے حشرات کے Life Cycle میں تبدیلی کو وقت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ویسے ہی جیسے سیب کے پیڑ میں تبدیلی موسموں کے لحاظ سے ہوتی ہے اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُسے اس حوالے سے ہی ناپا جاتا ہے۔

اِسی طرح پیدائش کے بعد انسان میں نمایاں جسمانی اور ذہنی تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ انسان کا ذہن ارتقاء کے مراحل سے گزرتا ہے۔ انسان جسمانی طور پر بھی کئی قوتیں اور صلاحیتیں حاصل کر لیتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی تبدیلی کے اِس عمل کو ہم عام طور پر سالوں میں گنتے ہیں۔ پھر ایک وقت ہے حادثات اور واقعات کا۔ یعنی ہماری گھڑیاں۔ گھڑیاں ہمیں روزمرہ کی تبدیلی کے بارے میں آگاہ کرتی ہیں اور اُن کا حساب رکھتی ہیں۔ ہمارے جذبات کا تعلق سالوں سے بھی ہے اور گھڑیوں سے بھی۔ مثلاً ہمیں کھانا ڈیڑھ بجے ملے گا۔ یعنی جذباتی طور پر ہم ڈیڑھ بجے ایک خاص لذت کو حاصل کرنے کے لیے تیار رہیں۔ میری والدہ کا انتقال آج سے ۶ سال پہلے دوپہر گیارہ بجے ہوا تھا۔

حالات کی تبدیلی جذبات میں تبدیلی کا موجب بنتی ہے۔ اور وقت جذبات کی تبدیلی کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ ہم اپنے جذبات کو محفوظ کرنے اور بیان کرنے کے لیے وقت کے محتاج ہیں۔ وقت نہ ہو تو ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ دو روز پہلے اچھا کام کرنے پر دفتر میں میری تعریف ہوئی جس کی لذت ابھی تک میرے کانوں میں ہے۔ کل شام چھ بجے میرے پڑوسی کے گھر آگ لگ گئی جس کا مجھے غم ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات جن سے کسی ایک جذبے میں بہت زیادہ کمی بیشی نہ ہوئی ہو۔ ہماری یاد سے محو ہو جاتے ہیں اور اُس کے ساتھ ہی اُن کا وقت بھی ہمارے ذہن سے خارج ہو جاتا ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ جوں جوں ہم غم، خوف اور لذت کا شکار ہوتے جاتے ہیں ہم جذبات کو وقت میں قید کرتے جاتے ہیں۔ یعنی ہر جذبہ کے ظہور پذیر ہونے کا وقت ہمیں یاد رہنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہم اس جذبہ کو وقت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت اہم نفسیاتی حالت ہے جسے ہم کچھ مثالوں سے سمجھتے ہیں۔

۱۔غم:

ہائے وہ کیا گھڑی تھی جب ایسے زور کا سیلاب آیا۔ مجھے یاد ہے میں شام پانچ بجے گھر کے دالان میں کھڑا تھا اور پانی کا ایک ریلا سب کچھ بہا کر لے گیا۔

۲۔غم:

ہمارے اُستاد آج سے دس سال پہلے صبح صادق کے وقت اللہ سے جا ملے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

۳۔غم:

دوپہر کا وقت بہت مصروف ہوتا ہے۔کل بھی گھر میں بہت کام تھا۔کوئی ڈیڑھ بجے بچے سکول سے آئے آدھا گھنٹہ لگا اُن کے کپڑے تبدیل کروانے میں اوراس دوران کھانا جل گیا۔مجھے بہت دُکھ ہوا۔

۴۔لذت:

پچھلے ہفتے ہم فلاں ریسٹورنٹ میں گئے۔وہاں ہم نے رات کا کھانا کھایا بڑا مزا آیا۔بڑی دیر تک ہم وہاں رُکے۔

۵۔لذت:

میں نے پچھلے ماہ اپنے کالج کے تقریری مقابلے میں پہلا انعام جیتا۔یہ مقابلہ صبح شروع ہوا۔میں نے دوسرے نمبر پر تقریر کی۔دوپہر کو انعامات تقسیم ہوئے۔

۶۔اُمید:

مجھے اُمید ہے کہ اگلے سال تک مجھے کوئی نوکری مل جائے گی۔

۷۔اُمید:

میں اپنے بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ دیتی ہوں مجھے اُمید ہے وہ بہتر تعلیم حاصل کریں گے۔

۸۔اُمید:

میں اگلی زندگی میں جنت میں جانے کا خواہش مند ہوں۔اللہ میری اُمید برلائے۔

جذبات اگر وقت میں بندھ جائیں تو وہ ہمارے ذہن کو بھی قابو کر لیتے ہیں پھر ہم جذبات کو وقت اور وقت کو جذبات کے حوالے سے یاد رکھتے ہیں۔مگر جوں جوں ہم جذبات کو وقت میں قید کرتے ہیں اسی قدر ہماری سوچ تنزّل کا شکار ہوتی چلی جاتی ہے۔

غم،لذت اور خوف وقت کے چھوٹے پیمانے میں قید ہو جاتے ہیں مثلاً تین بج کر پندرہ منٹ پر۔اُن سے ملاقات کے فوراً بعد۔صبح صبح وغیرہ۔اِس لیے یہ جذبات انسانی سوچ کو اُوپر کی طرف کھینچتے ہیں۔اور ہمارے جذبات کی گہرائی ختم ہو جاتی ہے۔یاد کے مختلف دریچوں میں مختلف موسموں،سالوں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

لمحوں میں لپٹے ہوئے جذبات انسان کو بے سکون کیے رکھتے ہیں۔ ہر بہار پر ہمیں کسی کے ساتھ بیتے ہوئے لمحے یاد آتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ کا کنگن ہمیں وہ وقت یاد دلاتا ہے جب ہمیں اپنا زیور بیچنا پڑا۔ کوئی خبر ہمیں کسی آنے والے خوف سے روشناس کرتی ہے۔ اور یوں ہم کبھی کسی واقعہ کی یاد، کبھی کسی حادثے کے خوف میں زندہ رہتے ہیں۔ اُمید باقی جذبات سے اِس لیے مختلف ہے کہ وہ واقعات، حادثات اور عام طور پر اوقات کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔

مثلاً ہم اُمید کرتے ہیں کہ حالات جلد بہتر ہو جائیں گے ہمیں نہیں معلوم کہ کب؟ کتنی جلدی؟ اور کس قدر؟ پھر بھی ایک اُمید ہوتی ہے۔ وہ ماں جو اپنے بچے کی تعلیم کے لیے روز و شب وقف کر دیتی ہے نہیں جانتی کہ کب اُس کی اولاد کمانے کے قابل ہو گی یا اُن کی کمائی سے اُسے کتنا فائدہ ہو گا؟ لیکن وہ پر اُمید رہتی ہے۔

عظیم لوگ یہ نہیں جانتے کہ اُن کی کوشش کب اور کیا رنگ لائے گی مگر وہ اپنی کوشش ترک نہیں کرتے بلکہ پُر امید رہتے ہیں۔ اُمید وقت کی بندش سے آزاد ہوتی ہے۔ اُمید کو چیزوں، لوگوں اور جگہوں میں باندھا نہیں جا سکتا۔ اِس لیے اُمید میں حادثات اور واقعات کوئی خلل نہیں ڈالتے۔ اُمید حالات کی تپش سے آزاد رہتی ہے اِس لیے اِس جذبے میں بہت گہرائی ہے جو ہمیں دوسرے جذبوں میں نظر نہیں آتی۔ اللہ سے تعلق میں بھی اُمید سب سے حاوی نظر آتی ہے۔ ہمیں گناہوں کا غم ہے۔ لیکن اُمید ہے کہ اللہ ہمارے گناہ معاف کر دے گا۔ اِس لیے ہم نیکی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ہمیں اللہ سے تعلق قائم کر کے لذت ملتی ہے۔ پھر ہمیں اُمید ہوتی ہے کہ یہ تعلق بار بار قائم ہو گا۔ اور لمبے عرصے کے لیے ہو گا تب ہم اُس تعلق کو قائم کرنے کے لیے آج سے ہی کوششوں کا آغاز کر دیتے ہیں۔

اُمید کا کوئی موسم نہیں ہوتا یہ ہمیشہ ہری بھری رہتی ہے یہ ہر دور میں انسان کو اچھائی کی طرف مائل کر سکتی ہے۔ قتل و غارت ہو یا کفر، چور بازاری ہو یا قحط، اُمید کبھی کم نہیں ہوتی۔ اُمید کا ذکر قرآن میں بار بار ملتا ہے۔ اُمید ہمیں عمل پر کمر بستہ کرتی ہے۔ چونکہ اُمید کی کارفرمائی مستقبل کے حوالے سے ہوتی ہے اِس لیے اِس دور کے لوگ اُسے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور اُس کی مخالفت کرتے ہیں۔ جب ایک پر اُمید فرد کے کام کی مخالفت ہوتی ہے تو اُسے اُمید ہی پناہ دیتی ہے۔ ایسے میں اُسے مستقل مزاجی اور مستقبل بینی ہی سکون دیتی ہے۔ اُمید کا ذکر ہو اور سورۃ العصر کا حوالہ نہ آئے یہ ممکن نہیں۔ ہم یہاں اُمید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

کے جذبے کوسورۃ العصر کے تناظر میں بیان کرتے ہیں۔

سورۃ العصر کا آغاز وقت کی قسم سے ہوتا ہے۔ بلکہ ہم یہ کہیں کہ وقت کی اقسام سے ہوتا ہے تو مناسب ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ایک وقت تو اللہ کا اپنا ہے جو ابدی ہے جس کا ایک لمحہ ہمارے کروڑہا سال کے برابر ہوتا ہے۔ پھر کائنات کا وقت اس کے بعد زمین پر مخلوقات کا وقت۔ اور پھر انسان کا وقت جس میں سے ایک وقت وہ ہے جس کی زنجیر میں ہماری زندگی کے واقعات جکڑے ہوئے ہیں۔ اور پھر زندگی کے وہ جذبات جو اُسے ایک سمت دیتے ہیں اور ہمیں ایک خاص ردِعمل کا اظہار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے جن لوگوں کی شخصیت کا خمیر عام زندگی کے واقعات اور حادثات سے اُٹھا ہو، جن کی زندگی کا مقصد روزمرہ کی لذتیں حاصل کرنا ہو، جن کے لیے دنیا کے غموں کا مداوا یا معاشرتی خوف سے نجات ہی سب سے مقدم ہو وہ ان جذبات میں جکڑے جاتے ہیں پھر وہ ایک ایک لذت کو حاصل کرنے کے لیے دوڑتے ہیں۔ ایک غم میں سے نکلتے ہیں تو کوئی دوسرا غم اُنہیں دبوچ لیتا ہے۔ ایک خوف کے ختم ہوتے ہی دوسرا خوف آ ٹپکتا ہے۔ اُنہیں زندگی میں حقیقی سکون نہیں ملتا۔ بدقسمتی، مایوسی اور بےچینی اُن کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ اِس کے برعکس ایک پُراُمید فرد مستقبل پر نظر رکھتا ہے اُس کی آنکھ آنے والے وقت کو دیکھتی ہے۔ اُس کا آج کل کو بہتر بنانے کے لیے ہوتا ہے۔ اُس کا ایمان ہوتا ہے کہ حق کا بول بالا ہونا ہےاور سچ ہمیشہ رُخِ روشن کی طرح نمایاں ہوگا۔ اِسی سوچ کی بدولت اُس میں اچھے عمل کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے۔ اُس کے اچھے عمل کا فائدہ اُس کے آس پاس کے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔ مخالفت ہوتی ہے لیکن وہ سب کی باتیں برداشت کرلیتا ہے اور پُراُمید رہتا ہے۔ کیونکہ مستقبل کا جو منظر ایک پُراُمید آنکھ دیکھ لیتی ہے وہ دوسروں سے پنہاں رہتا ہے۔ اب سوال اُٹھتا ہے کہ اُمید کے جذبے میں ایسی کیا بات ہے جو انسان کو مستقبل بیں بنادیتی ہے؟ اِس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ جذبات ہمارے دماغ پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

ہم نے ذکر کیا تھا کہ اُمید ایک بہت گہرا جذبہ ہے اس کی جڑیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتری ہوئی ہیں۔ اُس کے برعکس دنیا کی لذتیں، غم اور خوف سطحی ہوتے ہیں یہ ہوتے تو بہت ہیں لیکن ان میں گہرائی نہیں ہوتی۔ جذبہ کی شدید گہرائی دماغ کے سب سے ارفع حصہ پر فائز ہوتی ہے۔ یہ ایک اہم اصول ہے جو اُوپر کی سطح پر (Human Brain) اپنا وجود رکھتا ہے جس کا استعمال ہمیں Tree

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

Human Brain اپنا Type میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ہمارے جذبے کی گہرائی کی صورت میں ہمارا کام شروع کر دیتا ہے۔اُمید کی گہرائی Human Brain کو کام کرنے پر اُکساتی ہے اور صرف Tree Type یعنی Human Brain میں ہی یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ مستقبل بینی کرسکتا ہے۔ اِس کے برعکس دوسرے جذبات کوئی گہرائی نہیں رکھتے اس لیے ذہن کی نچلی دوسطحوں کوحرکت میں لانے کے اہل ہوتے ہیں۔اُن کی بدولت یا تو Bush Type وجود میں آتی ہے کہ جہاں ہم معیشت، مادیت وغیرہ سے آگے نہیں جاتے یا پھر یہ جذبات Dead Type کوتخلیق کرتے ہیں۔اِس کے نتیجے میں ہم کسی عام سے مقصد کو حاصل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جو کہ عام طور پر کوئی ایک لذت ہی ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے عظیم انسان وہ ہوتے ہیں جو پُر اُمید ہوتے ہیں۔اور دنیا کے سب سے پُر اُمید انسان انبیاءؑ ہی تھے۔مثلاً حضرت نوحؑ نے ساڑھے نوسو سال تک پُر اُمید رہنے کے بعد اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوڑا اور وہ بھی تب جب اُنہیں یہ احساس ہو گیا کہ اُن کی قوم کسی صورت ایمان نہیں لائے گی۔ ہر نبی نے ایک مدت تک پوری اُمیدوں کے ساتھ اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی جدوجہد کی۔اُنہیں پتا تھا کہ اگر آج یہ لوگ حق کی جانب راغب نہ ہوئے تو مستقبل میں ان کی اولاد ایمان لے آئے گی۔اُنہیں اُمید تھی کہ ان کی قوم عذاب کی سزاوار نہیں ہوگی۔مگر بیشتر کے ساتھ ایسا نہ ہوا اُن کی اُمیدوں کا خون ہوا اور اللہ کا عذاب اُن کی قوم کا مقدر ہو گیا۔

آخرالزماں نبی ﷺ کی ذات اس لحاظ سے یکتا ہے کہ آپ نے وہ تمام مظالم سہے جو پچھلے تمام انبیاءؑ کے حصے میں آئے تھے۔لیکن اُمید کا دامن نہ چھوڑا۔ طائف میں آپ نے جبریلؑ کو شہر تباہ کرنے سے روک دیا۔ کیوں؟ اِس لیے کہ آپ کو اُمید تھی کہ طائف والوں کی آئندہ نسل ضرور اسلام قبول کرے گی۔اور ایسا ہی ہوا بلکہ اگلی نسل میں تو عظیم سپہ سالار محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے برصغیر میں پہلی بار اسلام کا جھنڈا گاڑا اور آج دنیا کے سب سے زیادہ مسلمان اسی خطے میں آباد ہیں۔ یہ ہے اُمید کی طاقت اور اس کے نتائج۔اُمید کا ذکر ایک اور شخصیت کے بغیر ممکن نہیں۔اور وہ ہیں شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ۔ بیسویں صدی کے شروع میں ہی یہ فلسفی شاعر اندازہ لگا چکے تھے کہ مسلمانوں میں شدید مایوسی پھیل چکی ہے۔اِس مایوسی نے اُن کی قوتِ عمل کو مفلوج کر دیا ہے۔اِس بیماری کا مداوا تب ہی ممکن ہے جب اُن کے سینوں میں مستقبل کی اُمید کے چراغ روشن ہو جائیں۔اُن کی نظر میں اُمید ہی مسلمانوں کو کم مائیگی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

محرومی کے احساس سے نجات دلا سکتی تھی۔ اُمید اُن کے نزدیک کم نظری اور بے عملی کا بہترین علاج تھی۔ اُمید ہی قوموں کو تنزل سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ اُمید کی اہمیت سے واقف تھے بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُمید کا یہ تریاق مسلمانوں کو کہاں سے نصیب ہوگا۔ علامہ اقبالؒ کے مطابق یہ جذبہ مسلمانوں کو نہ تو ہاورڈ (Harvard) سے مل سکتا تھا نہ ہی کیمبرج (Cambridge) سے۔ یہ اُنہیں ملے گا قرآن سے اور رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے۔ اِس لیے اُنہوں نے مسلمانوں کو آمادہ کیا کہ وہ مغرب کی طرف دیکھنا بند کر دیں کیونکہ ایسا کرنے سے اُن میں ناکامی کا احساس بڑھے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان خود بین ہو جائیں قرآن اور سیرت کا بغور مطالعہ کریں تا کہ اُن میں اُمید کا جذبہ بیدار ہو جائے جس کے نتیجہ میں وہ عمل پیہم کی طرف راغب ہوں گے اور ترقی کے نئے راستے اُن کے لیے کُھل جائیں گے۔ اپنی معرکتہ الآرا نظم ''طلوعِ اسلام'' میں علامہ اقبالؒ اُمید کا صُور پھونکنے کے لیے نئی صبح کا استعارہ استعمال کرتے ہیں جو دوسری تہذیبوں اور زبانوں میں بھی اِسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ نظم کے پہلے شعر میں ہی نوید جانفزا دیتے ہیں کہ مسلمان پُر اُمید ہو جائیں کیونکہ اُن کی آب وتاب کا دور پھر سے لوٹ آنے کو ہے۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی

آگے چل کر وہ کہتے ہیں۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

مسلمانوں کو اُمید دلانے کے بعد وہ اُن کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ آخر مسلمانوں کو پُر اُمید کیوں ہونا چاہئے۔ بلکہ اُمید کا جذبہ مسلمانوں میں باقی سب قوموں سے زیادہ طاقتور ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

اللہ کے نبی ﷺ نے مسلمانوں کو پُر اُمید رہنے کی سب سے زیادہ تلقین کی۔ کیونکہ اُن کے ذمہ وہ اسلام کی اشاعت کا کام سونپ گئے تھے۔ رہتی دنیا تک اب اُن کے ہاتھ میں قوموں کی ہدایت اور اصلاح ہے۔ اُنہیں پُر اُمید ہونا ہے کہ اُن کی محنت کے نتیجہ میں لوگ دوزخ کی آگ سے بچ جائیں گے اور پہلے جو کام انبیاؑ کرتے تھے آج اُن کو کرنا ہے۔ علامہ اقبالؒ اِسی نظم میں پُر اُمید لوگوں کی خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں۔ اُمید لوگوں پر اتنے مثبت اثرات مرتب کرتی ہے کہ یہاں اُن کا ذکر کرنا نہایت مناسب ہوگا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ پُر اُمید لوگ اپنے Human Brain کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور پوری طرح سے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ پل میں تولہ پل میں ماشہ نہیں ہوتے، ناکامیوں پر شور نہیں کرتے، روتے دھوتے نہیں اور ہاتھ پیر چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتے۔ اِسی طرح وہ کامیابیوں پر سینہ تان کر نہیں چلتے۔ بلکہ اپنی کامیابی کا اظہار نہایت انکساری سے کرتے ہیں۔ انہیں خودنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دنیا اُن کے لیے عمل کا میدان ہوتی ہے اور اِس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اُنہیں انسانوں سے پذیرائی پانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ پُر اُمید انسانوں کی دو اور خوبیاں علامہ اقبالؒ نے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ رنگ و نسل کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُن کا عمل بنی نوع انسان کے لیے ہوتا ہے وہ کسی ایک خطے، برادری یا مذہب کا سوچ کر کام نہیں کرتے۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ اُن کے عمل سے سب کو فائدہ پہنچے۔ اُمید ان کے دل میں انسانیت سے محبت اور ہمدردی پیدا کر دیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ انسانیت کی محبت کو ایسا نشہ کہتے ہیں کہ جو انسان کو شراب پیئے بغیر مست رکھتا ہے۔ وہ انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ اُمید کی شراب پیو اور انسانیت کی محبت کا لطف اٹھاؤ۔

پُر اُمید لوگوں کی دوسری اہم خوبی علامہ اقبالؒ کے نزدیک اُن کا مادیت سے آزاد ہونا ہے۔ پُر اُمید انسان دولت جمع کرنے کی دوڑ میں شریک نہیں ہوتے۔ مادی اشیاء کا شوق اُن کے دل میں موجزن نہیں ہوتا۔ وہ حرص اور طمع سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی مادی چیز ایسی نہیں جو اُن کی توجہ کا مرکز بنے۔ نہ گھر، نہ گاڑی، نہ زر، نہ زمین۔ مادی اشیاء سے بے اعتنائی اُنہیں غنی کر دیتی ہے۔ ہوس کا فقدان ایسی دولت ہے جس کے آگے قارون کا خزانہ بھی ہیچ نظر آتا ہے اور پُر اُمید انسان اس دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے مغربی دنیا مسلمانوں کے خلاف جاری نفسیاتی جنگ میں اُمید کو بطور ہتھیار استعمال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

کرتی آرہی ہے۔ جب سے مسلمان مغرب کے زیرِتسلط آئے ہیں اُن کی اُمید کوختم کرنے کی کامیاب سازشیں جاری ہیں۔ مغرب کواحساس ہے کہ مسلمان ایک شاندار ماضی رکھتے ہیں اور اُمید کے پیدا ہوتے ہی وہ اپنی سطوت اور مقام دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ مسلمانوں میں بالعموم اُمید کومٹانے کے لیے مغرب میں تحقیق کے ادارے اور تھنک ٹینک کام کرتے ہیں۔ اُن کا کام ایسے طریقے دریافت کرنا ہے جن کی بدولت مسلمانوں کو پُر اُمید ہونے سے روکا جاسکے۔ اِس مقصد کے لیے استعمال ہونے والے دو موثر ترین ہتھیار ہیں: نظامِ تعلیم اور ذرائع ابلاغ۔

مغرب کے ماہرینِ نفسیات جانتے ہیں کہ دماغ کے سوچنے کی صلاحیت ختم کرکے اُمید کا چراغ بآسانی گُل کیا جاسکتا ہے۔ آخر یہ دماغ کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ دل کے ساتھ مکالمہ کرے اور اپنی ذات کا مشاہدہ اور تجزیہ کرکے نتیجہ اخذ کرائے کہ کہیں اُمید مایوسی میں نہ بدل چکی ہو۔ اِس عمل کو روکنے کے لیے اگر دماغ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کرلیا جائے تو اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ مسلمان ممالک میں ایسا طریقۂ تعلیم پہلے متعارف کرایا گیا اور پھر اُس کو پھیلا دیا گیا جس کی بدولت انسان سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

اِس طریقۂ کار کے تحت مسلمان بچوں کو صرف یاد کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اُنہیں سوچنے کا موقع نہیں ملتا۔ طلباء اور طالبات اچھے نمبر لے کر اچھی نوکری کے چکر میں رہتے ہیں اور اچھے نمبر یاد کرنے سے آتے ہیں سوچنے سے نہیں۔ نتیجتاً بیشتر مسلم ممالک کا نظامِ تعلیم سوچ کے عمل کو بیدار نہیں کرتا۔ اِس لیے آج کا تعلیم یافتہ مسلم نوجوان اُمید کے ناپید ہونے کی وجہ سے خودغرضی اور مایوسی کا شکار ہے۔ جس نفسانفسی کا سامنا ہم مسلم معاشرے میں کرتے ہیں وہ ہمیں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اُمید کا دامن چھوڑنے کے بعد مسلمان آج کے لیے زندہ ہیں۔ اور ایسے مسلمان بھی بہت ہیں جو آج میں رہنے کے قابل بھی نہیں رہے بلکہ وہ ماضی کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اُنہیں کوئی اُمید نظر نہیں آتی اور نہ ہی اُن کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ اُمید کی شمع روشن کرسکیں۔

مسلمانوں کے خلاف نفسیاتی جنگ کا دوسرا بڑا اور طاقتور حربہ ہے ذرائع ابلاغ۔ آج مسلمان ممالک میں خبریں پہنچانے کا پورا نظام مغربی دنیا کے ہاتھ میں ہے۔ TV سے لے کر اخباروں میں چھپنے والی خبروں تک ایک ایک لفظ پر مغرب کی اجارہ داری ہے۔ جسے مسلمانوں میں نا اُمیدی پھیلانے کے

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُمید

لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ استعمال اتنا بھرپور ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان دنیا میں کہیں بھی خبریں نہیں ہوتیں بلکہ پروپیگنڈہ ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسا کوئی دن نہیں گزرتا جب مسلمانوں کو دکھائی یا پڑھائی جانے والی خبریں ایک نفسیاتی جنگ کا حصہ نہ بنی ہوں۔ اِن خبروں کا مقصد مسلمانوں کو یہ باور کروانا ہوتا ہے کہ مغرب انتہائی طاقتور ہے۔ اُس کا نظام، تہذیب اور قانون بے مثال ہے۔ مغرب سے ٹکر لینے کا کوئی فائدہ نہیں اور بہتر یہی ہے کہ مغربی تسلط پر سر تسلیم خم کر دیا جائے ورنہ مسلمانوں کو مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ یہ پیغامات اور تاثرات تصویروں، خبروں اور تبصروں کی مدد سے اتنے تواتر کے ساتھ دیے جا رہے ہیں کہ آج ہر وہ گھرانہ جہاں روزانہ دو گھنٹے سے زیادہ TV چلتا ہے اِس بات پر من وعن ایمان لا چکا ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ بدقسمتی سے میڈیا کی سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ نااُمیدی انسانی سوچ کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ انسان کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اُس کی مایوسی انسانی نفسیات کا عمیق مشاہدہ کرنے کے بعد نہایت چالاکی سے پیدا کی جا رہی ہے اور اُس کے جذبات میڈیا کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی ہیں۔

یہ ایک خطرناک صورتِ حال ہے۔ اب مسلمان کہتے تو وہی ہیں جو TV پر دیکھتے ہیں لیکن گمان یہ کرتے ہیں کہ یہ اُن کا اپنا تجزیہ ہے۔ اُن کی مایوسی میڈیا سے حاصل ہونے والی معلومات سے جنم لیتی ہے لیکن وہ مسلسل اس خوش فہمی کا شکار رہتے ہیں۔ کہ نااُمیدی اُن کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔ اُن کے دماغ میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ جن ذرائع سے وہ معلومات اکٹھی کر رہے ہیں وہ اُن کے اپنے نہیں۔ میڈیا اُمید کا چراغ بُجھانے کو یا تو مایوسی پیدا کرتا ہے یا پھر وہ سہارا لیتا ہے خوف کا۔ یہ دونوں جذبے اُمید کو ایسے چاٹ جاتے ہیں جیسے تیزاب لوہے کو گلا دیتا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے مسلمانوں کی شخصیت پر مغربی تعلیم کے منفی اثرات کے بارے میں کہا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کالج مسلمان نوجوانوں میں دو چیزیں پیدا کرتا ہے۔ مایوسی یعنی غم اور خوف۔ آج اتنے سال بعد بھی یہ شعر حالات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ آج ہمیں ایک ایسے ہی شعر کی ضرورت ہے جو میڈیا کے زہریلے اثرات کو اجاگر کر سکے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو ٹی وی کی نہ سوجھی

جب تک مسلمان اپنے نظامِ تعلیم کو اپنی دینی اور ثقافتی قدروں کی روشنی میں مرتب نہیں کریں گے اور جب تک وہ مغربی میڈیا سے جان نہیں چھڑائیں گے اُمید کا دامن اُن کے ہاتھ نہیں آئے گا اور وہ غم اور خوف کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۲. خوف

کوہِ طور پر اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ پہلے اُن کا عصا ایک اژدھا بن گیا۔ اُس کے بعد اُن کا ہاتھ چمکنے لگا۔ یہ دکھانے کے بعد اللہ نے اُنہیں حکم دیا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں اور اُسے سمجھائیں۔ یہ سُن کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں خوف اُمنڈ آیا۔ اُنہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ فرعون طاقتور بادشاہ ہے کہیں اُنہیں نقصان نہ پہنچائے۔ اللہ نے اُن کا خوف رفع کر دیا۔ اللہ نے اُن کو یقین دلایا کہ اللہ کی مدد کے ہوتے ہوئے اُنہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں پہنچے اور معجزات دکھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اعلان کیا۔ فرعون نے جب اپنے علاوہ کسی اور کے حاکم ہونے کا سُنا تو اُسے اپنی حکومت اور طاقت کے جانے کا خوف پیدا ہو گیا۔ اِس خوف کی وجہ سے اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے دربار میں بیٹھے سرداروں اور عمائدین کو سمجھایا کہ اِس آدمی کا اصل مقصد تمہارے علاقوں اور اختیارات پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ تم سب کو مصر سے نکال باہر کرے گا اور ملک کا حاکم بن جائے گا۔ یہ سن کر فرعون کے مصاحب خوف زدہ ہو گئے۔ وہ حضرت موسیٰؑ کی باتیں کیا سمجھتے۔ اُنہیں تو اِس خوف نے آن دبوچا کہ اُن کے خلاف ایک خطرناک سازش ہو رہی تھی۔ فرعون نے جادوگروں کو بلایا تاکہ وہ موسیٰؑ سے جادو کا مقابلہ کریں۔ جادوگروں نے اپنے شعبدے دکھائے اور رسیاں چلتی نظر آنے لگیں جیسے وہ سانپ ہوں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ ڈر گئے۔ ایک بار پھر اللہ کی تسلی نے اُن کے خوف کو رفع کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا جو اژدھا بن گیا اور ساری رسیوں کو نگل گیا۔ یہ دیکھ کر جادوگر ایمان لے آئے۔ اتنے لوگوں کے سامنے جادوگروں کا ایمان لانا فرعون کے لیے کافی خوف کا باعث بنا ہو گا کہ کہیں دوسرے لوگ بھی جادوگروں کی طرح اُس کی اطاعت سے آزاد نہ ہو جائیں۔ جس کے بعد اُس کی طاقت خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ اُس نے جادوگروں کو ڈرانے کا فیصلہ کیا۔ ایک بادشاہ کے پاس اپنے عوام کو ڈرانے کے لیے اِس کے علاوہ اور کیا حربے ہوں گے کہ وہ اُن کو معاشی، سماجی اور جسمانی طور پر تکلیف دے اور ناکارہ کر دے۔ اور فرعون نے جادوگروں کو ڈرانے کے لیے یہی کیا۔ اُس نے جادوگروں کو بتایا کہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب ہے فرعون کا عتاب۔ ایسا عتاب جس میں اُنہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

لیکن ایمان کی قوت کے زیرِ اثر جادوگر خوف زدہ نہیں ہوئے۔ وہ ہر قسم کے ڈر سے آزاد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف

کھڑے فرعون کے انتقام کا انتظار کر رہے تھے۔ فرعون کو کسی سے بہت زیادہ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ مالی فروانی تھی اور اُس کی سلطنت پر کبھی کوئی چڑھائی بھی نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے اُس کو کسی دشمن کا خوف ہوتا۔ اُس کے خاندان کے ساڑھے تین ہزار سالہ دورِ حکومت میں کسی انسان سے صرف اُس کو ایک دفعہ خوف محسوس ہوا اور وہ تھا حضرت موسیٰؑ سے۔ ورنہ فرعونوں کو اور اُن کے ساتھ اُن کے عوام کو کوئی حقیقی ڈر تھا تو صرف سیلاب کا۔ تقریباً ہر سال دریائے نیل میں سیلاب آتا تھا جو اُن کی کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیتا۔

خوف انسان کو عجیب عجیب منطقوں اور دلیلوں سے متعارف کراتا ہے۔ اسلام کے آنے سے پہلے تو انسان جس کسی سے خوف زدہ ہوتا اُس کو خدا نہیں تو کم از کم دیوتا ضرور مان لیتا۔ اس کا ایک بت یا شبیہہ بن جاتی اور باقاعدہ پوجا کا آغاز ہو جاتا۔ ہوا کا خدا، پانی کا خدا، آگ کا خدا۔ غرض آپ ایک زرعی ملک کے لوگوں کے خوف کے متعلق سوچیں اور جتنے خوف آپ سوچ سکتے ہیں اُتنے خدا پُرانے زمانے میں انسان نے پال رکھے تھے۔ ہر خوف کا ایک خدا دوسروں سے جُدا۔ دریائے نیل کے سیلاب کا سبب بھی کوئی خدا تھا۔ اور جہاں دیوتا یا خدا کا دخل عمل ہو وہاں کوئی چڑھاوا یا قربانی لازم آتی ہے۔ سو دریا میں طغیانی کو قابو کرنے کے لیے ہر سال ایک دوشیزہ کی قربانی دی جاتی تھی۔ جتنا بڑا خدا، اتنا ہی بڑا نذرانہ۔ یہ فارمولا غالباً ازل سے چلا آ رہا ہے اور سچے مسلمانوں کی غیر موجودگی میں یہ فارمولا ابد تک چلے گا۔ کیونکہ انسان وہی ہے۔ خوف وہی ہیں اور خوف سے نجات کا اِس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہے کہ خوف کو ایک شکل دے دی جائے اور خوف کو خدا مان لیا جائے پھر خوف کے احساس کو کم کرنے کے لیے خدا کو کسی بھی قسم کا مادی تحفہ دیا جائے جو خدا کے چرنوں سے ہوتا ہوا کسی چالاک مجاور یا مذہبی شخصیت کی ہوس کی تسکین کا باعث بن جائے۔ اُس کے بعد جس سال آفت نازل ہو تو اعلیٰ حضرت اُس کا ذمہ دار نذرانے کے پست معیار یا مقدار کی کمی بتائیں اور جس سال آفت نہ آئے تو وہ لوگوں کو خوشخبری سُنائیں کہ دیوتا نے اُن کا نذرانہ قبول کر لیا ہے۔

قدرتی آفتوں کے خوف سے نجات دلانے کے لیے دیوتاؤں کی ایک فوج ظفر موج وجود میں آ گئی جن کے اپنے من پسند نذرانے بھی مقرر ہو گئے۔ کسی کو سونا پسند تھا اور کسی کو گندم۔ یہاں تک کہ دریائے نیل کے دیوتا کے خوف سے نجات کے لیے دوشیزہ کی قربانی سے کم کوئی چیز کارگر نہ ہوتی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف

خوف کے بیوپاری یعنی مذہبی اکابرین ایک نسل سے دوسری نسل تک اپنے کاروبار منظّم کرتے گئے اور یوں پورے پورے مذہبی نظام وجود میں آ گئے۔ ہندوستان کی دیو مالائی داستانوں سے لے کر یونانی صنمیات تک انسانی خوف کو کنٹرول کرنے کے لیے بہت سی مافوق الفطرت شخصیات ملیں گی۔ اسلام کے پیروکاروں نے بھی دوسرے مذاہب کے مشرکانہ عقائد کی نقل کرتے ہوئے ماضی کے عظیم اکابرین، پیغمبرِ اسلامؐ اور اولیا اللہ سے الوہیت کی صفات منسوب کر کے اپنا ایک جداگانہ ''نظامِ خرافات'' وضع کر لیا جس نے اسلام کے منفرد نظریۂ توحید کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیۓ
وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لاالہ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیۓ

اسلام کے آنے پر مکّہ کے مشرکین کم و بیش ۳۰۰ سے زیادہ خداؤں یا دیوتاؤں کے پجاری تھے۔ ہر ایک خوف کا ایک خدا۔ ہر خدا کا ایک بُت اور یہ سارے بُت رکھے تھے خانۂ کعبہ میں۔ مکّہ کے لوگ تجارت کرتے تھے۔ تاجر لوگ کافی مال لے کر لمبے لمبے سفر کرتے۔ مال و دولت کا خوف تو ویسے ہی بہت طاقتور ہوتا ہے پھر مکّہ والوں کے تجارتی سفر بھی لمبے ہوتے تھے اور خطرناک بھی۔ اُنہیں ہر تجارتی سفر سے پہلے بہت سے خوف لاحق ہو جاتے تھے۔ کہیں ڈاکہ نہ پڑ جائے، اُونٹ نہ کم ہو جائیں۔ راستے میں بیماری نہ آن دبوچے، خسارہ نہ ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔ ایک تو مکّہ والوں کو اپنے تجارتی خوفوں کو کم کرنے کے لیے بہت سے خداؤں کی ضرورت تھی۔ دوسرے اُن کے شہر مکّہ میں موجود حرم کی عمارت صدیوں سے علاقے کے بتوں کے لیے محفوظ مرکز کا کام دیتی تھی۔ اردگرد کے قبائل اپنے خداوں کے بُت محترم جگہ پر رکھنا پسند کرتے تھے اور خانۂ کعبہ سے زیادہ قابلِ احترام جگہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہر سال مختلف قبائل اپنے اپنے خداؤں کو نذرانے دینے آتے اور کئی کئی دن قیام کرتے۔ اِس دوران وہ مکّہ میں خریداری بھی کرتے اور اپنے نذرانے بھی مکہ والوں کے حوالے کر دیتے۔ مکّہ والوں نے دوسرے قبائل کے بتوں کی بھی پرستش شروع کر دی تھی۔ جو احتراماً کم اور خوف کی وجہ سے زیادہ ہوتی۔ اُنہیں خوف تھا کہ اگر اُنہوں نے اُن بتوں کو اپنے خداؤں جیسا مقام نہ دیا تو کہیں وہ اپنے بُت اُٹھا کر نہ لے جائیں اور اِس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صورت میں اُنہیں اچھا خاصا تجارتی خسارہ ہونے کا اندیشہ تھا۔

مختصر یہ کہ اپنے تجارتی قافلوں سے وابستہ خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے بتوں کی پرستش کرتے اور دوسروں کی ناراضگی سے پیدا ہونے والے تجارتی خسارے کے خوف سے وہ اُن کے بتوں کی بھی خوب دیکھ بھال کرتے۔ یوں کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کی تعداد کئی سو تک پہنچ گئی۔ اُنہی بُت پرستوں میں سے ایک تھے عمرؓ بن خطاب۔ وہ سمجھدار تھے اور تاجر برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام میں ایک خدا کی عبادت کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گئے۔ اِس کا مطلب تھا تجارتی خسارہ۔ اُنہیں رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے مکّہ کا ایک خوشحال معاشرہ تباہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اُنہیں خوف تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اِس نئے دین کے باعث مکّہ میں ایسا شدید مالی بحران پیدا ہوگا کہ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ اِسی معاشی خوف کی وجہ سے اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اتنی شدید مخالفت کی تھی۔ اور کچھ بھی ہو یہ بات حضرت عمرؓ کی دور اندیشی اور فراست کو ظاہر کرتی ہے۔ بہر حال اللہ کا نبی ﷺ کسی کے ایمان لے آنے کی دعا مانگے اور اللہ وہ قبول نہ کرے ایسا ممکن نہیں۔ حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے۔ اسلام کے دل میں گھر کرتے ہی خوف کے تمام بُت ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اُنہیں یقین ہو گیا کہ جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اللہ کا خوف ہر خوف سے نجات عطا کرتا ہے اور اِس یقین نے اُن کو ہر خوف اور اندیشہ سے آزاد کر دیا۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

ہر سو دوآں کش زدرِ خویش براند
وآنزا کہ بخواند، بہ درِ کس نہ دواند

(وہ جسے اپنے آستاں سے دھتکار دے وہ عمر بھر دردر کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے اور جسے اُس کا آستاں نصیب ہو جائے وہ وہ دوسرے ہر آستاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے)

ایک روز حضرت عمرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکّہ سے باہر نکلے راستے میں ایک وادی میں اپنے گھوڑے سے اُترے اور سجدہ ریز ہو گئے۔ دوبارہ گھوڑے پر بیٹھ کر اُنہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''ایک دور تھا جب عمرؓ بڑے بڑے اندیشوں میں گھِرا یہاں بکریاں چراتا تھا اور آج یہ دور ہے کہ اُس کی ذات اور اُس کے رب کے درمیان کوئی حائل نہیں''۔ حضرت عمرؓ کے اِس قول کے ساتھ ہم چلتے ہیں دریائے نیل کے کنارے دوشیزہ کی قربانی کے سلسلہ کی طرف۔

خوف

حضرت عمرؓ کے دور میں مصر فتح ہو کر مسلمانوں کے تسلّط میں آیا۔ اُس سال جب دوشیزہ کی قربانی کا وقت آیا تو ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ چونکہ ابھی تک مقامی آبادی پوری طرح حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئی تھی اِس لیے اُن کا اصرار تھا کہ صدیوں سے دی جانے والی اِس قربانی میں تاخیر نہ کی جائے کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں طغیانی آجائے گی اور کھڑی فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔

مصر کے مسلمان گورنر نے بھانپ لیا کہ مقامی آبادی ایک شدید خوف کا شکار ہے اور وہ اپنے اِس خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ قربانی دینا اشد ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی حکومت کے آنے کے بعد ایک انسانی جان کا ضائع ہونا اور وہ بھی ایسے نامعقول مقصد کے لیے جائز نہ تھا۔ چنانچہ گورنر نے ایک رقعہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے نام لکھ بھیجا۔

حضرت عمرؓ نے جواباً مصر کے گورنر کو ایک خط ارسال کیا۔ جو گورنر کے نام نہ تھا۔ بلکہ وہ مراسلہ تھا دریائے نیل کے نام۔ بھلا انہوں نے اُس مراسلے میں کیا لکھا ہوگا۔ اُس مراسلے میں اُنہوں نے دریائے نیل کو تنبیہ کی کہ وہ لوگوں کو ستانا بند کر دے کیونکہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے اور انسان بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور ایک مخلوق کو قطعی زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کی دوسری مخلوق کو خوف میں مبتلا کرے۔ اِس مراسلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود دریائے نیل میں ایک بار بھی طغیانی نہیں آئی۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب کوئی فرد اپنے خوف پر قابو پالیتا ہے۔

لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ آخر کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے خوف پر قابو نہیں پا سکتا۔ اِس کے لیے ہمیں پہلے دیکھنا ہوگا کہ خوف کب اور کیسے پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول غور طلب ہے: ”ہر انسان فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہ اُس کے ماں باپ ہوتے ہیں جو اُسے مسلمان یا کافر بناتے ہیں“۔

فطرت پر پیدا ہونے کا مطلب ہے کہ وہ بے خوف پیدا ہوتا ہے اُسے کسی سے ڈر نہیں لگتا پھر اُس کے ماں باپ پر ہوتا ہے کہ وہ اُسے کافر بناتے ہیں یعنی بتوں سے ڈراتے ہیں یا مسلمان بنا کر اللہ سے ڈراتے ہیں۔ خوف مذہب کا بنیادی ستون ہے۔ بلکہ انسان کے مذہبی عقیدے کا ٪۶۰ تک کا بوجھ اِس ایک ستون پر ہوتا ہے۔ انسان کی ظاہری حالت کیسی بھی ہو وہ بہت متقی ہو یا قطعی عبادت گزار نہ ہو۔ دراصل اُس کے ایمان کی کسوٹی اُس کے دل میں موجود خوف ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ ظاہری طور پر آزاد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف

فطرت نظر آنے والا فرد دل میں خدا کا بے پناہ خوف رکھتا ہو۔ دوسری طرف لوگوں کو اسلام کی تلقین کرنے والا شخص یہ کام خدا خوفی کی وجہ سے نہ کرتا ہو بلکہ اُسے معاشرہ میں اپنی عزت کے کم ہونے کا خوف ہو جس کا واحد حل اُس نے لوگوں کو تلقین کرنے میں ڈھونڈا ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ بنیادی ستون ماں باپ تعمیر کرتے ہیں۔ وہ صرف خوف کو قبول کرنا جانتا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن اشیاء، افراد اور طاقتوں سے خوف زدہ ہونا شروع کر دیتا ہے جن سے اُس کے ماں باپ یا تو خود ڈریں یا پھر اُسے ڈرائیں۔ اگر ماں باپ خود بھی اُس سے ڈرتے ہیں تو زیادہ امکان اِس بات کا ہے کہ بچہ بھی ہمیشہ اُس سے ڈرے گا۔ لیکن اگر ماں باپ خود اللہ سے نہیں ڈرتے اور بچے کو ڈراتے ہیں تو بچے میں آگے چل کر یا تو بغاوت کا مادہ پیدا ہو جائے گا یا پھر وہ اپنے ماں باپ کی طرح منافق ہو گا۔

اب ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماں باپ یہ خوف کس عمر سے پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ جدید طبّی تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے ہی خوف زدہ ہونے کے قابل ہوتا ہے۔ آس پاس کے ماحول میں سخت آواز، کوئی جھگڑا یا ماں کی ذات میں کوئی خوف بچے کو ماں کے پیٹ میں ہی خوف زدہ کر دیتا ہے۔ بچہ اپنے ہاتھ پیر سمیٹ لیتا ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور اُس کے چہرے پر ایک تناؤ مسلّط ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں آنے کے بعد اُس کے خوف زدہ ہونے کی صلاحیت میں کمی نہیں آتی۔

جو بچے ماں کے پیٹ میں خوف زدہ رہے ہوں دنیا میں آ کر اُن بچوں کے مقابلہ میں زیادہ ڈرپوک ہوتے ہیں جنہوں نے ماں کے پیٹ میں پرسکون وقت گزارا ہو۔ جن بچوں نے پیدائش سے پہلے بہت کرخت آوازیں، لڑائی جھگڑا، اونچی آوازیں، میوزک وغیرہ سنا ہو یا وہ خوف زدہ ماں کی اولاد ہوں دنیا میں آتے ہی خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذرا سا شور اُن کو بے چین کر دیتا ہے اور وہ دودھ پیتے پیتے رُک کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے بچے سکون سے سو بھی نہیں سکتے۔ آس پاس کی آوازیں اُن کی نیند میں خلل ڈال دیتی ہیں۔ صرف دروازہ بند ہونے کی آواز اُنہیں سوتے میں ایک جھٹکا دینے کو کافی ہوتی ہے۔ ایسے بچے صرف ایک یا دو گودوں کو پسند کرتے ہیں بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں جانے، یا شور ہنگامے کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ پھر اُنہیں یا تو نیند نہیں آتی اور وہ روتے رہتے ہیں یا پھر اُنہیں دست لگ جاتے ہیں اور وہ دودھ پینا چھوڑ دیتے ہیں۔

خوف

بچے میں کچھ سمجھ پیدا ہوتے ہی ماں باپ دانستہ یا غیر ارادی طور پر اُسے مختلف طریقوں سے خوف زدہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جن باتوں سے ماں باپ دانستہ طور پر ڈراتے ہیں اُن میں سے ہر ایک کا تعلق ذات کے تحفظ کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً ماچس سے مت کھیلو آگ لگ سکتی ہے۔ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ جراثیم لگ جاتے ہیں۔ ذات کے تحفظ کے سلسلہ میں ہی ماں باپ بچے کو سمجھاتے ہیں کہ اگر اُس نے دل لگا کر تعلیم حاصل نہ کی تو وہ غریب رہ جائے گا، ترقی نہ کر سکے گا۔ پھر بچہ اگر محنت کرے تو وہ علم کے حصول کے لیے نہیں بلکہ خوف سے نجات کے لیے ہوتی ہے۔ دوسرا خوف جو ماں باپ دانستہ پیدا کرتے ہیں مذہب اور معاشرت کے زمرے میں آتا ہے۔ ماں باپ سب سے پہلے تو اُسے اُس خدا سے ڈراتے ہیں جس پر اُن کا اپنا یقین ہوتا ہے۔ پھر وہ اُسے ڈراتے ہیں قانون اور معاشرتی اقدار سے جن کو توڑنے پر لوگوں کی حقارت یا تذلیل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ وہ سیدھے ہاتھ سے کھانا کھائیں۔ اب عین ممکن ہے کہ تین لوگ اِس حکم پر عمل کریں اور ایسا کرتے وقت اُن کے اندر تین مختلف خوف موجود ہوں۔

۱۔ سیدھے ہاتھ سے کھانا کھایا کیونکہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا خوف تھا۔

۲۔ کیونکہ اُلٹے ہاتھ سے طہارت کرتے ہیں اور خوف تھا کہ اگر بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا تو جراثیم لگ جائیں گے۔

۳۔ یا پھر یہ خوف کہ آس پاس کے لوگ کیا کہیں گے۔

اِس کے علاوہ ماں باپ غیر ارادی طور پر بھی خوف پیدا کرتے ہیں۔ اُنہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ بچے اُن کا بغور مشاہدہ کر رہے ہیں اور یوں ماں باپ کے خوف بچے میں منتقل ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا بچے پیدائش کے بعد ہی اِس قابل ہوتے ہیں کہ وہ ماں باپ کے رویوں کو دیکھ کر اپنے اندر خوف پیدا کر لیں۔ ماں باپ کو دیکھ کر خوف پیدا کرنے کی فطری کوشش ایک خاص اُصول کے مطابق ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ لڑکا ماں کے خوف کو زیادہ جلدی جذب کرتا ہے اور لڑکی باپ کے خوف کو۔ یہ اللہ کا ایک عجیب نظام ہے۔ ایک سال کا لڑکا بھی اُنہی اشیاء سے خوف زدہ ہوتا ہے جن سے وہ اپنی ماں کو خوف زدہ ہوتے دیکھتا ہے۔ جبکہ اِس عمر کی لڑکی اپنے باپ کو بغور دیکھتی ہے کہ وہ کن چیزوں سے خائف ہے اور وہ اُنہی سے خائف ہوتی ہے۔ چھ سال کی عمر تک ہمارے ۸۰% خوف تخلیق ہو چکے ہوتے ہیں۔ اُس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف

بعد یہی خوف زندگی میں کسی نہ کسی صورت میں ہمارے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔

اگر بچپن میں ہمارے خوف حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو آگے چل کر خوفناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ابتدائی دور میں ان کی کیفیت قابو میں رہتی ہے لیکن حالات اور ابتدائی تربیت سے یہ زیادہ خراب بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کی وجہ سے کئی جسمانی امراض جنم لیتے ہیں اور موت واقع ہو سکتی ہے۔

انسانی خوف چار بنیادی قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ پہلی قسم کا تعلق ہمارے جسم سے ہوتا ہے۔ اِن میں سے سرِفہرست ہیں موت، بیماری اور تکلیف کا خوف۔ بعض لوگ اِس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ اُنہیں کوئی تکلیف پہنچنے والی ہے۔ اُنہیں یہ احساس ہوگا کہ کوئی بیماری اُنہیں تکلیف دے گی یا یہ تکلیف اُنہیں کسی انسان سے پہنچ سکتی ہے۔ یا پھر کسی دوسرے کی غلطی یا مکاری سے۔ اس صورت میں وہ دوسروں سے خبردار رہتے ہیں اور اپنوں کو تنبیہ کرتے رہتے ہیں تاکہ کسی تکلیف کے ملنے کا احتمال نہ رہے۔ بعض اوقات اُنہیں تکلیف سے زیادہ بیماری کا ڈر ہوتا ہے۔ وہ مسلسل نئی نئی بیماریوں کے بارے میں پڑھتے اور سوچتے رہتے ہیں۔ کتنے لوگ کہاں، کس بیماری سے مر گئے اور اِن بیماریوں سے بچنے کے کیا طریقے ہیں یہ اُن کی گفتگو کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ بعض لوگ تکلیف اور بیماری سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا وہ موت سے ڈرتے ہیں۔ وہ مسلسل موت سے بچنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ اُنہیں موت سے بہت شدید خوف محسوس ہوتا ہے جس کا اظہار وہ بہت کم لوگوں سے کرتے ہیں۔ اِس قسم کے خوف دن کے مختلف اوقات میں بڑھتے گھٹتے رہتے ہیں۔ بعض کو یہ خوف صبح اُٹھنے پر زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسروں کو یہ خوف شام کو زیادہ ہو جاتے ہیں جبکہ کچھ کے لیے یہ خوف رات کو بڑھ جاتے ہیں۔

خوف کی دوسری قسم معاشرتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اِن میں سب سے پہلے لوگوں کے ردِعمل کا خوف ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اِس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ لوگ اُن کا مذاق نہ اُڑائیں۔ یا پھر لوگ اُن پر طنز نہ کریں۔ بے عزتی کا خوف بھی مسلسل پریشان کرتا رہتا ہے۔ بعض کو لوگوں کے سامنے بولنے یا تقریر کرنے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک انجانے خوف کا شکار رہتے ہیں۔ یہ انجانا خوف آج کے بڑے شہروں میں بڑھتا جا رہا ہے۔ جہاں انسان دوسرے انسانوں کے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ خوف گھبراہٹ کی صورت میں اکثر اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے اندر تیزابیت، السر وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف

بعض اوقات بڑھ کر جوڑوں کے درد یا دل کے امراض میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ دوسروں کے ردِعمل سے خوف زدہ ہوتے ہیں اِس لیے طاقتور اور امیر کے سامنے دب جاتے ہیں۔ اُن کے انداز میں چاپلوسی اور خوشامد آجاتی ہے۔ اور وہ اُن کے غلام بے دام ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اپنی عزت بڑھانے کے لیے یہ لوگ اپنے رشتہ داروں کی امارت اور اثر و رسوخ کا ذکر اُن کی عدم موجودگی میں دوسروں سے بکثرت کرتے رہتے ہیں۔ اِس کے برعکس کسی غریب، کم رتبہ فرد یا رشتہ دار کے سامنے اُن کی شخصیت یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ خوف سے نکل کر انا پرستی پر مائل ہو جاتے ہیں۔ غریب پر خوب طنز کرتے ہیں۔ اُس میں کیڑے نکالتے ہیں۔ اُن میں تکبّر آجاتا ہے۔ اُن کی گردن اکڑ جاتی ہے۔ اور وہ مدبر اور حاکم بن جاتے ہیں۔ صرف اپنی سُناتے ہیں دوسروں کی نہیں سُنتے۔

معاشرتی خوف کا شکار لوگ ہمیشہ اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں ایسا کرنے کے لیے وہ سماجی کاموں یا سیاست میں سرگرمی دکھاتے ہیں مثلاً یہ لوگ علاقے کے ناظم کا انتخاب لڑتے ہیں یا معاشرے میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تاکہ معاشرتی خوف سے فرار حاصل کر لیں۔ لیکن معاشرتی خوف سے فرار یا نجات حاصل کرنے کے لیے وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اُنہیں مزید معاشرتی خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مثلاً وہ ناظم کا الیکشن لڑتے ہیں اور ایک رتبہ حاصل کر لیتے ہیں لیکن اُن کی یہ خوشی عارضی ہوتی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُنہیں یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ چونکہ بطور ناظم اپنا کام کرنے کی بھرپور اہلیت نہیں رکھتے اِس لیے لوگ اُن کا مذاق اُڑائیں گے۔ چونکہ یہ عہدہ حاصل کرنے میں اُن کا محرک ہی غلط تھا اِس لیے وہ واقعی اِس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اُنہیں گمان ہوتا ہے کہ کہیں اُن کا مذاق اُڑتا ہے اور کہیں تنقید ہوتی ہے اور یوں خوف کے سائے اُن کی شخصیت پر زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔

اب وہ اِس خوف کے خلاف ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس سے بھی اہم عہدے پر فائز ہوں یا وہ اب کسی قومی عہدے کے لیے الیکشن لڑیں۔ اِس خیال کے ساتھ ہی وہ قومی اسمبلی کی نشست کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ پھر وہ وزیر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ اِس لیے کرتے ہیں کہ وہ خود کو نااہل سمجھتے ہیں۔ اُنہیں خود پر بھروسہ نہیں ہوتا اور ڈر لگا رہتا ہے کہ لوگ اُن کا مذاق اُڑائیں گے۔ یا یہ کہ لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنے نااہل ہیں۔ بچپن میں پیدا ہونے والے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف

خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ مسلسل سیاسی اور معاشرتی عمل کا حصہ رہتے ہیں۔کبھی وزیر، کبھی سینٹ کے رکن، کبھی انصاف کمیٹی کے چیئر مین۔غرضیکہ سیاست کے ذریعہ عزت کمانے میں اُن کو موت آجاتی ہے۔لیکن خوف اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

خوف کی ایک قسم وہ ہے جس کی نوعیت مادی ہوتی ہے۔اُن کو مسلسل اپنے روپے پیسے اور دولت کے گھٹنے کا خوف رہتا ہے۔یہ لوگ اپنی عزت کے کم ہونے سے اتنے خوف زدہ نہیں ہوتے جتنا کہ اپنے بینک بیلنس کے گھٹ جانے سے۔اُن کے نزدیک عزت، شہرت، سکون سب دولت اور مال سے نصیب ہوتے ہیں لہٰذا اُن کا نصب العین ہی دولت جمع کرنا ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی کمی اُن کی راتوں کی نیند اُڑا دیتی ہے۔اِن لوگوں کو آپ گھر یا خاندان کی تقریبات میں معمولی سے کپڑے پہنے دیکھیں گے۔عام سماجی موضوعات میں اِن کی دلچسپی اور معلومات برائے نام ہوتی ہیں۔یہ سیاست پر کوئی لمبی چوڑی گفتگو نہیں کرتے۔حکومت کی کسی بات پر اُن کی کوئی رائے ہوتی ہے تو وہ صرف اقتصادی پالیسی کے بارے میں۔اُن کے ساتھ وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔دوسری طرف کاروبار یا پیسے کمانے کے میدان میں قدم رکھتے ہی وہ متحرک ہو جاتے ہیں۔سودے بازی کرتے وقت اُن کے اندر ایک نئی قوت بیدار ہوتی ہے۔پیسے دینے کا سوال ہو تو یہ بیسیوں حیلے بہانے کریں گے۔لیکن اگر اُن کو کسی سے پیسے لینے ہوں تو یہ اُس فرد کا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔اُن کو آمدن کم ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔پیداوار میں کمی، حکومت کی اقتصادی پالیسی میں تبدیلی، یونین کی ہڑتال وغیرہ اُن کو خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

قرآن میں یہ صورتِ حال بہت خوبصورتی سے واضح کی گئی ہے۔انسان خوف کی حالت میں اللہ سے دعائیں کرتا ہے۔اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ اللہ اُسے بیماری سے نجات دلا دے یا طوفان اُس کے گھر کی طرف نہ آئے یا اُسے مالی نقصان نہ ہو۔اُس کی دعا خوف کے ٹلنے تک جاری رہتی ہے۔پھر اُس کا خوف ٹل جاتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی دعاؤں کا سلسلہ اور معافی مانگنے کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے دراصل انسان کو گمان ہوتا ہے کہ اُس کو کاروبار میں نقصان اِس لیے ہو رہا ہے کہ اللہ اُس سے ناراض ہے اور جب تک اللہ ناراض رہے گا دنیا میں کسی نہ کسی نقصان کا اندیشہ رہے گا۔لہٰذا انسان خدا کے خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے خدا کو مختلف قسم کی مادی رشوتیں پیش کرتا ہے۔اگر اِس دوران اُس کا جسمانی، معاشرتی یا معاشی خوف ختم ہو جائے تو اُسے یقین ہوتا ہے کہ یا تو اُس نے خدا کے حضور نذرانہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دے کر خود کو کسی بڑے نقصان سے بچا لیا ہے۔ یا پھر اُس کی ذہانت نے اُسے اُس دنیاوی خوف سے نجات دلائی ہے۔ اُس کی سوچ جو بھی ہو خوف سے باہر آتے ہی وہ اپنی صلاحیتوں پر اتراتا ہے اور دوسروں سے اپنی تعریف کا طالب ہوتا ہے۔ جو لوگ اُس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کریں وہ اُن کے سامنے پھولا نہیں سماتا۔ اگر کوئی اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کرے کہ اُس کی کامیابی یا خوف سے نجات اللہ کا فضلِ خاص ہے تو وہ ایسے شخص سے میل جول تک ختم کر دیتا ہے اور اُن لوگوں کا حلقہ تلاش کرتا ہے جو اُس کی تعریفوں کے پُل باندھیں۔ خدا کا خوف ختم ہونے سے پیدا ہونے والے خوف لامحدود ہوتے ہیں اور جان لیوا بھی۔ بہتر تو یہی ہے کہ ہر قسم کے خوفوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک خدا کا خوف دل میں تازہ رکھا جائے۔ یوں کہیے کہ خدا کا خوف وہ ویکسین ہے جو دوسرے ہر قسم کے خوف سے انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ اِس ویکسین کو خود بھی لگایا جا سکتا ہیں۔ ایسا کرنے سے انسان ہر قسم کے خوف سے پاک رہتا ہے اور اُس کا دل تندرست اور توانا ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

بد قسمتی سے ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا انسان اللہ کو بھول جاتا ہے۔ اُس کے دل میں دوسرے خوف دھیرے دھیرے جگہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے ایک خوف آتا ہے۔ کچھ دنوں بعد دوسرا خوف دل میں داخل ہوتا ہے اور یوں بہت سے خوف دل میں مستقل گھر کر لیتے ہیں اِسی کیفیت کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ:

''اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بُھلا دیا تو اللہ نے اُن کو بُھلا دیا۔''

اللہ کو بُھلا دینے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ کا خوف دل سے نکل گیا۔ ایسا ہونے کی صورت میں انسان خود کو بھول جاتا ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جس کی تفصیل یہاں ضروری ہے۔

انسان گمان کرتا ہے کہ خدا کا خوف اُسے پریشان کیے رکھتا ہے۔ اور اُس کے دائرۂ کار کو محدود کرتا ہے۔ وہ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے خیال میں خدا کا خوف اگر دل سے نکل جائے تو نہ صرف اُس کی تخلیقی صلاحیتیں بڑھ جائیں گی بلکہ وہ جسمانی اور جذباتی طور پر زیادہ صحت مند ہو جائے گا۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا فطرت خلا کو برداشت نہیں کرتی۔ اللہ کا خوف ختم ہونے سے پیدا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف

ہونے والے خلا کو کوئی نہ کوئی اور خوف ضرور پُر کر دیتا ہے۔

انسانی دل اگر متحرک ہو تو یہ جذبات کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ دل جذبات کے لیے ایک مقناطیس کی حیثیت رکھتا ہے۔ پانچ بنیادی جذبات اِس کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ ایسے ذرائع کی تلاش میں رہتا ہے جن کی مدد سے یہ مزید جذبات اپنے اندر سمو سکے۔ اب اگر یہ جذبات انسانی ذہن کی چھلنی سے ہو کر نہ گزریں یا ایسے ماحول اور لوگوں سے حاصل ہونے لگیں جن کے جذبات کا معیار اچھا نہ ہو تو انسانی دل میں مضر جذبات داخل ہو جاتے ہیں۔

اِس صورتِ حال کی ایک مثال شاعری ہے۔ شاعری سو فیصد انسانی جذبات کو اُبھارنے کے کام آتی ہے۔ اِس لیے دل شاعری کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اِس سے اُس کو بہت سی غذا ملتی ہے۔ اِس لیے دل شاعری میں لذت محسوس کرتا ہے اور اِس کی طرف لپکتا ہے۔ اب اگر یہ شاعری خدا خوفی کی حد میں رہے تو دل میں مضر جذبات داخل نہیں ہوتے۔

اِس سلسلے میں ہم دو شاعروں کا موازنہ کرتے ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ کا۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

غالباً غالبؔ نے دنیا کے بہت سے غم پال لیے تھے۔ یہ غم اُنھیں ہلکان کر رہے تھے۔ چونکہ یہ سارے غم ذاتی تھے اس لیے یہ اُن کے اندر مختلف نوعیت کے خوف پیدا کرنے کا موجب بھی بنتے تھے اور آخر کار اُن کی صلاحیتوں کو ناکارہ کر کے رکھ دیتے تھے۔ اِس کے برعکس علامہ اقبالؔ نے بھی ایک شعر میں فکر کا ذکر کیا ہے ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اِس شعر میں بھی ایک خوف ہے لیکن یہ ذاتی نوعیت کا نہیں۔ اِس کا تعلق شاعر کے وطن سے ہے۔ یہ ایک اجتماعی خوف ہے۔ اس کا تعلق جتنا شاعر کی ذات سے ہے اُتنا ہی اُس کے وطن میں بسنے والے باقی لوگوں سے ہے۔ اِس لیے یہ خوف مضر نہیں بلکہ توانا خوف ہے یہ خوف انسان کے خیال میں وسعت پیدا کرے گا اور اُسے عمل پر اُبھارے گا۔ شاعری جذبات کو اُبھارنے میں بنیادی کردار ادا کرتی

خوف

ہے اور جنگ کے دنوں میں زمانۂ قدیم سے ایک جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتی آ رہی ہے جنگ کا اعلان ہونے کے بعد سب سے پہلا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ قوم کو فتح کی اُمید یا شکست کا خوف دلایا جاتا ہے۔

اب اگر انسان کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو تو ایک خلا پیدا ہوتا ہے جسے کسی بھی خوف سے تو بھرنا ہی ہوگا۔ لیکن دل کی ساخت صرف خوفِ خدا کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جیسے بھوک کی حالت میں ایک بلی خراب گوشت تو کھا جائے گی لیکن اِس سے اُس کا پیٹ خراب ہو جائے گا۔ اِسی طرح دل اپنے خوف کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی خوف کو اپنی طرف کھینچ لے گا اور بیمار ہو جائے گا۔ صرف خدا کا خوف ہی دل میں سکون اور اطمینان پیدا کر سکتا ہے۔

اللہ کے خوف کو فراموش کرنے سے جو خوف پیدا ہوتے ہیں وہ واقعتاً انسان کو اپنی ذات سے ہی غافل کر دیتے ہیں۔ مال کا خوف، عزت کا خوف، جان کا خوف، غربت کا خوف وغیرہ۔ اِن خوفوں میں اتنی شدت ہوتی ہے کہ ذات کے علاوہ انسان اپنے خاندان کو بھی بھول جاتا ہے۔ ایسی صورت میں کبھی کبھی پیدا ہونے والا خوف متواتر بن جاتا ہے اب وہ کبھی کبھی نہیں بلکہ مسلسل اُس کے تعاقب میں رہتا ہے۔ اور وسوسے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ وسوسے انسانی دماغ کو ناکارہ کر دیتے ہیں انسان اِن کے زیرِ اثر عجیب و غریب تصورات کو جنم دیتا ہے۔ بے تکی باتیں کرتا ہے اُسے ایسی بہت سی شکلیں اور لوگ نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں جن کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اِس حال کو پہنچے ہوئے انسان کو سمجھانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور چونکہ یہ حالت اگر برسوں نہیں تو مہینوں پر محیط ہوتی ہے۔ اِس لیے خوف انسان کے وجود میں بہت گہرائی تک سرایت کر چکے ہوتے ہیں۔

قرآن میں منافقین کا ذکر ہے جب اللہ کے رسول ﷺ نے اُن سے جہاد میں شرکت کے لیے کہا تو اُنہوں نے اپنے خوف کی وجہ سے معذرت کر لی۔ اِس مقام پر اللہ نے اُنہیں تنبیہ کی ہے کہ دراصل اُنہیں خوف تو دوزخ کی آگ سے ہونا چاہیے۔ دوزخ کی آگ کا خوف بھی عجیب خوف ہے اگر یہ پیدا ہو جائے تو انسان کو سب سے پہلے تو دنیا کے خوفوں سے نجات مل جاتی ہے پھر اُس پر دوزخ کی آگ بھی حرام ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دوزخ کی آگ کا خوف اُس کی زندگی میں وہ انقلاب پیدا کرتا ہے جو اُسے اللہ کے انعامات کا مستحق بنا دیتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۳. انعام

قرآن میں سورۃ الشعراء چھبیسویں سورۃ ہے۔تقریباً سو آیات کے بعد سے اس سورۃ میں ایک ہی اہم مضمون پانچ دفعہ آیا ہے۔ یہ مضمون پانچ آیتوں پر مشتمل ہے۔اِس مضمون کی پہلی آیت میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ فلاں قوم نے اللہ کو جھٹلایا اور اُس کے بعد اگلی چار آیتوں میں اُن انبیاؑء کی تفصیل ہے جو اُن قوموں کی طرف بھیجے گئے ۔ یہ چار آیتیں مشترک ہیں اور اِن میں کوئی فرق نہیں ۔ اور یہی ایک اہم نکتہ ہے۔قرآن میں ایک لفظ بھی غیر ضروری نہیں ۔اِس لیے کسی بات کی تکرار اُس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اِن پانچ انبیاؑء کی اپنی اپنی قوم سے تقریریں اور وہ بھی ایک ہی ترتیب اور دلیل کے ساتھ ظاہر کرتی ہیں کہ قوموں کا مسئلہ اکثر ایک ہی ہوتا ہے۔تاریخ میں مقامات اور تہذیبوں کا فرق تو ہوتا ہے لیکن بنیادی مسائل ازل سے وہی ہیں اور ابد تک وہی رہیں گے۔ مثلاً مسئلہ ہے اللہ کو جھٹلانے کا۔یعنی جانتے بوجھتے ہوئے سرکشی کرنے کا۔اور جب بھی ایسا ہوا اللہ نے اُن لوگوں کی طرف پیغمبر یا صالح لوگ بھیجے جنہوں نے اُنہیں اللہ سے ڈرنے کی تلقین کی۔اُن کی تقریروں کی یکسانیت بتاتی ہے کہ نیک لوگوں کا سرکش لوگوں کو سمجھانے کا طریقہ اللہ کا سکھایا ہوا ہوتا ہے جس کو ہر نبی نے اپنایا۔

جن پانچ قوموں کا ذکر ہمیں سورۃ الشعراء میں اُس مقام پر ملتا ہے وہ ہیں: قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط اور اصحابِ ایکہ۔ اُن کی طرف جو پیغمبر بھیجے گئے وہ ہیں۔ نوحؑ ، ہودؑ ، صالحؑ ، لوطؑ اور شعیبؑ ۔اُن پانچوں نے سب سے پہلے اپنی اپنی قوم سے پوچھا کہ وہ اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے ۔اُن کا یہ سوال ظاہر کرتا ہے کہ دنیاوی خوف، لذتیں اور غم اُن کے خوف خدا پر حاوی آگئے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ اُنہیں صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے کیونکہ صرف اللہ کا خوف ہی اُن کے دل و دماغ میں ایک توازن قائم کر سکتا تھا لیکن اُنہیں ایسا کرنا نہیں تھا اور چونکہ اللہ کا خوف (تقویٰ) ہی اچھی زندگی کی بنیاد ہے اِس لیے انبیاؑء نے سب سے پہلا اور بنیادی سوال ہی یہ کیا کہ وہ لوگ دنیا کے خوفوں سے آزاد ہو کر صرف ایک اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے۔ ظاہر ہے اُن کے اِس سوال کی تکرار پر لوگ چڑ گئے ہوں گے اور اُنہوں نے انبیاؑ سے پوچھا ہوگا کہ یکا یک اُنہیں کیا ہو گیا تھا۔ اُس زمانے میں آبادی کم تھی پھر برادری، اڑوس پڑوس، جان پہچان۔ سبھی لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کسی کا بچپن اور جوانی لوگوں سے چھپے نہ تھے۔ پھر اچانک اگر اُن میں سے ایک فرد اُٹھ کر اُن سے ایک عجیب سا سوال پوچھنا شروع کر دے تو

انعام

لوگوں کو حیرت ہی ہونا تھی۔ پھر اُن کا سوال کسی نئے علم یا دریافت کے بارے میں تو تھا نہیں۔ یہ انبیا اپنی قوم سے ایسی بات پوچھ رہے تھے جس کا جواب وہ سب جانتے تھے لیکن جانتے بوجھتے ہوئے وہ اللہ سے نہیں ڈر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اللہ سے ڈرنے کے نتیجے میں اُن کی طاقت، کاروبار اور حیثیت پر ضرب پڑتی ہوگی۔ پھر اُن لوگوں نے اللہ سے نہ ڈرنا اور دنیاوی خوفوں میں مبتلا رہنا ایک فیشن بنا دیا ہوگا جس کو قوم کے متوسط طبقہ نے خوشی خوشی قبول کر لیا ہوگا۔ یوں معاشرے کے رؤسا اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر جبکہ عوام تقلید کے شوق میں اللہ کے خوف سے آزاد ہوں گے۔ یہ صورت ایسی ہوتی ہے کہ رؤسا اپنے بیٹھنے کو ایک مجلس یا تنظیم بنا لیتے ہیں جہاں بیٹھ کر وہ اپنے اقتدار یا دولت کو بڑھانے کی ترکیبیں سوچتے ہیں۔ کہنے کو تو اُن کے اجلاس کا مقصد عوام کی بھلائی کی ترکیبیں سوچنا ہوتا ہے لیکن دراصل وہ وہاں بیٹھ کر اپنے اقتدار اور دولت کو بڑھانے کی سکیمیں بناتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک عوام کی بھلائی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خود اُن کی طاقت اور دولت میں اضافہ ہو۔ چنانچہ وہاں بیٹھ کر وہ اپنی چالیں سوچتے ہیں جن کی بدولت لوگوں کے دنیاوی خوف میں اضافہ ہو۔ اور یہ اضافہ بھی ایسا ہو کہ اِس میں اضافہ کرنا ایک مشن بن جائے تا کہ لوگ اِن پریشانیوں کو از خود اپنا سکیں۔

مثلاً ایک نئی خوبصورت گھڑی بیچنے کے لیے اگر انسان کے دل میں یہ خوف پیدا کر دیا جائے کہ کسی اچھی تقریب میں وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز اُس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک اُس کی کلائی پر Rolex کی گھڑی نہ ہو تو پھر وہ بے عزتی کے خوف سے گھڑی خریدے گا۔ ظاہر ہے تقریب میں کسی نے تو اُس سے بھی مہنگی گھڑی پہنی ہوگی اور اگر وہ اُس کی نظر سے گزرے گی تو یہ خوف پیدا ہوگا کہ اگر اُس نے یہ گھڑی نہ خریدی تو عزت نہیں ملے گی۔ اور یوں خوف کے باعث گھڑیاں بکنی شروع ہو جاتی ہیں اور یہی حال دوسری مادی اشیاء کا ہے جن کے لیے خوف ایک بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس لیے کسی بھی معاشرے کے بڑے لوگ اپنی طاقت اور دولت کو بڑھانے کے لیے معاشرے میں خوف کو عام کرتے ہیں اور مختلف خوف پالنے کو ایک صحت مند رواج بنا دیتے ہیں۔ یعنی آپ نے جتنے زیادہ خوف اور پریشانیاں پالی ہوں گی آپ اتنے ہی سمجھدار اور پڑھے لکھے تصور ہوں گے۔ پھر اِن پریشانیوں کو کم کرنے کے لیے جتنی زیادہ خریداری کریں گے آپ اتنے ہی زیادہ عملی انسان سمجھے جائیں گے۔

اِس کے برعکس اگر آپ پریشانیوں سے خود کو آزاد کر لیں اور چین وسکون سے بیٹھے رہیں تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

ظاہر ہے کہ پھر کچھ خریدنے یا جمع کرنے کی طلب بھی نہیں ہوگی ۔ اور جب طلب نہیں ہوگی تو آپ بازاروں، دوکانوں اور محفلوں میں بھاگتے دوڑتے بھی نظر نہیں آئیں گے۔ کیونکہ جتنا زیادہ خوف اُتنی زیادہ طلب، جتنی زیادہ طلب اُتنی زیادہ دوڑ دھوپ۔ چنانچہ معاشرے کے وہ لوگ جو خوف کے نہ ہونے کی وجہ سے حرکت میں نہ ہوں ناکارہ اور فضول سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں وہ طبعاً خوف سے آزاد ہوتے ہیں اُن کو دنیاوی پریشانیاں کم ہوتی ہیں اِس لیے اُن کے مزاج میں طلب بھی کم ہوتی ہے۔ جن پانچ انبیاؑ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ لازماً وہ بھی اِسی مزاج کے ہوں گے۔ لوگ اُنہیں بدھو تصور کرتے ہوں گے۔ اُنہیں بے ضرر اور بے عمل سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہوں گے اور اپنی روزمرہ کی پریشانیوں میں سرگرداں رہتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے شام کو فارغ ہو کر ایک آدھ دفعہ اُن انبیاءؑ کو کوئی نصیحت بھی کر دیتے ہوں۔ ورنہ اُن کی سادگی کا مذاق تو اُڑتا ہی ہوگا۔ ظاہر ہے وہ انبیاؑ آگے سے خاموش رہتے ہوں گے کیونکہ ابھی وحی کا سلسلہ شروع نہیں ہوا ہوگا اور اُن کا مشن صرف مشاہدہ تک محدود ہوگا۔ وحی کے بعد اُنہوں نے لوگوں کو سمجھانا شروع کر دیا اِس عجیب سی تبدیلی کو سب لوگوں نے محسوس کیا ہوگا۔ کہاں کل کا سادہ سا، نکما اور خاموش طبع انسان اور کہاں اب وہ رؤسا اور اہلِ ثروت سے سوال کر رہا ہے۔ اور سوال بھی ایسے جو پورے اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے کو زیروزبر کر دیں۔

اللہ کے خوف کا سوال بار بار کرنے پر لوگ پوچھنے لگے کہ اِن انبیاؑ کو اچانک کیا ہوگیا تھا۔ کل تک تو اُن کے منہ میں زبان نہیں تھی۔ اُن کا کہیں آنا جانا نہ تھا مگر آج وہ بے خوف ہو کر ہر محفل میں ہر فرد کے پاس پہنچ جاتے اور یہ عجیب سا سوال کرتے جس کا جواب تو سب کو معلوم تھا لیکن وہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں اپنے دنیاوی خوف اتنے عزیز ہوگئے تھے کہ اللہ کا خوف اِن کے مقابلے میں اہم محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پچھلے انبیاء نے اللہ سے ڈرنے کی ہدایت کی تھی اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے، لیکن دل کو کون سمجھائے۔ کل تک نبی کا ہر خوف سے آزاد ہونا کوئی حیرت کی بات نہ تھی کیونکہ معاشرے میں کچھ سادہ لوح ہمیشہ سے ایسے ہوتے ہیں۔ مسئلہ اُن کے سوال کرنے پر پیدا ہوا۔

اِس کا جواب اگلی آیات میں ہے کہ ''میں اللہ کا نبی ہوں'' اب وحی کا تعارف ہوا ہوگا اور سمجھایا گیا ہوگا کہ وحی کے آنے کے بعد انسان نبی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ''میرے پاس وحی آئی ہے اس لیے میں جسمانی طور پر تو وہی ہوں جو کل تھا لیکن ذہنی، جذباتی اور روحانی طور پر میں ایک اعلیٰ رتبہ پر فائز ہو چکا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

ہوں اور یہ سوال میں تمہیں اپنے اِس نئے رتبے کے حوالے سے ہی پوچھ رہا ہوں اس رتبے پر فائز ہونے کے بعد اب میری ذمہ داری ہے کہ میں تمہیں دو باتیں واضح طور پر بتا دوں پہلی بات تو یہ کہ اللہ سے ڈرو اور دوسری یہ کہ میری اطاعت کرو'۔ اب یہاں سے لوگوں کے لیے مسئلہ اور ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ اللہ کا تصور تو بہر حال اُن کی کتابوں اور روایات وغیرہ میں ملتا ہے۔ تکلیف اور حیرت تب ہوتی ہے جب ایک عام سا فرد اُنہیں اپنی اطاعت کرنے کو کہتا ہے۔ اگر اطاعت کروانے کا یہ مطالبہ شہر کا کوئی رئیس یا حاکم کرے تو کوئی بات نہیں۔ لوگ اُس کی اطاعت کے حکم کو سر آنکھوں پر لیں گے۔ لیکن یہ مطالبہ اگر کوئی عام آدمی کرے تو لوگ اُسے تسلیم نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

لوگ رئیس اور طاقتور کا موازنہ اپنی ذات سے کرتے ہیں اُس کے پاس طاقت اور دولت اُن سے زیادہ ہے۔ چنانچہ وہ گمان کرتے ہیں کہ بڑوں کی اطاعت کا فائدہ اُنہیں ہی پہنچ سکتا ہے۔ وہ اِس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ طاقتور اور رئیس اُن سے مدد مانگ رہا ہے تاکہ وہ عوام کو فائدہ پہنچا سکے۔ اُنہیں محسوس ہوتا ہے کہ طاقتور کی اطاعت کا اجر اُنہیں بھی ملے گا طاقت اور دولت پانی کی مانند ہیں جیسے پانی اُونچائی سے نشیب کی طرف بہتا ہے ویسے ہی طاقت اور دولت نیچے کی طرف آتے ہیں۔ اگر لوگ حاکم اور رئیس کی اطاعت کریں گے تو طاقت اور دولت کے بند کھُل جائیں گے۔ اور دولت اور طاقت اونچائی سے نشیب کی طرف، طاقتور سے کمزور کی طرف، امیر سے غریب کی طرف بہنا شروع کر دیں گی۔ اِس اجر کا سوچ کر وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں، حاکم اور رئیس کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں اور پھر خاموشی سے اجر کا انتظار کرتے ہیں۔

جبکہ ایک سادہ مزاج، عام سے نبی کے پاس دینے کو نہ طاقت ہوتی ہے نہ دولت۔ لوگ اُس کی اطاعت کے صلہ کا سوچتے ہیں۔ وہ اندازہ لگاتے ہیں کہ ڈھلوان کس طرف ہے۔ پانی کس طرف بہنے کا امکان ہے۔ جب اُنہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اُنہیں تو کوئی اجر اِس فرد سے نہیں ملے گا تو پھر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ فرد ڈھلوان پر ہے۔ اُس کی اطاعت کا اجر اُسے ہی ملے گا۔ یہ مزید طاقتور ہو جائے گا۔ اُس کی اطاعت کرنے سے دولت اُن کے ہاتھ سے نکل کر اُس کے پاس چلی جائے گی جو گھاٹے کا سودا ہے۔ لہٰذا لوگ نبی کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں۔ اِن پانچوں انبیاءؑ کو جن کا ذکر سورۃ الشعراء میں آیا ہے اِسی یکساں صورتِ حال کا سامنا تھا۔ لوگ یہ سوچتے رہ گئے کہ اُن کے نبی کو اُن سے کیا فائدہ چاہیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

جو وہ اطاعت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اور اِس کا جواب پانچوں انبیاءؑ نے ایک ہی دیا۔ یعنی اُن کا اجر اللہ کے پاس تھا۔ کوئی ذی حیات اُن کے کام کا اجر نہیں دے سکتا تھا۔ یہ اجر ہمارے پانچ بنیادی جذبات میں سے ایک اہم جذبہ ہے۔ بلکہ ہماری تحقیق کے مطابق قرآن میں جتنا ذکر اس ایک بنیادی جذبے کا آیا ہے باقی کے چار جذبات کا نہیں۔ یہاں تک کہ اس جذبے کو بیان کرنے کے لیے قرآن میں چار سے زیادہ مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہ جذبہ قرآن میں کن کن الفاظ اور پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ لیکن پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اجر کا ذکر قرآن میں اِس قدر کیوں آیا ہے۔ اور کیوں یہ بنیادی جذبہ اتنی اہمیت کا حامل ہے؟

اِس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ انسان مٹی سے بنا ہے۔ یہ مٹی سڑے ہوئے گارے کی شکل میں تھی جس سے انسان پیدا کیا گیا۔ مٹی کو سڑے ہوئے گارے میں تبدیل ہونے کے لیے کسی مائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ ہر شے کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے اور اگر انسان کے جسم کو دیکھیں تو وہاں بھی ۷۰ فیصد پانی ہی ملتا ہے۔ اِس لیے پانی نے مٹی کو سڑے ہوئے گارے میں تبدیل کیا ہوگا۔ مٹی اور پانی کے ملاپ سے جو مادہ وجود میں آیا وہ جب سڑ گیا تو اُس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔ بطور خلیفۃ اللہ انسان کا رتبہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اُس کی تخلیق میں کام آنے والی کرۂ ارض کی دو حقیر ترین چیزیں ہیں۔ یا یوں کہیے کہ زمین پر سب سے زیادہ یہی چیزیں پائی جاتی ہیں یعنی پانی اور مٹی۔

میٹھے پانی کی کم یابی نے پھر بھی پانی کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے لیکن مٹی تو انتہائی غیر اہم چیز ہے۔ مٹی سے زیادہ اہم تو وہ معدنی وسائل ہیں جو اُس میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ مٹی سے اُگنے والے اجناس اور فصلیں زیادہ قیمتی ہیں اُس مٹی سے جس میں وہ اُگتے ہیں۔ مٹی کی اہمیت اُس کی افادیت یا ساخت سے بنتی ہے۔ کسان کے لیے مٹی کی اہمیت تب ہوتی ہے جب وہ اُسے فصل اُگانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ زمین کا ایک ٹکڑا جسے لوگ پیروں تلے روندتے ہیں کسان کے وہاں بیج بونے کے فیصلہ سے اپنی حیثیت تبدیل کر لیتا ہے۔ اب کسان بڑی محنت سے مٹی میں ہل چلائے گا پھر بیج بوئے گا اور جس مٹی میں جانور گھنٹوں لوٹ پوٹ ہوتے تھے وہاں اب کسی انسان کو بھی قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی یوں مٹی اپنے استعمال کے حوالے سے اپنی اہمیت پاتی یا کھوتی ہے۔ یہی صورتِ حال کمہار کے پاس رکھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

مٹی کے ڈھیر کی ہوگی۔ اِس انبار پر بچے کھیلتے ہیں، ایک دوسرے پر مٹی کے ڈھیلے پھینکتے ہیں اور کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔لیکن ایک دفعہ کمہار اس مٹی کو گھڑے یا گلاس میں تبدیل کر دیتا ہے تو پھر کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اِسے ہاتھ بھی لگائے۔ وہ اُن مٹی کے برتنوں کو نہایت حفاظت سے رکھتا ہے اور ان کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔مٹی کی ایک شکل نمودار ہوتے ہی مٹی کی اہمیت میں کئی سو گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔آپ اِس حوالے سے مٹی کو دوسری ہر دھات سے مختلف پائیں گے۔مثلاً مٹی کا موازنہ سونے سے کریں۔سونا اگر ہار یا کنگن کی صورت میں نہ ہو تو بھی قیمتی ہے۔اور تجوری میں ہی رکھا جاتا ہے۔ایک فرد اپنی تجوری کھول کر اُس میں پڑی سونے کی اینٹوں کو دیکھ سکتا ہے۔جس سے اُس کی دولت کا اندازہ ہوتا ہے۔دُنیا کی تقریباً ہر دھات نکلتی تو مٹی سے ہی ہے لیکن خام حالت میں بھی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ بلکہ اگر سونے کا ذکر کریں تو سونا خام حالت میں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ کیونکہ خام یا خالص سونا زیور بنانے کے کام نہیں آ سکتا۔ ایسا کرنے کے لیے اُس میں کسی اور دھات کی آمیزش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ایسا کرنے سے سونا ایک شکل تو اختیار کر لیتا ہے لیکن اُس کی خاصیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔اس کے برعکس مٹی اپنی خام حالت میں کوئی وقعت نہیں رکھتی اور کسی کام میں استعمال ہو کر یا کسی خاص شکل میں آنے کے بعد اپنی قدر و منزلت حاصل کرتی ہے۔یعنی مٹی کو خود نمائی یا اپنی خودی کے اظہار کے لیے ایک خاص شکل یا مقصد حاصل کرنا پڑتا ہے۔کسی مقصد، کسی منزل، کسی روپ، کسی لذت کے حصول کے بغیر مٹی کا بنا انسان خود کو کمتر اور نامکمل سمجھتا ہے۔اِسی کمی کا احساس انسان میں اپنی پیدائش کے دن سے موجود ہوتا ہے۔اسی لیے زمین و آسمان کو تخلیق کیا تو اللہ نے اپنی بنائی ہوئی ہر شے سے پوچھا کہ خلیفۃ اللہ فی الارض کا رتبہ کون پانا چاہتا ہے۔کون اللہ تعالیٰ کی حدود کو دنیا میں نافذ کرنے کا ذمہ لینا چاہتا ہے۔کون یہ نیا مگر اہم کام سرانجام دینے کا خواہش مند ہے۔اب اندازہ لگائیے کہ وہاں فرشتوں اور جنوں کے علاوہ ستارے، سیارے، پہاڑ، درخت، سمندر سب ہی موجود تھے اللہ کا یہ اعلان اللہ کی بنائی ہوئی ہر شے نے سُنا۔لیکن اِس نئے اور مشکل کام کو کرنے کا ذمہ صرف انسان نے لیا۔کیونکہ صرف انسان کو یہ احساس تھا کہ وہ مٹی سے بنا ہے اور اُسے کوئی ایسا کام کرنا ہے جس کی وجہ سے اُس کی حیثیت یا اہمیت میں اضافہ ہو جائے۔

انسان کی یہ خواہش ہمیشہ منفی سوچ کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ایک اسکیم کا حصہ ہے۔اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا ہی اِس لیے کیا ہے کہ وہ اپنی پیدائش کے حقیر ہونے کا ادراک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

کرے اور کسی بڑے کام کو کرنے کی کوشش کرے۔ اگر انسان مٹی سے نہ بنا ہوتا یا فرض کریں سونے سے بنایا جاتا تو وہ اپنے آپ کو خام رکھ کر خالص رہنے کی کوشش کرتا اُسے احساس ہوتا کہ اُس کی اہمیت خام حالت میں زیادہ ہے۔ اِس سوچ کی وجہ سے دنیا میں حرکت ختم ہو جاتی یا یوں کہیں کہ عمل ناپید ہوتا۔ اور جیسے کہ علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں عمل سے زندگی بنتی ہے اور مٹی کی پیدائش ہی انسان کو عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ کڑی کچھ یوں بنتی ہے۔ مٹی سے پیدائش، عمل کی طرف رغبت، عمل سے زندگی میں انقلاب اور رونق۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

آپ اِس ساری گفتگو کو انسان کے عائلی اور خاندانی نظام کی روشنی میں دیکھیں۔ بالغ ہوتے ہی انسان میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ شادی کرے اُس کے بچے ہوں اور اُس کا خاندان بڑھے اِس مقصد کے لیے وہ اپنا گھر بار ترتیب دیتا ہے۔ شادی کی کوشش کرتا ہے پھر شادی ہوتی ہے اور اُس کے بعد اگر کوئی طبی نقص بچہ پیدا کرنے میں رکاوٹ ہو تو انسان اپنے علاج پر لاکھوں روپے خرچ کرتا ہے۔ یہ سارا عمل صرف اس لیے کہ زندگی آگے بڑھے۔ بچے کی پیدائش زندگی میں کامیابی کی ایک صورت ہے اِس سے انسان کو اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ بچہ اُس کے لیے ایک ذمہ داری بنتا ہے اُس کی پرورش میں انسان کے اپنے وجود کی ترقی مضمر ہوتی ہے۔ اُسے لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ اُس کی شخصیت کی تکمیل اور ترقی تب ہی ممکن ہے جب وہ بچے کی پرورش کر کے اُسے پروان چڑھائے۔ اِس کے لیے وہ اپنے مالی و جسمانی وسائل وقف کر دیتا ہے۔

اگر انسان مٹی کے علاوہ کسی بھی اور معدنیات سے بنا ہوتا تو وہ خود کو ہی حتمی اور مکمل سمجھتا اُسے عمل سے نفرت ہوتی۔ وہ خود کو عمل میں ڈال کر اپنی ذات کو ختم کرنا پسند نہ کرتا۔ سب سے پہلے تو اُس کی ذات کا قیمتی ہونا ہی اُس کے لیے کافی ہوتا جس کے بعد اُسے کسی عمل کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی اور اگر وہ عمل کرتا بھی تو ایسا کہ جس سے اُس کی ذات میں کوئی کمی نہ آئے۔ یعنی نہ تو اُس کا پیسہ لگے، نہ وقت، نہ طاقت۔ اِس کے برعکس مٹی کا بنا انسان وقت، طاقت اور پیسہ خرچ کر کے اپنی ذات کی تکمیل کرنا چاہتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

ہے۔اب ہم انسان کی تخلیق کے بارے میں ایک اور دلچسپ پہلو دیکھتے ہیں۔جس گارے یا سڑی ہوئی مٹی سے انسان بنا ہے۔اُس میں بعض معدنیات بھی پائی جاتی ہوں گی اور یہ معدنیات آج بھی ہر انسان کی ذات کا حصہ ہیں۔اُن سب کا ایک مناسب تناسب جسم میں ہونا ضروری ہے۔اُن کی کمی بیشی بہت سی بیماریوں کا باعث بن جاتی ہے۔اِن معدنیات میں سے کچھ یہ ہیں۔

1-Graphite, 2-Sulpher, 3- Phosphorus, 4- Carbon, 5- Iron

اِن معدنیات کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اِن معدنیات کی انسانی ذات میں آمیزش بھی انسانی شخصیت پر مثبت اور منفی اثرات ڈالتی ہے۔ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ انسان معدنیات کی مانند ہوتے ہیں عالمِ کفر میں کسی معدنیات کے منفی اثرات اسلام لانے کے بعد اُس کے مثبت اثرات میں بدل جاتے ہیں۔ چونکہ یہ پانچوں معدنیات انسان میں تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں اِس لیے اُن کے مثبت اور منفی اثرات اُس کی شخصیت میں روزِ اول سے ہی موجود ہوتے ہیں۔اُن پانچوں معدنیات کی مشترکہ خصوصیات پر غور کرنے سے چند اہم انسانی صفات ہمارے سامنے آتی ہیں۔جو انسانی فطرت میں روزِ اول سے ہی موجود ہیں۔اجر یا انعام کے جذبے کو سمجھنے کے لیے ان پانچ معدنیات کے منفی اور مثبت اثرات کا تجزیہ ضروری ہے۔

سب سے اہم منفی اثر جو انسانی شخصیت پر مرتب ہوتا ہے۔ وہ ہے بے صبرا پن۔ یہ معدنیات انسان کو بے صبر بناتی ہیں۔ وہ اپنی خواہش کی تکمیل جلد سے جلد چاہتا ہے۔ان معدنیات کی وجہ سے انسان خواب دیکھتا ہے یا اُس کے دل میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔اور وہ تصورات کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ اُس کے خواب یا تو نظریات سے پھوٹتے ہیں جہاں وہ اپنے پسندیدہ نظریے کو بڑھتے یا گھٹتے دیکھ سکتا ہے یا چیزوں، جگہوں اور لوگوں وغیرہ کے حوالے سے ہوتے ہیں جہاں وہ کسی بھی فرد یا چیز کو بہتر اور کمتر ہوتے دیکھ سکتا ہے۔اِن معدنیات کا ایک منفی اثر یہ ہے کہ انسان غیر مستقل مزاج ہو جاتا ہے۔ وہ ایک کام میں کوئی فائدہ دیکھتا ہے تو پوری قوت کے ساتھ اُس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اِسی دوران اُسے کہیں اور نفع نظر آتا ہے تو وہ پہلا کام چھوڑ کر نئے کام کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔اُس کی خواہشات بہت بڑھ جاتی ہیں۔اگر اُن کی تکمیل نہ ہو تو وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے یعنی اِن معدنیات کے مزید منفی اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔انسان بے قرار ہو جاتا ہے، اور یہ بے قراری اُسے وہمی اور شکی بنا دیتی ہے چھوٹی چھوٹی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فکریں اُسے گھیر لیتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کا انعام یا اجر جلد حاصل ہو جائے وہ ڈرتا ہے کہ دیر ہونے کی صورت میں کہیں اُس کا نفع ضائع نہ ہو جائے۔ اِسی کیفیت کی وجہ سے وہ ڈرپوک ہوتا ہے اور اکثر فکرمند رہتا ہے۔

اب آیئے انسانی شخصیت کے اُن خدوخال کی طرف جن کا تذکرہ قرآن میں ملتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر انسانی شخصیت کے جن منفی پہلوؤں کا ذکر قرآن میں آتا ہے وہ تقریباً وہی ہیں جو اُن پانچ معدنیات کے منفی اثرات پر مشتمل ہیں جن کی کچھ مقدار انسانی شخصیت میں موجود ہے۔ قرآن میں انسان کو کمزور کہا گیا ہے۔ اُس کی یہ کمزوری اُسی بزدلی اور غیر مستقل مزاجی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ انسان کوئی انعام نہ ملنے یا دیر ہونے کی صورت میں بہت دعائیں کرتا ہے یعنی وہ بے قرار ہو جاتا ہے اور جب اُس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے تو پھر وہ کسی نئی خواہش کے پیچھے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ انسان بڑے بڑے ہوائی قلعے بناتا ہے اور پھر اُن کو عملی شکل دینے کے لیے ضرورت سے زیادہ ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔ اِن ذمہ داریوں کو نبھانے میں وہ خودغرض اور تنگ دل ہو جاتا ہے۔ اُسے یہ وہم گھیر لیتا ہے کہ اگر اُس نے دوسروں کی مدد کی یا اپنے مقصد سے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اُس کی خواہش کی تکمیل نہ ہو گی۔

ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان مٹی سے بنا ہے جس میں بعض معدنیات کی آمیزش ہے۔ مٹی نے اُس میں کچھ پانے کی خواہش پیدا کر دی ہے جبکہ معدنیات کی وجہ سے بے قراری، خودغرضی اور فکرمندی اُس کی جبلت کا حصہ ہیں۔ اِس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم پانچویں بنیادی جذبے کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ جذبہ ہے انعام کا۔ انسان انعام چاہتا ہے۔ وہ اپنے کام اور عمل کا اجر چاہتا ہے۔ وہ محنت تو کرتا ہے لیکن انعام پہلے سے طے کر لیتا ہے۔ انعام اُس کا ہدف ہوتا ہے۔ ایک دفعہ انعام نظر آ جائے تو پھر انسان اُس کو پانے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے اور پھر اُس کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ انسان کے لیے انعام وعدے کی شکل میں ہوتا ہے۔ انسان سے وعدہ تو ماضی میں ہوتا ہے لیکن اُسے انعام ملنے کی اُمید مستقبل میں ہوتی ہے۔ مثلاً والدین بچوں سے انعام کا وعدہ کرتے ہیں کہ اگر وہ اُن کی فلاں بات مان لیں تو اُنہیں انعام دیا جائے گا۔ بچے بہت شوق سے پوچھتے ہیں کہ اُنہیں کیا انعام ملے گا۔ اب اگر انعام اُن کی مرضی کا ہو اور اُنہیں اُمید ہو کہ والدین وعدہ پورا کریں گے تو وہ انعام پانے کے لیے کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

ہم رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کی زندگیوں میں اکثر یہ بات دیکھتے ہیں کہ جنگ سے پہلے یا عین معرکے کے دوران صحابہؓ بڑی صاف دلی اور سادگی کے ساتھ اللہ کے نبی ﷺ سے دریافت کرتے تھے کہ اُنہیں اللہ شہادت کا کیا انعام دے گا۔ اور جوں ہی اللہ کے نبی ﷺ اُنہیں جنت کی بشارت دیتے صحابہؓ بے خوف جنگ میں کود پڑتے تھے۔

انسان انعام حاصل کرنے کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل جاتا ہے۔ اگر اُسے یقین ہو کہ یہ انعام اُسے مرنے کے بعد ضرور ملے گا۔ اسلام میں جہاد کا تصور اِسی جذبے پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے تو انسان انعام کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے۔ اُس کے بعد وہ انعام کی لذت کو محسوس کرتا ہے پھر وہ انعام کو حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اِس ارادے میں اُمید کو بھی دخل ہوتا ہے۔ انسان کو اُمید ہوتی ہے کہ اُس کے عمل کے نتیجے میں اُسے انعام ملے گا۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ جو جنت ایک شہید کو انعام میں ملے گی وہ کسی اور کے حصے میں آنے کی نہیں۔ انعام کے حوالے سے چند باتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ انعام اصل میں تو ایک وعدہ اور تصور سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ انعام ہمیں عمل کی طرف راغب کرتا ہے۔ انعام ایک لذت ہے جس کے حصول کی ہم کوشش کرتے ہیں۔ انعام کے لیے کوشش تب ہی ممکن ہے جب انعام کا تصور ہمارے دماغ میں واضح ہو۔ جب ہم ایک بچے سے کہتے ہیں ''اگر تم نے کپڑے بدل لیے تو انعام ملے گا'' وہ انعام کا تصور اپنے دماغ میں واضح کرنے کے لیے پوچھتا ہے ''کیا انعام؟'' اگر آپ اُس کی پسند کی کوئی چیز انعام میں دینے کا وعدہ کریں تو وہ جھٹ سے کپڑے بدلنے چلا جائے گا۔ اُس کے دماغ میں انعام میں ملنے والی شے کی لذت اُس کے لیے جلدی کپڑے بدلنے کی وجہ بنے گی۔ جب تک وہ کپڑے بدل کر آپ کے پاس آ نہیں جاتا انعام کا خیال اُس کے دماغ میں پیوست رہے گا۔ انعام ملتے ہی ماضی میں کیا ہوا وعدہ حقیقت میں تبدیل ہو جائے گا۔ بچہ انعام میں ملنے والی مٹھائی منہ میں رکھے گا۔ مٹھائی زبان پر رکھتے ہی اُسے لذت محسوس ہوگی جو لمحہء موجود میں ہوگی اور مٹھائی کے ختم ہوتے ہی یہ لذت خیال کا حصہ بن جائے گی۔

یعنی کسی کوشش کے نتیجہ میں ملنے والی لذت ایک انعام ہوتی ہے۔ انعام کے ملتے ہی وہ لذت ہمیں میسر آ جاتی ہے۔ ایک ملازم پیشہ فرد سارا مہینہ محنت کرتا ہے کیونکہ اُسے ۳۰ دن بعد ایک انعام ملنا ہوتا ہے۔ تنخواہ حاصل کر کے اُسے ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔ اُس کے بعد وہ پھر پورا مہینہ دوبارہ تنخواہ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

انعام حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ انعام میں ملنے والی لذت کا تصور ہمارے ذہن میں ہونا ضروری ہے۔ اگر بچے کو ہمیشہ انعام میں چند سکے ہی ملتے ہوں جن سے اُس نے من پسند ٹافیاں خریدی ہوں تو وہ انعام میں چند سکے ہی پسند کرے گا۔ اگر اُس کے ذہن میں کرنسی نوٹ کا کوئی تصور نہ ہو یا اُسے احساس ہی نہ ہو کہ کرنسی نوٹ سے بہت زیادہ ٹافیاں خریدی جاتی ہیں تو دس روپے کا نوٹ اُس بچے کے لیے بطور انعام کوئی اہمیت نہیں رکھے گا۔ انعام چونکہ ایک وعدہ ہوتا ہے اِس لیے انعام میں ملنے والی لذت سے واقفیت کے علاوہ اُمید کا ہونا بھی لازمی ہے ممکن ہے بچہ آپ کے ہاتھ میں سکے دیکھے جن کا آپ نے وعدہ کیا ہو۔ بچے کو یہ بھی پتا ہو کہ اِن سکوں سے وہ اپنی پسندیدہ ٹافیاں خرید لے گا لیکن ہوسکتا ہے کہ اُس سے پہلے جھوٹے وعدے کیے گئے ہوں اور اب اُسے کسی وعدے پر اعتبار نہ ہو۔ یعنی اُسے انعام میں ملنے والی لذت کی خواہش تو ہو لیکن اُمید نہ ہو۔

انسانی عمل تین بنیادی جذبوں کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ انعام، لذت اور اُمید۔ اِن تینوں کا تعلق قائم ہو جائے تو انسان کوشش میں لگ جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ لذت کا تصور نہ ہونے سے انعام کا تصور نہیں اُبھرتا اسی طرح اُمید کی غیر موجودگی میں انعام حاصل کرنے کے لیے عمل نہیں ہوتا۔ ایک بات یہاں دہرانا مناسب ہوگا اور وہ یہ کہ اُمید کو کم کرنے میں غم اور خوف اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ غم اور خوف دونوں مل کر یا ان میں سے کسی ایک کی زیادتی اُمید کو ختم کر دیتی ہے اُس کے بعد انسان یا تو عمل سے باز رہتا ہے یا پھر خوف یا غم میں مبتلا ہو کر ایک نیا عمل شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک کاروباری شخص جو اپنے کاروبار کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے کاروبار تباہ ہونے کی صورت میں اُمید ختم کر لیتا ہے اور غم میں ڈوب جاتا ہے اُس کے بعد اگر کاروباری حالات ٹھیک ہو جائیں اور اُس فرد کو دوبارہ کاروباری فائدہ نظر بھی آئے تو غم کی شدت اُسے پر اُمید نہیں ہونے دیتی اور وہ عمل کی طرف راغب نہیں ہوتا۔

انسان کو اِس غم اور خوف کی کیفیت سے نکالنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے کسی انعام کی اُمید دلائی جائے تا کہ وہ مثبت عمل کی طرف راغب ہو۔ اور یہی مثبت تبدیلی پیدا کرنے کے لیے قرآن میں انعام کا ذکر باقی تمام بنیادی جذبوں سے نہ صرف زیادہ آیا ہے بلکہ مختلف پیرایوں میں آیا ہے۔ اللہ نے انعام کے لیے ایک اصطلاح تو اجر کی استعمال کی ہے یعنی عمل کی اُجرت یا صلہ مسلمانوں کو بار بار یہ اُمید دلائی گئی ہے کہ اللہ نیک عمل کا اجر ضائع نہیں کرتا بلکہ کئی گُنا بڑھا کر دیتا ہے۔ اِسی کے لیے قرآن میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

لفظ جزا بھی استعمال ہوا ہے۔اللہ نے نیک عمل کرنے والوں کے لیے جنت کی جزا کا اعلان کیا ہے۔ مسلمانوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ اُن کی نیکیوں کی جزا جنت کے میوے، محل اور لذتیں ہیں اور یہ جزا کبھی نہ ختم ہونے والی ہوگی۔

اگر ہم قرآن کی وہ تمام آیتیں جن میں جنت کے انعام کی بشارتیں آئی ہیں جمع کر لیں تو اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پھر اِس تذکرہ میں وہ احادیث بھی شامل کر لیں جو ہمیں صحاح ستہ میں ملتی ہیں تو اِن انعامات کی تفصیل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ انعام کی بنیادی جذبے کے طور پر اہمیت اور اس کے انسانی شخصیت پر مثبت اثرات کا بغور مطالعہ واضح کرتا ہے کہ قرآن اور حدیث میں اس کا تذکرہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جزا اور اجر کے علاوہ قرآن میں اس جذبے کے لیے رزق، فوز اور نفع کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اِن سب الفاظ کا مفہوم ایک ہی ہے۔ایک انعام کے ملنے کی اُمید سے کیا جانے والا عمل۔ چونکہ قرآن انسان کو بہترین اجر کی طرف مائل کرتا ہے اس لیے یہ بار بار جنت کے اجر کا ذکر کرتا ہے۔ بلکہ قرآن کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کو جنت کے اجر کے لیے پُر اُمید کیا جائے تا کہ وہ دنیا میں اچھے کام کرے۔ اگر دنیا میں انسان جنت کے حوالے سے پُر اُمید ہو جائے تو دنیا اُس کے لیے عمل کرنے کی جگہ بن جاتی ہے اگر انسان کو یقین ہو جائے کہ دنیا میں عمل کرنے سے جنت میں نہ ختم ہونے والا انعام ملے گا تو پھر اُس کے جذبات میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔

لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ ہم نے ذکر کیا تھا کہ ایک تو انسان کا مٹی جیسی حقیر شے سے بنا ہونا ہی اُسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے اور اُسے اپنی ذات کی بہتری کی طرف راغب کرتا ہے دوسرا انسانی ذات میں معدنیات کی آمیزش انسان کو جلد باز بنا دیتی ہیں۔ جب آپ اِن دو کمزوریوں کو یکجا کر لیں تو وہ انسان وجود میں آتا ہے جو انعام تو چاہتا ہے لیکن جلدی، اتنی جلدی کہ اُس کے لیے اُسے دنیا کی زندگی انتظار میں نہ گزارنی پڑے اُسے تھوڑا ہی سہی جو انعام ملنا ہے ابھی اِسی دنیا میں مل جائے۔ اِس طرح دنیا اُس کے لیے جنت کا انعام حاصل کرنے کے لیے عملی میدان نہیں رہتی بلکہ دنیا ہی انعام حاصل کرنے کی جگہ بن جاتی ہیں۔ انسان اپنے اردگرد بہت سے انعامات کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے۔ وہ دنیا میں، دنیا کی لذتوں کو حاصل کرنے کے لیے پُر اُمید ہو کر جدوجہد شروع کر دیتا ہے۔ اور یوں انعام، لذت اور اُمید سب رہتے ہیں لیکن آخرت کا انعام نہیں رہتا۔ کچھ نہیں بدلتا سوائے انعامات کی نوعیت یا وقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انعام

کے۔اللہ انسان کو کچھ وقت کے بعد ابدی انعامات دینا چاہتا ہے اور انسان فوری لیکن تھوڑے وقت تک حاصل ہونے والی لذتوں کو بطور انعام حاصل کرنا چاہتا ہے۔دنیا میں لذتوں کو بطور انعام حاصل کرنے کی کوشش ہی پھر خوف اور غم کو جنم دیتی ہے اور انسان ابدی انعام کا استحقاق کھو دیتا ہے اور دنیاوی انعامات کو حاصل کرنے کے چکر میں غم اور خوف کا شکار ہو جاتا ہے۔انسان کس نوعیت اور کس دورانیے کا انعام حاصل کرنا چاہتا ہے یہ اُس کا اپنا فیصلہ ہے۔اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ یہ لذتیں کیا ہیں جن کو انعام میں پانے کی خواہش انسان اپنے دل میں رکھتا ہے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

14- رغبتیں Aspirations

سمندر میں شدید طوفان آ گیا۔ تیز ہوا اور پانی کی اُونچی اُونچی لہروں نے تباہی مچا دی مچھلیاں سہم کر بڑے پتھروں تلے چُھپ گئیں لیکن ایک چھوٹی سی سیپی کے لیے جائے پناہ کوئی نہ تھی۔ یہ سمندر کی سطح پر اِدھر اُدھر لڑھکتی رہی۔ لڑھکتے لڑھکتے اُس کا منہ کُھل گیا اور ریت کا ایک ذرہ اُس کے اندر چلا گیا۔ سیپی کے اندر کا نرم و گداز بدن اُس ریت کے ذرے سے زخمی ہونے لگا۔ سیپی نے اُس ریت کے ذرے سے بچنے کے لیے اپنے جسم سے ایک خاص قسم کا مادہ خارج کرنا شروع کیا جو اُس ریت کے ذرے کو ہر طرف سے گھیرنے لگا۔ وقت کے ساتھ ریت کا ذرہ اُس مادے سے مکمل طور پر ڈھانپا جا چکا تھا۔ ہم اُسے موتی کہتے ہیں۔ ریت کے ذرے سے لے کر موتی تک کا سفر ایک لمبا اور صبر آزما عمل ہے۔ موتی کی اہمیت کچھ بھی ہو یہ شروع ریت کے ذرے سے ہی ہوتا ہے، اور درحقیقت موتی ایک ذرے کے غلاف کے علاوہ کچھ ہے بھی نہیں۔ انسان کے اندر بھی پانچ جذبات انسان کے دل سے اُس مادے کی طرح خارج ہوتے ہیں جو ذرے پر چپک کر اُسے سیپی کے سینے میں موتی بنا دیتا ہے۔ جذبات بغیر تحریک کے نہ تو وجود میں آتے ہیں نہ ہی اُن کا اخراج ہوتا ہے۔ اُن کے دل میں جمع ہونے کی صورت کوئی تحریک ہوتی ہے۔ ہم جسے ترغیب کا نام دیتے ہیں۔ ترغیب وہ ریت کا ذرہ ہے جو دل میں جذبات کو جنم دیتا ہے۔ انعام، غم، اُمید، لذت اور خوف یہ پانچوں جذبات کسی نہ کسی ترغیب کی بدولت وجود میں آتے ہیں۔

جیسے آگ کا وجود اِس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ کوئی ایندھن ضرور ہے جو اس آگ کو بھڑکا رہا ہے اُسی طرح ہر جذبے کے پیچھے کوئی ترغیب ضرور ہوتی ہے جو اُسے تحریک دیتی ہے۔ بلکہ بعض ترغیبات تو ایک سے زیادہ جذبات کو پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً اولاد انسانی ترغیبات میں سے ایک اہم ترغیب ہے۔ بیشتر والدین کے دل میں اولاد کی ترغیب کے حوالے سے پانچوں جذبات موجود ہوتے ہیں۔ ماں باپ کو اپنی اولاد کی بیماری اور ناکامی کا غم ہوتا ہے اُنہیں اپنی اولاد کی ہنسی، کامیابی اور خدمت سے لذت محسوس ہوتی ہے۔ بچے کی شادی پھر نواسے نواسیوں، پوتے پوتیوں کی پیدائش اُن کے لیے انعام ہوتی ہے۔ اُنہیں اپنی اولاد کی صحت کا خوف ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے بچے کے شاندار مستقبل کے حوالے سے پُراُمید ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی ترغیبات کم ہی ہیں جن کے ساتھ ہمارے پانچوں جذبات وابستہ ہوں اکثر ترغیبات کے ساتھ ہمارے ایک یا دو جذبات ہی منسلک ہوتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترغیبات کو سمجھنے سے ہمیں اپنے بنیادی جذبات کے تجزیہ میں کافی مدد ملتی ہے۔ مثلاً ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر غم لاحق ہے تو کس وجہ سے؟ ہمارے اندر خوف موجود ہے تو کیوں؟ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں کن کن چیزوں سے لذت محسوس ہوتی ہے اور یوں ہمیں خود کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ دنیا کے تمام انسان مٹی سے بنے ہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو اُن معدنیات کے تناسب کا جو ہمارے جسم میں پائی جاتی ہیں۔ اِن معدنیات کی کمی بیشی ہمیں ایک خاص مزاج کا حامل بناتی ہیں۔ پیدائشی طور پر ہمارے وجود میں چند معدنیات کی اضافی مقدار ہوتی ہے وہی ہمارا مزاج یا فطرت بن جاتی ہے۔

چونکہ اِن معدنیات کی تعداد بہت زیادہ نہیں اِس لیے انسانوں کی ترغیبات بھی ازل سے تقریباً ایک سی ہیں اور اُن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ دنیا کے پہلے انسان میں جو معدنیات پائی جاتی تھیں دنیا کے آخری انسان میں بھی وہی معدنیات موجود ہوں گی۔ صرف مقدار کا فرق ہوگا۔ اِسی طرح پہلے انسان سے لے کر آخری انسان کی ترغیبات تک یکساں ہیں۔ صرف مقدار اور ٹیکنالوجی کا فرق ہے۔ مثلاً آپ سواری کو ہی لیجیے۔ انسان کی خواہش ہے کہ اُسے لمبے سفر کے لیے چلنا نہ پڑے۔ یہ اُس میں موجود ایک کمزوری ہے۔ پھر اُس کی دوسری خواہش یہ ہے کہ وہ اپنی منزل پر جلد از جلد پہنچ جائے اُس کی تیسری خواہش سواری کے حوالے سے معاشرے میں نمایاں نظر آنے کی ہے۔ یعنی اُس کی کوشش ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے بغیر پہنچ جائے، جس وسیلے سے وہ سفر کرے وہ تیز ہو، آرام دہ ہو اور پھر اُس کے شایانِ شان بھی ہو۔ اور یوں انسان کی سواری شروع ہی سے ایک اہم ترغیب رہی ہے۔ اب یہ ترغیب بعض لوگوں میں جذبات کو زیادہ شدت سے اور زیادہ مقدار میں جنم دیتی ہے۔ جبکہ دوسرے لوگوں میں سواری کی ترغیب فقط ایک بنیادی جذبے کو جنم دیتی ہے اور اُس میں بھی بہت زیادہ شدت نہیں ہوتی۔ اِس بات کو اگر ہم مزید تفصیل سے دیکھیں تو ہمیں بعض لوگ ایسے نظر آتے ہیں جنہیں ماضی میں اچھی سواری نہ ملنے کا غم ہوتا ہے۔ اُنہیں اِس بات پر غصہ آتا ہے کہ اُن کے حریف کے پاس اُن سے اچھی گاڑی ہے۔ گاڑی میں بیٹھ کر اُنہیں لذت محسوس ہوتی ہے اور اُمید ہوتی ہے کہ اُنہیں مستقبل میں کوئی شاندار گاڑی ملے۔

یہی رغبت بعض لوگوں میں نہایت قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ اُنہیں پہلے اچھی سواری نہ ملنے کا کوئی غم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اُنہیں وقتی طور پر سواری سے لذت ملتی ہو اور یہ لذت بھی شدید نہ ہو۔ ماضی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رغبتیں

سے اب تک فرق سواری کی قسم کا ہے۔ ماضی میں لوگ سواری کے لیے جانور استعمال کرتے تھے اور اُن میں سرفہرست گھوڑا تھا اچھی نسل کا گھوڑا اپنے اندر بہت زیادہ رغبت رکھتا تھا۔ گاڑی کی ایجاد کے بعد اچھی گاڑی نے گھوڑے کی جگہ لے لی۔ اب تو سواری کی رغبت میں دوسری اقسام بھی شامل ہوگئی ہیں۔ مثلاً ہوائی جہاز، موٹر سائیکل، بحری جہاز یا کشتی وغیرہ۔

جس طرح ایندھن کے بغیر آگ کا تصور نہیں اُسی طرح رغبت کے بغیر جذبات کا وجود ممکن نہیں۔ رغبت ہی جذبے کو جنم دیتی ہے اور جذبات رغبت سے ہی وابستہ ہوتے ہیں۔ جن ترغیبات کی وجہ سے انسانی شخصیت میں جذبات جنم لیتے ہیں اُن کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔ انسانی نفسیات سے وابستہ ۲۷ ترغیبات قرآن میں مذکور ہیں اور انہی ۲۷ ترغیبات کی بدولت جذبات جنم لیتے ہیں۔

مثلاً حسد کو لیجیے۔ یہ کوئی بنیادی جذبہ نہیں بلکہ یہ خوف یا غم کی وجہ سے پیدا ہونے والا جذبہ ہے۔ یعنی حسد ایک ثانوی جذبہ ہے۔ سواری کی ترغیب کو ہی دوبارہ لیجیے۔ کسی اور کے پاس اچھی گاڑی دیکھ کر ہمیں غم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس یہ گاڑی کیوں نہیں اور یہی غم ہمیں گاڑی کے مالک کے ساتھ حسد میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تو بات یہ ہوئی کہ حسد ہمیں اُس فرد سے ہوتا ہے جس کے پاس ہم سے بہتر چیز ہو۔ یعنی پہلے ہم غم میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر غم حسد کو جنم دیتا ہے۔ لیکن حسد پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جس ترغیب میں کوئی دوسرا ہم سے بہتر ہے، ہمارے لیے بھی وہی ترغیب اہم ہو۔ ہم مثال دیتے ہیں میاں بیوی کی جو کسی کے گھر دعوت پر جاتے ہیں وہاں اُن کی ملاقات ایک اور کنبہ سے ہوتی ہے۔ عورت اُس کنبہ کی عورتوں سے بات چیت کرتی ہے، اور مرد اُسی کنبہ کے مردوں سے گفتگو کرتا ہے۔ گفتگو کے دوران عورتوں میں کپڑوں، زیور، بچوں کی تعلیم اور گھر کی بات ہوتی ہے۔ مردوں میں گفتگو رتبے، مال اور کاروبار پر ہوتی ہے۔ اِس ملاقات کے بعد عورت میں بھی حسد پیدا ہوتا ہے اور مرد میں بھی، دونوں گھر آ کر ایک دوسرے سے اپنے حسد کا ذکر کرتے ہیں۔ مرد کہتا ہے مجھے اُن کے مال سے حسد ہوگیا ہے۔ عورت کہتی ہے کہ مجھے اُن کے زیور سے حسد ہوگیا ہے۔ اور بھی بہت سی ایسی رغبتیں مرد کے مشاہدے میں آئیں جن میں وہ لوگ اُس فرد سے بہتر تھے چونکہ وہ رغبتیں اُس فرد کے لیے اہم نہیں اِس لیے وہ اُن رغبتوں کے بارے میں حسد نہیں کرتا۔ اُس کا میزبان اُس سے رُتبے میں زیادہ تھا لیکن اُس فرد کے لیے رتبہ اہم نہیں لہٰذا اُس رغبت کے معاملے میں غم پیدا نہیں ہوتا اور پھر حسد بھی جنم نہیں لیتا۔ یہی صورتِ حال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رغبتیں

عورت کی تھی۔ اُس کی میزبان نے عورت سے اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا ذکر کیا لیکن چونکہ مہمان عورت کے لیے تعلیم اہم نہ تھی اِس لیے اُسے قطعی یہ غم نہ تھا کہ اُس کے بچوں کی تعلیم میزبان کے بچوں سے کہیں کم تھی۔ لہٰذا اِس معاملے میں حسد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مہمان عورت کے لیے زیور ایک اہم رغبت تھی۔ اِسی لیے وہ پہلے غم اور پھر حسد کا شکار ہوگئی۔ رغبت ایک ایسی عجیب چیز ہے کہ اگر دو افراد کی رغبتیں مل جائیں اور وہ یکساں نہ ہوں تو اُن میں سے کمتر اکثر حسد کا شکار ہو جاتا ہے۔

رغبتوں کے معاملے میں دو انسانوں کا معیار ایک نہیں ہوتا۔ شہر تو دور کی بات ہے ایک گھرانے میں بھی لوگ ایک سی رغبتیں رکھنے کے باوجود یکساں معیار پر نہیں ہوتے۔ ممکن ہے دس بیس افراد کے گھرانے میں سب کو گاڑیوں سے رغبت ہو لیکن سب کے پاس اچھی گاڑی نہ ہو۔ یا گھر کی تمام عورتوں کو زیورات سے رغبت ہو لیکن سب کے پاس یکساں مقدار میں سونا اور جواہرات نہ ہوں۔ ایسی صورت میں کم معیار رکھنے والا شخص پہلے غم اور پھر حسد کا شکار ہو جائے گا۔ لیکن انسان کا معاملہ عجیب ہے اعلیٰ معیار والا فرد یہ غم اُسے دینے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جوں ہی اُسے احساس ہوتا ہے کہ اُس کے سامنے والا فرد معیار میں کم ہے اور غم لینے کے لیے تیار ہے اعلیٰ معیار کا فرد کم معیار والے فرد کے سامنے اپنی رغبت کے حوالے سے پوری ہونے والی لذتوں کا بھرپور ذکر کرے گا۔ مثلاً جوں ہی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز فرد کو احساس ہوگا کہ اُس کے سامنے والے فرد کو اعلیٰ عہدے کی خواہش ہے لیکن اُسے یہ عہدہ اب تک میسر نہیں وہ اپنے اعلیٰ عہدے کی برکتوں اور ثمرات کا ذکر شروع کر دے گا۔ وہ بتائے گا کہ اُس کے اعلیٰ عہدے کی وجہ سے لوگ کیسے اُس کی عزت کرتے ہیں۔ بڑی بڑی محفلوں میں اُسے بُلایا جاتا ہے۔ اخباروں میں اُس کے انٹرویو شائع ہوتے ہیں وغیرہ۔ جتنا زیادہ وہ اپنی رغبت کا ذکر کرے گا اُتنا ہی زیادہ سامنے والا غم میں مبتلا ہوگا۔ جتنا زیادہ وہ غم میں مبتلا ہوگا اُتنا ہی زیادہ اعلیٰ رتبے کا فرد شیخی بگھارے گا۔ اب یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کم معیار والا فرد رغبت نہ ملنے کی وجہ سے غم میں مبتلا ہو کر حسد کرتا ہے لیکن رغبت کو پالینے والا فرد کیوں شیخی بگھار کر دوسروں کو غم میں مبتلا کرنا چاہتا ہے؟ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے۔ یہ انسانی معاشرت کا چکر ہے۔ ہم سے زیادہ لذت پانے والا فرد ہمیں غمگین کرتا ہے ہم اپنے سے کم لذت پانے والے فرد کو غمگین کرتے ہیں۔ غم منتقل کرنے کا یہ سلسلہ اُوپر سے نیچے کو چلتا ہے۔

ہم اپنے سے بڑے کی لذت کو دیکھ کر غمگین ہوتے ہیں اور پھر اُس سے حسد کرتے ہیں۔ پھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رغبتیں

ہم اپنے شہدرے پن سے اپنے سے چھوٹے کو غمگین کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ہم سے حسد کرے۔ یوں شاید ہمارے اپنے غم اور حسد کی تلافی ہوتی ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ جو اُسے دیا اللہ نے دیا، جو ہمیں دیا وہ اللہ نے دیا۔ اللہ ہمیں ہمارے وسائل میں خوش رکھے اور بس۔ یہ سوچ لیا تو دوسرے کو ملنے والی رغبت کا غم نہ ہوگا اور پھر حسد پیدا نہ ہوگا۔

غم اور حسد سے انسان ایک نفسیاتی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر اگر وہ رغبت جس کی وجہ سے ہم غم میں مبتلا ہوئے تھے زندگی میں میسر آ بھی آ جائے تو اُس کا مزہ نہیں آتا کیونکہ تب تک ہم شدید ڈپریشن کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں اور ڈپریشن ہمیں کسی رغبت سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتا۔ قرآن میں یہ صورتِ حال بہت تفصیل سے ایک واقعہ کی صورت میں آئی ہے یہ دو دوستوں کا قصہ ہے دونوں کو زمین اور زراعت کی رغبت تھی یہ دونوں ایک باغ کی ملکیت میں لذت محسوس کرتے تھے۔ اُن دونوں کو اُمید تھی کہ اُن کا باغ ہو اور وہ باغ پھولے پھلے۔ لیکن اُن میں سے صرف ایک کے پاس باغ تھا۔ اُس باغ کی ملکیت کا مزہ یہ فرد بھرپور طریقے سے اُٹھا رہا تھا۔ اُسے اپنے باغ میں بیٹھ کر پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ دیکھ کر لذت محسوس ہوتی تھی۔ اُس کے ملازم جب پھل توڑ کر فروخت کرنے بازار جاتے تو یہ اُس کا انعام ہوتا اُسے پوری اُمید تھی کہ اُس کا باغ ترقی کرے گا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی اُسے ایک باغ انعام میں ملے گا۔ وہ اپنی اِس رغبت سے ملنے والی لذت کا اظہار اور باغ سے وابستہ اُمیدوں کا تذکرہ بہت اترا کر باغ نہ رکھنے والے دوست سے کیا کرتا تھا۔ باغ نہ رکھنے والے فرد نے اپنے دوست کی لذت کو محسوس تو کیا لیکن اُس احساس کو غم میں تبدیل نہ ہونے دیا بلکہ اُس نے اُس سے اُمید کا پہلو نکالا اور وہ اُمید نہایت سادہ سی تھی کہ اُس کا اللہ اُسے بھی ایسا ہی باغ دے گا اگر وہ اُس کا فرماں بردار رہے گا۔ اُس نے اپنے اِس احساس کا تذکرہ اپنے دوست کے سامنے کیا مگر اُس کا دوست اپنی لذت میں مست تھا۔ رغبت سے ملنے والی لذت بعض اوقات انسان کو سرکش بنا دیتی ہے۔ چنانچہ صاحبِ حیثیت سرکشی کی انتہا کو پہنچا اور پھر اِس سرکشی کے نتیجے میں اُس پر عذابِ الٰہی نازل ہوا۔

رغبت انسان کے بنیادی جذبات کو اِس حد تک غیر متوازن کر دیتی ہے کہ انسانی شخصیت بہت سی مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے جن میں سے عذابِ الٰہی کا ذکر تو قرآن میں ملتا ہی ہے۔ اِس کے علاوہ بھی رغبت کی وجہ سے پیدا ہونے والی بہت سی مشکلات ہیں جو اپنی جگہ موجود ہیں۔ مثلاً رتبہ اور طاقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رغبتیں

کی رغبت اگر بڑھ جائے تو انسان میں خوف ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے صرف لوگوں کو اذیت دینے میں لذت ملتی ہے۔ ایسے انسان پر آسمان سے بجلی نہ بھی گرے پھر بھی وہ بہت سی ایسی اذیتوں میں مبتلا ہوتا ہے جو اُس کی زندگی عذاب بنا دیتی ہیں۔ ایسے لوگ بلڈ پریشر کے مریض ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں بے خوابی کی شکایت رہتی ہے۔ وہ تنہائی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں وغیرہ۔ یعنی رغبت کی وجہ سے جذبات میں آنے والی شدت پر قابو پانا ایک متوازن شخصیت کے لیے اشد ضروری ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ رغبت ہمارے اندر آتی کہاں سے ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ ایک فرد کو علم اور کتابوں سے رغبت ہے اور دوسرے کو پیسے سے، ایک فرد کو اچھا کھانے کا شوق ہے اور وہ کپڑوں کی قطعی پرواہ نہیں کرتا۔ جبکہ دوسرا فرد کپڑوں کے معاملے میں بہت محتاط ہوتا ہے لیکن کھانے میں بہت غیر ذمہ دار۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اِس کی تین وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ تو بچپن کی تربیت ہے۔ بچہ بچپن میں اپنے ماں باپ کو جو کچھ کرتے دیکھتا ہے وہی سب اُس کے لیے رغبت کا درجہ رکھتا ہے۔ مثلاً لڑکا بچپن میں اپنے بڑوں کو سواری کی طرف راغب دیکھتا ہے لہٰذا وہ بھی اپنے اندر سواری کی رغبت پیدا کر لیتا ہے۔ لڑکی بڑوں کو زیور میں لذت محسوس کرتے دیکھتی ہے اور زیور کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ جس طرح بچے کو آنکھوں کا رنگ اور شکل وصورت پیدائش سے پہلے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملتے ہیں۔ اسی طرح رغبتیں بھی پیدائش کے بعد اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملتی ہیں۔ انسان کا رنگ، قد کاٹھ اُس کا جسمانی ورثہ ہیں جبکہ اُس کی رغبتیں اُس کا نفسیاتی یا جذباتی ورثہ ہیں۔ جسمانی ورثہ انسان کی صحت کا ذمہ دار ہوتا ہے جبکہ نفسیاتی ورثہ انسان کی جذباتی اور ذہنی حالت تشکیل دیتا ہے۔ بچہ ایک سال کی عمر سے ہی والدین کی رغبتوں کا بغور مطالعہ شروع کر دیتا ہے اور کسی ایک رغبت سے ملنے والی لذت کو اپنے والدین کے چہروں پر بخوبی پڑھ لیتا ہے۔

والدین کو کتابوں میں لذت محسوس ہو تو ایک سال کا بچہ والدین کو ملنے والی اُس لذت کو اچھی طرح دیکھ لیتا ہے۔ اِسی طرح ایک سال سے بھی کم عمر کی بچی زیورات سے ملنے والی لذت کو اپنی ماں کے چہرے پر پڑھ لیتی ہے۔ چونکہ لذت کا جذبہ تو فطری طور پر موجود ہوتا ہی ہے لہٰذا جوں ہی بچی یہ دیکھتی ہے کہ ماں کو زیور سے لذت مل رہی ہے تو وہ بھی اپنے اندر زیور کی لذت پیدا کر لیتی ہے۔ اور یوں چھ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے بچے اپنے ماحول میں نظر آنے والی بہت سی رغبتوں کو اپنا لیتے ہیں۔ اور پھر اُن کا حصول ساری زندگی کا نصب العین بن جاتا ہے۔ انسان کی ۸۰ فیصد رغبتیں ۶ سے ۷ سال کی عمر تک پختہ ہو جاتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ اُس کے بعد اُن رغبتوں میں تبدیلی لانا بہت مشکل کام ہے۔

بچپن گزرنے کے بعد انسان اپنی رغبتوں کو تبدیل کر سکتا ہے لیکن اِس کے لیے اُسے ایک بار پھر اپنے ماحول کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بچپن میں بھی رغبتیں ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جوانی میں بھی ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں یا تبدیل کی جاسکتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بچپن میں ماحول کو تبدیل کرنے یا اپنی مرضی کا ماحول اپنانے کا اختیار انسان کے پاس نہیں ہوتا جبکہ جوانی میں وہ اپنا ماحول اپنانے میں خود مختار ہوتا ہے۔ وہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُسے کیسے لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ اُسے معلومات کے کن ذرائع کو استعمال کرنا ہے۔ وہ کن جگہوں پر زیادہ وقت گزارے گا اور وہ کس کی بات پر زیادہ غور کرے گا۔ ماحول، جگہ اور لوگوں کے چناؤ سے انسان کے اندر رغبتیں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ کچھ پرانی رغبتیں گھٹ جاتی ہیں اور نئی رغبتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اکثر مذہبی جماعتیں اِسی لیے ماحول کو تبدیل کرنے پر زور دیتی ہیں تاکہ بدلے ہوئے ماحول میں رکھ کر انسان کی رغبتوں میں تبدیلی لائی جاسکے۔

اللہ کی ذات بھی ایک رغبت ہے۔ جن لوگوں میں یہ رغبت موجود ہو وہ نماز اور ذکر میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے بچے بچپن میں ہی اپنے والدین کو نماز میں لذت پاتے دیکھ لیتے ہیں۔ اُن بچوں کو بڑے ہونے پر اللہ کی ذات سے رغبت ہوگی وہ نماز میں لذت محسوس کریں گے۔ اگر جوانی میں اُن کی دوستی ایسے لوگوں سے ہوگئی جن کی رغبت مال اور غذا میں ہوئی تو رفتہ رفتہ اُن میں بھی اللہ کی رغبت کم ہونا اور مال اور غذا کی رغبت بڑھنا شروع ہو جائے گی۔ تقریباً چار مہینے میں ایسے فرد میں اللہ کی رغبت پر مال کی رغبت حاوی آجائے گی۔

دوسری طرف ایک فرد جس نے اپنے ماں باپ کو مال کی رغبت میں مبتلا دیکھا بچپن سے ہی اُس رغبت میں مبتلا ہوگا۔ اب فرض کریں وہ جس تعلیمی ادارے سے منسلک ہوا وہاں اُسے کچھ ایسا ماحول مل گیا جس سے اللہ کی رغبت پیدا ہونا شروع ہوگئی تو پھر اُس فرد میں جس تیزی سے مال کی رغبت کم ہوگی اُسی تیزی سے اللہ کی رغبت میں اضافہ ہوگا۔ بچپن میں اُس کے پاس اختیار نہ تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کی رغبتیں تبدیل کر پاتا یا یہ کہ اُس ماحول کا حصہ نہ بنتا یا یہ کہ اُس کے ماں باپ کی رغبتیں اُس کی ذات کا حصہ نہ بنتیں۔ بڑا ہونے پر ایسے تعلیمی ادارے میں داخل ہونا جہاں اللہ کی رغبت ماحول پر حاوی ہو اللہ کی رحمت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔لیکن اب فیصلہ اُس کا ہوگا آیا وہ اُس ماحول کا حصہ بننا چاہتا ہے جہاں اللہ کی ذات کی رغبت پیدا ہوتی ہے یا وہ ایسے ماحول میں رہنا چاہتا ہے جہاں مال کی رغبت حاوی ہو۔اللہ کی رغبت کے ماحول میں آنا اللہ کی طرف سے تھا۔لیکن اُس ماحول میں رہنے کا فیصلہ اُس کا اپنا ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں مرد عورت سے زیادہ بااختیار رہے۔عورت شادی کے بعد مرد کے ماحول میں آتی ہے۔اُس کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے خاندان میں رہتے ہوئے بھی وہاں پر موجود بُری رغبتوں کو اپنائے یا رد کر دے۔وہ اپنے سُسرال کی رغبتوں کو تبدیل کرنے کی ایک منظّم کوشش کرسکتی ہے۔اُس عورت کے لیے دوہرا اجر ہے۔ایک عورت جو سسرال کی اچھی رغبتوں کا حصہ بنے اتنی محنت نہیں کرتی جتنی اُس عورت کو کرنی پڑتی ہے جس کے سُسرال میں رغبتیں یا تو غلط ہوں یا غیر متوازن۔

بے شک اللہ کسی پر اُس کی صلاحیتوں سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔اچھی عورت کا بُرے ماحول میں جانے کا مطلب ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ وہ وہاں کا ماحول تبدیل کرسکتی ہے۔اُس عورت میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے خاوند کے خاندان کو بہتر رغبتوں پر مائل کر دے اور اُن کی بُری رغبتوں کو ختم کرے۔رغبتوں کے اِس تعارف کے بعد ہم اُن ۲۷ رغبتوں کی بات کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

---

۱۵. جبلی رغبتیں

انسان کی ذات ترغیبات کا مرقع ہے۔انسان میں موجود ترغیبات اُسے کرۂ ارض کے ہر ذی حیات سے مختلف کر دیتی ہیں۔ یہ ترغیبات مختلف انسانوں میں مختلف مقدار میں پائی جاتی ہیں۔لیکن ہر انسان کو ان ترغیبات میں سے اکثر کے ساتھ اکثر نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ایک انسان کی زندگی سے لے کر قوموں کی تاریخ تک بلکہ یوں کہا جائے کہ ازل سے لے کر ابد تک کی انسانی تاریخ اِن ترغیبات کے گرد گھومتی ہے۔کسی ترغیب کے نہ ملنے کا غم، کسی ترغیب کی لذت، ایک ترغیب کا انعام اور پھر کسی ترغیب کی اُمید انسانی زندگی کے شب و روز اُن ترغیبات کے مدار میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ ہمارا رہن سہن، ہماری معاشرت ترغیبات کے تنوع سے ترتیب پاتے ہیں۔ادب اور شاعری کو ہی لیجیے۔ترغیبات کی نوعیت اور اثر پذیری کو سمجھنے کے بعد آپ نہ صرف خود افسانہ لکھ سکتے ہیں بلکہ ہر ناول، ہر کہانی کو ترغیبات کے تاروں سے بُنا ہوا محسوس کر سکتے ہیں۔ترغیبات کی اِس تفصیل کی بدولت آپ نہ صرف خود کو بہت اچھی طرح پہچان سکتے ہیں بلکہ ایک حاکم اپنی رعایا کو، ایک افسر اپنے ماتحتوں کو، ایک ماں اپنے بیٹے کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ میں ایسا کیوں ہوں؟ مجھے کس بات پر غصہ آتا ہے؟ میں لوگوں سے کیوں تعلق رکھتا ہوں؟ میری خواہشات کیا ہیں؟ ترغیبات کے بارے میں ایک ایک کر کے پڑھتے جائیں اور آپ کو اِن کا جواب مل جائے گا۔ یوں تو ہر ترغیب اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہے لیکن یہ مزاجاً دوسری چند ترغیبوں کے ساتھ ایک جگہ جمع کی جا سکتی ہے۔ہم اِن ترغیبات کو ۳ قسموں میں بانٹتے ہیں۔

رغبتوں میں پہلی قسم تو اُن کی ہے جو ہماری بقا کے لیے ضروری ہیں۔ یہ ترغیبات فطری طور پر ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔اُن ترغیبات کا تعلق ہماری ذات کی حفاظت اور نشو و نما سے ہے اُن ترغیبات کی تسکین کے بغیر ہماری موت واقع ہو سکتی ہے۔اِس پہلی قسم میں پانچ ترغیبات شامل ہیں: (۱) نیند (۲) غذا (۳) جسم (۴) علم (۵) عزت۔

اُن پانچ میں سے تین تو انسانوں کے علاوہ جانوروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ نیند، غذا اور جسم کا تحفظ کم و بیش تمام جانداروں میں مشترک ہیں۔اگر انسان کو کوئی فطری ترغیب دوسری مخلوق سے ممیّز کرتی ہے تو وہ علم ہے۔علم کی ترغیب کے پیدا ہوتے ہی انسان نہ صرف دوسرے جانداروں سے مختلف ہو جاتا ہے بلکہ باقی ترغیبات بھی اِسی ایک ترغیب سے جنم لیتی ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رغبتوں کی دوسری قسم کا تعلق مادی یا غیر انسانی چیزوں سے ہے۔ اِن رغبتوں میں شامل ہیں۔

(۱) مال (۲) تجارت (۳) مکان (۴) زمین (۵) زراعت (۶) پانی

(۷) سواری (۸) مویشی (۹) لباس (۱۰) سونا اور جواہرات اور (۱۱) معدنیات

رغبتوں کی تیسری قسم کا تعلق معاشرے سے ہے۔ اِس قسم کی رغبت کا وجود انسانوں کے باہمی تعلق کی وجہ سے ہے۔ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر زندہ رہتا ہے صحت مند تعلق اُسے مزید طاقتور کرتا ہے۔ جبکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ خراب تعلقات اُسے دکھ اور خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ معاشرتی رغبتوں میں مندرجہ ذیل کا ذکر آتا ہے۔

(۱) والدین (۲) دوست (۳) خاندان (۴) دشمن (۵) رہنما (۶) قبیلہ

(۷) شوہر یا بیوی (۸) عورت (۹) سماج (۱۰) اولاد (۱۱) رتبہ

اِن میں سے ہر رغبت ایک یا ایک سے زیادہ افراد سے تعلق کا تقاضا کرتی ہے۔

دوسری اور تیسری قسم کی رغبتوں میں نمایاں فرق اُن کی پیدائش کا ہے تیسری قسم کی تمام رغبتیں عورت کے بطن سے وجود میں آتی ہیں۔ یہاں تک کہ اولاد کی رغبت کا اصل احساس بچے کی پیدائش کے بعد ہی ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری قسم کی رغبتوں کا وجود زمین کے پیٹ سے جنم لینے والی اشیاء کی بدولت ہے۔ جس طرح ماں باپ میں اپنے بچے کی رغبت عروج پر پہنچ جاتی ہے ویسے ہی زمین کے بطن سے لہلہاتی کھیتی کو دیکھ کر کسان کی زراعت کی رغبت میں کئی گُنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب ہم اُن تینوں اقسام کی رغبتوں میں سے پہلی قسم کی رغبتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم سب سے بنیادی اور اولین رغبت سے شروع کرتے ہیں اور وہ ہے نیند۔

نیند

اللہ تعالیٰ نے ازل سے لے کر ابد تک آنے والے انسانوں کی ارواح کو پیدا کیا اور اُن سے پوچھا کیا وہ اُن کا رب نہیں؟ تمام روحوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا بے شک، اِس اقرار کے بعد سے اللہ تعالیٰ وقت مقررہ پر ہر روح کو دنیا میں بھیج رہا ہے۔ وقت آنے پر اللہ اُس روح کو ایک گہری نیند سے بیدار کرتا ہے اور ماں کے پیٹ میں موجود گوشت کے لوتھڑے میں ڈال دیتا ہے۔ گویا دنیا میں آنے سے پہلے انسان کی روح گہری نیند میں تھی اور پھر جگا دی گئی۔ ماں کے پیٹ میں بچے کو خوراک اپنی ماں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملتی رہتی ہے۔ یہ ننھی سی جان اِس ننھی سی دنیا میں جو کام سب سے زیادہ کرتی ہے وہ سونا ہے۔ نیند اُس کے لیے بہت اہم ہے اور یہ نیند کی حالت میں سکون محسوس کرتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد بھی بچہ زیادہ وقت نیند کی حالت میں رہتا ہے۔ نیند کی حالت اُسے ایک خاص لذت اور اطمینان بخشتی ہے۔ اور یوں نیند اللہ کی عطا کی گئی اُن بنیادی رغبتوں میں سے ایک ہے جس کے بغیر انسانی زندگی کی بقا ممکن ہی نہیں۔ خوراک کے بغیر تو انسان پھر کچھ دن گزار لیتا ہے۔ نیند کے بغیر تو دو دن نکلنا بھی مشکل ہیں۔ کسی جسمانی تکلیف کے کم ہونے پر انسان جو کام سب سے پہلے کرتا ہے وہ نیند پوری کرنا ہے۔ بلکہ نیند کا غلبہ ایک بیمار انسان کے تندرستی کی طرف سفر کی بہترین نشانی ہے۔ نیند کی رغبت اِس لیے بھی اہم ہے کہ نیند کے دوران ہی انسان نشو ونما پاتا ہے اور انسان کا اندرونی نظام اپنی اصلاح کرتا ہے۔ یہ شاید واحد ایسی معاشرتی رغبت ہے جس کے لیے اللہ نے ہمارا نظامِ شمسی بنایا ہے۔ نیند کے لیے رات۔ رات کے لیے زمین کی گردش۔ اور گردش کرنے کے لیے سورج۔ قرآن کے الفاظ پر غور کیا جائے تو اِن سب کو اللہ نے اِس لیے بنایا کہ دن اور رات کو تخلیق کیا جائے تاکہ انسان نیند کی بنیادی رغبت کو پورا کر کے سکون حاصل کر سکے۔ قرآن میں آیا ہے کہ رات کا اندھیرا اللہ کی ایک نعمت ہے۔ جس کا مقصد نیند جیسی بنیادی رغبت کو پورا کرنا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی نیند کا ذکر تین مختلف مقامات پر آیا ہے جہاں نیند کی بدولت اللہ کے نیک لوگوں کا اضطراب جاتا رہا۔ اِن میں سے ایک واقعہ تو اصحابِ کہف کا ہے کہ جب وہ شہر والوں کے کفر سے بچ کر جنگل میں چلے گئے تھے۔ جنگل میں ایک جگہ بیٹھ کر سوچنے لگے کہ وہ اپنے ایمان کو کیسے محفوظ رکھیں۔ یہ سوچ اُن کے لیے بے چینی کا باعث بنی ہو گی۔ پھر اُنہیں یہ بھی ڈر تھا کہ شہر والے اُنہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں نہ پہنچ جائیں۔ غالباً شہر والوں سے بچنے کے لیے وہ اضطراب کی حالت میں کسی نزدیکی غار میں داخل ہوئے۔ اور پھر وہیں پر اُنہیں نیند نے آلیا اور وہ کئی سو سال تک سوتے رہے۔

نیند کا ذکر تاریخ اسلام کے دو اولین غزوات میں بھی ملتا ہے۔ پہلا ذکر تو جنگِ بدر کے حوالے سے ہے جب ۳۱۳ مسلمان قریش کا تجارتی قافلہ روکنے کو نکلے تھے۔ جب اُن کو پتا چلا کہ اُن کا مقابلہ چند لوگوں سے نہیں بلکہ کفار کی کیل کانٹے سے لیس فوج سے ہونے والا ہے تو ایک شدید اضطراب کی حالت نے اُنہیں آن دبوچا۔ اِس حالت کو زائل کرنے اور مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لیے اللہ نے اُن کو کچھ دیر کے لیے نیند دی جس کے بعد وہ تازہ دم ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبلی رغبتیں

کچھ ایسی ہی صورت مسلمانوں کی تب ہوئی جب اُحد کے میدان میں ایک جیتی ہوئی جنگ ہار میں تبدیل ہورہی تھی۔ مسلمانوں کو مالِ غنیمت جمع کرتے دیکھ کر کفار نے عقب سے دھاوا بول دیا اور مسلمانوں کے پیر اُکھڑ گئے۔ اللہ کے نیک بندے اضطراب کی حالت میں مبتلا ہوگئے۔ اُس وقت مسلمانوں کو پُرسکون کرنے کی خاطر اللہ نے اُن پر نیند نازل کی۔ تھوڑی دیر کی نیند نے اُنہیں تازہ دم کردیا۔ اُن کی بے چینی ختم ہوئی اور ہمت واپس لوٹ آئی۔

بے چینی اور دکھ کو دور کرنے کی خاطر نیند سے بہتر دوا اور کوئی نہیں۔ بے چینی اور دکھ کے بڑھنے کی وجہ سے جو لذت سب سے پہلے ختم ہوتی ہے وہ ہے نیند اور اِسی رغبت کا حاصل نہ ہونا مزید دکھ اور خوف کا باعث بنتا ہے۔ بلکہ اِس رغبت سے محرومی انسان کو بے شمار جسمانی امراض میں مبتلا کردیتی ہے۔ نیند بطور بنیادی رغبت اتنی اہم ہے کہ اِس سے انسانی زندگی کا معیار ناپا جاسکتا ہے۔ اگر ایک انسان سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اِس ایک رغبت کو حاصل کرنے کا اہل نہ ہو تو باقی تمام لذتیں مل کر بھی اُس کا مداوا نہیں کرسکتیں۔ نیند کی لذت حاصل ہوئے بغیر دوسری سب رغبتیں اپنی لذت کھو بیٹھتی ہیں۔

خوراک

نیند کی لذت ملتے ہی انسان کو جس دوسری رغبت کا خیال آتا ہے وہ ہے خوراک۔ نیند کی طرح خوراک کی کمی بھی انسان کو جسمانی عوارض میں مبتلا کردیتی ہے۔ اِس کی وجہ سے کمزوری ہوسکتی ہے، تھکن ہوجاتی ہے۔ پھر نشوونما ٹھیک نہیں ہو پاتی اور جسم میں قوتِ مدافعت ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔

خوراک کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاک چیزیں کھانے کا حکم بھی دیا ہے اور ضائع کرنے پر تنبیہ بھی کی ہے۔ اِسی طرح حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے علاوہ مسلسل روزے رکھنے سے صحابہ کو منع کیا۔ اور پھر یہ بھی کہا کہ دن میں ایک دفعہ کھانا انبیاء کی سنت ہے یعنی آپ بار بار اور زیادہ کھانے کے حق میں نہیں تھے۔ یہ وہ رغبت ہے جس سے مکمل اجتناب انسان کو خود پر ظلم کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک حد سے بڑھی ہوئی فاقہ کشی کفرانِ نعمت بن جاتی ہے اور انسان کو عمل سے دور لے جاتی ہے۔ جبکہ خوراک کی محبت انسان کو سرکشی کی راہ دکھاتی ہے اور بسا اوقات تکبر اور انا پرستی کا باعث بن جاتی ہے۔ اِسی لیے خوراک کی رغبت کے بارے میں محتاط رہنا بہت ضروری ہے۔ اِس معاملے میں انسان اعتدال کی رسی پر چلتا ہے۔ خوراک کے دائیں جانب بھی پستی ہے اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بائیں جانب بھی۔خود کو بھوکا رکھنا بھی غلط اور ضرورت سے زیادہ کھانا بھی غلط۔اب انسان رسی پر کیسے چلتا رہے؟ یہ کیسے ممکن ہو کہ خوراک کے معاملے میں دائیں یا بائیں جانب کی پستی سے بچا جائے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ خوراک میں میانہ روی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اُن کے لیے دوسری رغبتوں میں میانہ روی دشوار نہیں ہوتی۔ اِس کے برعکس خوراک کی رغبت میں کسی ایک انتہا تک جانے والے لوگ اکثر دوسری رغبتوں کے معاملے میں بھی کسی ایک انتہا پر ہوتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ انسان رغبتوں کے معاملے میں توازن کیسے برقرار رکھے اِس کے لیے ہمیں لذت سے وابستہ دو اور الفاظ سمجھنے کی ضرورت ہے جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں سکون اور اطمینان ۔قرآن کے مطابق مومن کو ہر رغبت سے اصل لذت سکون اور اطمینان کی صورت میں نصیب ہوتی ہے۔خوراک کی مثال ہی لے لیں اچھا کھانا کھانے کے بعد خوراک کی لذت سے بڑھ کر جو لذت محسوس ہوگی وہ سکون کی لذت ہوگی۔ پیٹ بھرنے کی خواہش اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہوگی۔ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ہم (مسلمان) اُس وقت تک نہیں کھاتے جب تک بھوک نہ لگے اور پیٹ بھرنے سے پہلے ہاتھ روک لیتے ہیں۔یہی دو اصول خوراک کی رغبت میں سکون اور اطمینان کی لذت کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔بھوک کی وجہ سے پیدا ہونے والی تکلیف کو رفع کرنے سے جو سکون حاصل ہوتا ہے وہ خوراک کی لذت سے بڑھ کر ہوتا ہے۔خالی پیٹ انسان کو سر درد سے لے کر کپکپی تک بہت سی پریشانیاں دیتا ہے۔خوراک کے پیٹ میں جاتے ہی ایک اطمینان ملتا ہے جو خوراک کی لذت سے بھی اہم ہوتا ہے۔ پیٹ بھرنے سے پہلے خوراک کی رغبت سے کنارہ کشی سکون اور اطمینان کو لذت پر مقدم کرتی ہے۔سکون اور اطمینان پیٹ بھرنے سے پہلے ہی حاصل ہو جاتے ہیں۔اگر خالی پیٹ کھانا شروع کریں تو سکون اور اطمینان ایک تہائی پیٹ بھرنے پر حاصل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔اور دو تہائی پیٹ بھرنے تک مکمل ہو جاتے ہیں۔اب اگر انسان ہاتھ روک لے تو خوراک کی لذت سے بڑھ کر جو کچھ اُس کے ساتھ رہے گا وہ سکون اور اطمینان ہوں گے۔لیکن اگر انسان بھوک کی شدت میں بھی کھانا نہ کھائے تو نقاہت اور کمزوری اُسے سکون اور اطمینان سے دور رکھیں گے۔ اِسی طرح اگر وہ پیٹ بھر کر کھائے تو خوراک کی لذت سکون اور اطمینان پر حاوی آ جائے گی اُس کے بعد انسان خوراک کی لذت کو بار بار پانے کے لیے بے چین رہے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جسم

جبلی رغبتوں میں تیسرے نمبر پر جسم کی رغبت ہے اور اِس کے بہت سے پہلو ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے لیے یہ رغبت نیند اور خوراک سے بھی بڑھ کر ہو۔ وہ اِس بارے میں اختلاف کرسکتے ہیں کیونکہ تمام انسانوں کو رغبتوں کے معاملے میں ایک ہی لڑی میں پرونا ممکن نہیں ہے۔ ہمارے جسم کے تحت پہلا جذبہ جسمانی تحفظ کا خوف ہے۔ کسی بھی قسم کا خدشہ، وسوسہ یا وہم ہمیں جسمانی خوف میں مبتلا کردیتا ہے۔ ایک بچہ کسی اجنبی کو دیکھ کر اپنے والدین کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ یہ عدم تحفظ جسمانی ہوتا ہے۔ بچہ گرمی سردی سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر اُس کو صاف نہ کیا جائے تو بھی وہ جسمانی طور پر تکلیف محسوس کرتا ہے۔ جسمانی اذیت اُسے دکھ میں مبتلا کردیتی ہے اور وہ رونا شروع کردیتا ہے۔ اِسی طرح بیماری اپنے ساتھ بے چینی اور تکلیف لاتی ہے۔ بے چینی اور تکلیف سکون کو ختم کردیتے ہیں جبکہ انسان جسمانی طور پر سکون میں رہنا چاہتا ہے۔ جسم کی رغبت کے حوالے سے بنیادی لذتیں صحت اور تحفظ ہیں جن کے بغیر انسانی سکون غارت ہوجاتا ہے۔ اِس رغبت سے وابستہ اور لذتیں بھی ہیں۔ اِن میں سے ایک تو جسمانی توانائی ہے۔ انسان توانا رہنے کے لیے ورزش کرتا ہے۔ اور یوں ورزش کا شوق جسم کی رغبت سے پیدا ہونے والا عمل ہوتا ہے۔ انسان اگر جسمانی توانائی حاصل کرلے تو اُسے لذت کا احساس ہوتا ہے۔ اُسے دکھ ہوتا ہے کہ اُس نے ماضی میں ورزش کرکے توانائی حاصل نہ کی۔ وہ مستقبل میں زیادہ جسمانی طاقت کی اُمید رکھتا ہے۔ اور جب وہ اپنی جسمانی توانائی کی وجہ سے کوئی ایسا کام انجام دے لے جو وہ پہلے نہ کرسکتا تھا یا اُس کی عمر کے دوسرے لوگ نہ کرپاتے ہوں تو یہ کامیابی اُس کے لیے انعام ہوتی ہے۔ اُسے یہ خوف رہتا ہے کہ وہ جسمانی توانائی کھو نہ دے۔ یوں انسان کا جسم اُس کے لیے ایک اہم رغبت بن جاتا ہے۔

جسم سے اُسے جنسی لذت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایک تندرست فرد اپنے جسم کو استعمال کرکے جنسی لذت حاصل کرتا ہے۔ اُسے جنسی قوت ایک انعام محسوس ہوتی ہے اور وہ اُس لذت کو متعدد بار حاصل کرنے کی خواہش یا اُمید رکھتا ہے۔ اُسے یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ کہیں یہ لذت ملنی ختم نہ ہوجائے اور وہ اِس خوف کو رفع کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ نشہ بھی ایک جسمانی لذت ہے۔ شراب، چرس اور دوسری نشہ آور اشیاء انسان کو جسمانی سکون کی انتہا پر پہنچا دیتی ہیں۔ اِس سکون سے حاصل ہونے والی لذت

جبلی رغبتیں

ہمارے جسم کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ یوں تو ہر لذت اور سکون کی زیادتی انسان کو بیمار کر دیتی ہے یا یوں کہیں کہ اُس کا توازن بگاڑ دیتی ہے لیکن حرام اشیاء کی خاص بات یہ ہے کہ اُن کا تھوڑا استعمال بھی اِس توازن میں خرابی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی حال نشہ کا ہے۔ اِس کا استعمال انسان کو فوری اور شدید جسمانی سکون بہم پہنچاتا ہے۔ یہ سکون اتنا شدید ہوتا ہے کہ اپنے منفی اثرات بھی مرتب کرتا ہے۔ اِس سکون کا دورانیہ تو کم ہوتا ہے مگر منفی اثرات زیادہ دیر تک رہتے ہیں اِسی لیے یہ حرام ہے۔

جسمانی لذتوں کا دوسری بنیادی رغبتوں سے خاص تعلق ہے مثلاً جسمانی بے چینی نیند کی رغبت حاصل ہونے سے روکتی ہے۔ اور جسمانی سکون کی وجہ سے ہی نیند کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اِسی طرح جسمانی رغبت کا تعلق ایک اور رغبت سے ہے جس کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا لیکن یہاں جسمانی رغبت کے حوالے سے بھی ضروری ہے وہ ہے بیوی یا شوہر کی رغبت، یوں تو میاں بیوی کے بیچ میں اور بھی بہت سی لذتیں ہوتی ہیں لیکن جنسی سکون بھی بیوی یا شوہر کی رغبت سے میسر آتا ہے۔ اِسی طرح جن لوگوں میں جسمانی رغبت ہو یعنی وہ خود کو توانا رکھنے کے بارے میں سنجیدہ ہوں تو اُنہیں اور بہت سی رغبتوں کے حصول میں آسانی ہوتی ہے۔ یعنی جسمانی رغبت کا پایا جانا دوسری کئی رغبتوں کو پانے کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً میاں بیوی کے تعلق کو ہی لیجیے۔ اِس رشتے کی ایک خاص رغبت اللہ نے انسان کے اندر پیدا کی ہے۔ لیکن اس رغبت کا بھرپور لطف اُٹھانے کے لیے میاں بیوی میں طاقتور جنسی تعلق ہونا ضروری ہے اور یہ تعلق جسمانی رغبت کے بغیر پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ ایک فرد کو توانا اور تندرست رکھنے میں قطعاً کوئی رغبت نہیں ہوتی لیکن اُسے جنسی لذت کی شدید خواہش رہتی ہے۔ وہ خود کو تندرست رکھنا چاہتا ہے صرف اِس لیے کہ وہ جنسی لذت کو بھرپور طریقے سے حاصل کر سکے۔ وہ ورزش کا سہارا صرف اُس وقت لیتا ہے جب اُسے خود میں جنسی قوت کی کمی محسوس ہوتی ہو۔ اولاد بھی ایک اہم رغبت ہے۔ اولاد کا بہتر خیال رکھنے کے لیے بھی انسان کو اپنے جسم سے رغبت ہونا ضروری ہے۔ لاغر ماں باپ اپنے بچوں کی رغبت میں کوئی خاص لذت محسوس نہیں کر سکتے۔ اِس لیے اُنہیں پہلے اپنی جسمانی توانائی کی رغبت درکار ہے۔ جسمانی لذت انسان کو ورزش کی طرف مائل کرتی ہے۔ ورزش سے انسان چُست اور توانا ہو جاتا ہے۔ چستی اور توانائی کی بدولت اولاد کا بہتر طور پر خیال رکھا جا سکتا ہے اور یوں اولاد کی رغبت میں لذت کی خاطر پہلے انسان کے لیے خود جسمانی توانائی کی لذت محسوس کرنا ضروری ہوتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبلی رغبتیں

جسم کی رغبت کو نینداور خوراک سے نیچے رکھنے کی تین وجوہات ہیں سب سے پہلی تو یہ کہ قرآن میں نینداور خوراک کا ذکر بطور رغبت جسم سے زیادہ بار آیا ہے۔ جب ہم زندہ رہنے کی لذت کو بھی جسمانی لذتوں میں شامل کرلیں تو جسم کی رغبت کا ذکر قرآن میں نینداور خوراک سے زیادہ ہوجاتا ہے۔ لیکن ہم موت کے خوف اور زندگی کی محبت کو جسمانی رغبت کا حصہ نہیں سمجھتے اگر ہم ایک سچے مسلمان کا تصور کریں تو اُسے موت کا خوف نہیں ہوتا جبکہ زندگی اُس کے لیے ایک ذمہ داری ہوتی ہے اور اللہ کے لیے جان دینے سے وہ ڈرتا نہیں۔ لہٰذا اگر موت اور زندگی کے حوالے نکال دیے جائیں تو قرآن میں نینداور خوراک کا ذکر جسم سے زیادہ ہے۔

اِس کی دوسری وجہ ایک نوزائیدہ بچے کی حرکات اور سکنات کا مشاہدہ ہے۔ پیدا ہوتے ہی بچے کو بھوک کا احساس ہوتا ہے وہ چیخ مارتا ہے ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ یہ جسمانی عدم تحفظ کا احساس ہے جس کی وجہ سے بچہ روتا ہے۔ لیکن وہ ماں کا دودھ ملتے ہی چُپ کیوں ہوجاتا ہے اور پھر سو کیوں جاتا ہے؟ کچھ ایسی صورتِ حال غزواتِ بدر اور اُحد میں بھی پیش آئی یعنی جسمانی عدم تحفظ کا خوف نیند سے ختم ہوا۔ یہ ترتیب رکھنے کی تیسری وجہ بیمار لوگوں کا مشاہدہ ہے اکثر لوگ تھوڑی دیر سو لیں یا کوئی خاص چیز کھالیں تو جسمانی تکلیف دور ہوجاتی ہے۔ یہ بات انسان کے علاوہ دوسرے جانداروں کے مشاہدے سے بھی واضح ہے۔ مثلاً بلی پیٹ خراب ہونے کی صورت میں گھاس کھالیتی ہے جس سے اُس کی طبیعت میں سکون آجاتا ہے اب اگر اُسے گھاس کھانے سے رغبت نہ ہو تو جسمانی سکون محال ہے۔ اب آیئے نیند کی طرف زمین کے اندر رینگنے والا کیچوا اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ اگر اُسے آپ کاٹ دیں تو یہ مرتا نہیں بلکہ دوبارہ بڑھنا شروع کر دیتا ہے لیکن کیچوے کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد اُس کا مشاہدہ کریں۔ یہ اپنی جسمانی تکلیف کو دور کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے گہری نیند میں چلا جاتا ہے۔ نیند سے پہلے یہ شدید تکلیف میں نظر آئے گا۔

اِنہی تین دلائل کی وجہ سے ہم نے جسم کی رغبت کو اپنی درجہ بندی میں تیسری اہم ترین رغبت کا مقام دیا ہے۔ انسان اور جانوروں کی پہلی تین رغبتیں یکساں ہیں۔ انسان کے چند ماہ کے بچے اور جانور کے چند دن کے بچے میں آپ نیند، خوراک اور جسم کی رغبت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن چوتھی رغبت سے انسان اور حیوان میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ اور وہ ہے علم حاصل کرنے کی رغبت۔ پہلی تین رغبتوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبلی رغبتیں

طرح یہ رغبت بھی انسان میں فطری طور پر پائی جاتی ہے لیکن کسی اور ذی حیات میں نہیں ملتی۔آپ ایک انسان اور جانور کے بچے کا مشاہدہ کریں۔ جانور کا بچہ نیند، خوراک اور جسمانی تحفظ کی رغبتیں حاصل ہونے کے بعد کھیل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہی بات انسان کے بچے میں نظر آتی ہے۔لیکن فرق ہے کھیل کی نوعیت کا۔ بچے کی زندگی میں کھیل ایک اہم مقام رکھتا ہے۔دراصل ہم جسے کھیل سمجھتے ہیں وہ بچے کے لیے مستقبل کی تیاری ہوتا ہے۔اِس تناظر میں آپ بکری، بلی اور انسانی بچے کے کھیل کا مشاہدہ کریں۔بکری کے بچے کے کھیل میں اُس کی ٹانگوں کو دخل ہوتا ہے۔بکری کا بچہ اُچھلنا کودنا پسند کرتا ہے۔اُس کے کھیل میں کسی چیز کو اپنے پاؤں سے پکڑنا شامل نہیں۔بکری کے بچے کا یہ کھیل اُس کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کیونکہ اُس نے اپنے دشمن سے ہمیشہ بھاگ کر ہی جان بچانی ہے لہٰذا وہ پیدائش کے چند گھنٹوں بعد سے ہی کھیل ہی کھیل میں اپنے بھاگنے کی صلاحیت میں اضافہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔اس کے برعکس بلی کا بچہ بھاگنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔اُس کے کھیل میں اچانک چھلانگ لگانا۔اپنے پنجے سے کسی گیند کو مارنا اور چیزوں کو منہ میں لینا شامل ہے۔ایسا کرنے سے اُسے مستقبل میں شکار کرنا آتا ہے۔اگر وہ ایسا نہ کرے، ماں کا دودھ چھوڑنے کے بعد اُس میں شکار کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو تو وہ خوراک حاصل کرنے کے قابل نہ ہوسکے۔اب آیئے انسان کے بچے کی طرف، انسان کا بچہ نیند، خوراک اور جسمانی رغبتوں کو پورا کرتے ہی جس کھیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ نہ تو شکار کی تیاری ہے اور نہ ہی جان بچانے کی مشق ہے۔ بلکہ وہ ہے علم کے حصول کی جستجو۔انسانی بچے کا کھیل چیزوں کی چھان بین ہوتا ہے۔وہ کھیل ہی کھیل میں اپنے ماحول میں موجود ایک ایک چیز اور فرد کا معائنہ کرتا ہے۔اُسے تحقیق کرنے کی جستجو ہوتی ہے۔وہ مسلسل کسی نئی چیز کے بارے میں علم حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرم رہتا ہے۔اِس مقصد کے لیے وہ گھر کی ہر الماری اور ہر دراز میں جھانکتا اور چیزیں نکالتا ہے۔ یہاں ایک حقیقت کی وضاحت ضروری ہے۔جانوروں کا کھیل اُنہیں مستقبل کے لیے تیار کرتا ہے یعنی ہرن کے بچے کا بھاگنا مستقبل میں کام آئے گا لیکن اب حملے کی صورت میں وہ اپنے قبیلے کے بڑوں پر انحصار کرے گا۔اِسی طرح بلی کے بچے کا کھیل اُسے مستقبل میں چوہا پکڑنے کے قابل کرے گا۔اِس کے برعکس انسانی بچے کا کھیل نہ صرف اُسے مستقبل میں علم حاصل کرنے کے لیے تیار کرتا ہے بلکہ اُس کی ہر تفتیش، ہر تحقیق سے اُس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ہم نے ذکر کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم اُس وقت تک نہیں کھاتے جب تک بھوک نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لگ جائے اور اُس وقت تک کھاتے نہیں رہتے جب تک پیٹ بھر نہ جائے۔ ایک بچے کے علم حاصل کرنے کی رغبت اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کھانے کی طرف اُس وقت تک راغب نہیں ہوتا جب تک اُسے شدید بھوک نہ لگ جائے۔ شدید بھوک کے غالب آنے تک وہ مسلسل چیزوں کی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ اُسے قطعی احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ بھوکا ہے۔ پھر جب اُس کا پیٹ کسی قدر بھرتا ہے تو اُسے پھر جستجو کا کھیل یاد آجاتا ہے اور وہ آدھا کھانا چھوڑ کر علم کی تلاش میں رینگتا ہوا روانہ ہو جاتا ہے۔ بچہ چونکہ فطرت کے قریب ہوتا ہے اِس لیے وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق عمل کرتا ہے۔ نہ تو بھوک کی شدت ہونے تک کھاتا ہے اور نہ ہی پیٹ بھرنے تک کھاتا ہے۔

علم

علم اور معلومات کو ہم نے ایک ہی رغبت کے تحت درج کیا ہے۔ لیکن اِن میں واضح فرق ہے۔ معلومات میں چیزوں، لوگوں اور جگہوں کی تفصیلات شامل ہوتی ہیں۔ یعنی تربوز کی بیل ہوتی ہے۔ انڈے کی زردی پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ ریاض سعودی عرب کا دارلحکومت ہے۔ مسلمان بقر عید پر جانور ذبح کرتے ہیں اور خالدؓ بن ولید ایک ذہین جرنیل تھے۔ یہ سب معلومات ہمیں سُن کر یا پڑھ کر حاصل ہوتی ہیں۔ بہت سی معلومات دوسروں کا علم ہوتا ہے لیکن چونکہ اُس کی تحلیل ہمارے ذہن میں نہیں ہوتی اِس لیے ہم اُس بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک فرد ہمیں بتاتا ہے کہ اُسے قطب شمالی اور سائیبر یا دونوں جگہ جانے کا اتفاق ہوا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قطب شمالی کا درجہ حرارت سائیبیر یا سے بھی کم ہے۔ یہ اُس کا علم ہے اور ہمارے لیے معلومات بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جن معلومات سے ہمارے جذبات پر اثر پڑے وہ علم ہے اور جن سے جذبات متاثر نہ ہوں وہ معلومات ہیں۔

معلومات سے علم تک ایک لمبا سفر ہوتا ہے۔ معلومات ذہن میں قید رہتی ہیں جبکہ علم دل کی گہرائیوں میں اُتر کر ہمارے جذبات میں اُتار چڑھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ اِس کا ایک مظاہرہ ہمیں حج کے موقع پر نظر آتا ہے۔ جو لوگ حج کے مختلف مناسک کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں اُن کا رویہ بڑا سرسری سا ہوتا ہے۔ وہ حج کے ارکان کی ادائیگی تو بڑی ترتیب سے کرتے ہیں لیکن چونکہ اُنہوں نے اِس کی اہمیت کو معلومات سے علم کے درجے تک نہیں پہنچایا ہوتا اِس لیے اِس عمل کی اہمیت اُن کے دل میں کسی تبدیلی کا باعث نہیں بنتی۔ یعنی وہ ایک کام ظاہری طور پر معلومات کی بنیاد پر کرتے ہیں لیکن علم نہ ہونے کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبلی رغبتیں

وجہ سے اُن کے جذبات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اِس کے برعکس جو لوگ حج کے مناسک کی اہمیت اور ضرورت پر غور کرتے ہیں اُن کے لیے حج ایک علم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور جب وہ حج کے مختلف مراحل سے گزرتے ہیں تو ہر مرحلے پر اُن کے علم کی بدولت اُن کی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن میں معلومات کو علم میں تبدیل نہ کرنے والوں کی مثال اُن گدھوں کی سی ہے جن پر کتابیں لدی ہوں۔ جبکہ وہ لوگ جنہوں نے معلومات کو اپنی سوچ کی چکی میں پیس کر علم میں تبدیل کیا ہو اللہ کے نزدیک نور کے حامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جنت میں اُونچے درجے پر فائز کیا جائے گا۔

صاحبِ علم ہستیوں میں سے ایک حضرت خضرؑ ہیں جنہیں اللہ نے مستقبل کا علم دے رکھا ہے۔ علم کے معیار کا اندازہ لگانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ عالم سے آنے والے وقت کے بارے میں پوچھا جائے۔ گزرے ہوئے کل اور آج کے حالات کا تجزیہ کر کے جو فرد جتنا بہتر مستقبل کے بارے میں بتا سکے وہ اُتنا ہی بڑا صاحبِ علم سمجھا جائے گا۔ یعنی جو فرد فقط چند ہفتوں کے دوران دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں بتا سکے وہ اس شخص سے کم ذہین ہو گا جو کئی سال بعد کے حالات پر پیش گوئی کر سکے۔ بدقسمتی سے دنیا کے بیشتر لوگ اتنا ہی علم رکھتے ہیں جس کی بدولت وہ بہت ہوا تو دو، تین سال کے بعد وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں دلائل کے ساتھ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اِیسے صاحبِ علم کم ہوتے ہیں جو آج کے بدلتے ہوئے حالات کے بارے میں جامع معلومات بھی رکھتے ہوں اور پھر اُس کی مدد سے ۲۰، ۳۰ یا ۴۰ سال بعد کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔ چونکہ اُن کے آس پاس کے لوگ اتنے سال بعد کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ وہ تو ایسے ذی علم لوگوں کی بات سمجھنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں لہٰذا ایسے لوگوں میں سے بیشتر نے تنہائی کی زندگی گزاری ہے وہ عمل تو برابر کرتے رہے لیکن اُن کے علم سے فائدہ آنے والی نسلوں نے اُٹھایا۔ جبکہ اُن کے ہم عصر اُن کی علمی صلاحیتوں سے بے خبر ہی رہے۔ حضرت خضرؑ بھی ایسی ہی شخصیت ہیں۔ لیکن اُن کے مستقبل کا علم کسی معلوماتی تجزیہ کا نتیجہ نہیں بلکہ الہامی ہے۔ اور چونکہ اُن کا موجودہ عمل مستقبل میں اثرات مرتب کرتا ہے اِس لیے حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اُن کے عمل کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا علم کی رغبت انسان میں اشرف المخلوقات ہونے کی بدولت ہے۔ یہ ایک فطری رغبت ہے جو صرف بنی آدم میں پائی جاتی ہے۔ جبکہ معلومات کی رغبت علم کو حاصل کرنے کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیے ضروری ہے۔ اگر ہم علم کو شہد تصور کریں تو معلومات پھولوں کا رس ہے۔ بہت سے پھولوں سے رس چوس کر شہد کی مکھی تھوڑا سا شہد بناتی ہے۔ شہد کی مکھی کو پھول سے محبت اُس کے رس کی وجہ سے ہوتی ہے اور اُس کی محبت شہد بنانے کے لیے ضروری ہے۔ انسان میں معلومات کی رغبت اِس لیے ہوتی ہے کہ اِس کی بدولت علم وجود میں آتا ہے۔ جس طرح پھول کا رس کسی کام کا نہیں جب تک اُسے شہد میں تبدیل نہ کر دیا جائے اُسی طرح معلومات کسی کام کی نہیں جب تک اُنہیں علم کا درجہ نہ مل جائے۔ لیکن بعض اوقات انسان معلومات کی رغبت میں ایسا مبتلا ہو جاتا ہے کہ اُسے یاد ہی نہیں رہتا کہ معلومات کا مقصد علم کو تشکیل دینا تھا۔ وہ کتابیں پڑھتا ہے لیکن اِن کتابوں سے وہ کوئی علم حاصل نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اُسے قرآن کی سورتوں کے نام، قرآن میں ذکر کیے گئے انبیاء کے نام، قرآن میں موجود جانوروں کا ذکر سب پتا ہوتا ہے لیکن قرآن کی آیات سے اُس نے کوئی علم حاصل نہیں کیا ہوتا جو اُس کے فکر و نظر کو جلا بخش دیتا۔

معلومات سے علم تک کا سفر سوچ اور فکر کا سفر ہے۔ لیکن بعض لوگ معلومات کی رغبت میں اتنا غرق ہو جاتے ہیں کہ وہ علم کی رغبت کو بھول جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے موجودہ دور میں میڈیا انسان کو معلومات کی رغبت میں اُلجھا دیتا ہے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد خبریں، پھر حالاتِ حاضرہ کے پروگرام، اِس کے بعد ڈاکومینٹری پروگرام یہ سب مل کر انسان کے دماغ کو معلومات کے سمندر میں ایسا ڈبوتے ہیں کہ وہ اُن سے علم حاصل کرنا بھول جاتا ہے۔ بلکہ میڈیا کے غلبے کے بعد سے انسان جس تیزی سے معلومات کی رغبت میں اضافہ کر رہا ہے اِسی تیزی سے اُس کی علم کی رغبت کم ہو رہی ہے۔ وہ مسلسل ٹی وی کے سامنے بیٹھا ایک چینل سے دوسرے چینل پر معلومات اکٹھی کرتا ہے۔ وہ ایک اخبار کے بعد دوسرے اخبار پر جھپٹتا ہے اور ایک ایک خبر پڑھتا ہے۔ اُسے سیمینار اور مذاکرے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اِن سب کی بدولت اُس کے پاس معلومات کا ایک انبار جمع ہوتا ہے لیکن چونکہ اُس کے پاس معلومات کو علم میں تبدیل کرنے کی نہ تو رغبت ہوتی ہے نہ ہی وقت اِس لیے اُس کے پاس اپنے ٹھوس دلائل نہیں ہوتے۔ اور علم سے تہی دامن ہوتا ہے۔ اس لیے اتنی معلومات ہونے کے باوجود اُس کی شخصیت میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہو پاتا۔

عزت

پانچ جبلی رغبتوں میں سے ایک عزت کی رغبت ہے۔ علم کے آنے سے انسان کے بچے کو جس رغبت کا احساس سب سے پہلے ہوتا ہے وہ عزت ہی ہے۔ جوں جوں علم بڑھتا ہے عزت کا احساس بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبلی رغبتیں

بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسان میں موجود علم اور عزت کی رغبتیں ہی اُسے اشرف المخلوقات بنا کر جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ڈارون کا مسئلہ یہ تھا کہ اُس نے رغبتوں کے حوالے سے تحقیق نہ کی بلکہ جسمانی خدوخال کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا۔ وہ ظاہری شکل وصورت میں بتدریج تبدیلی کو لڑی میں پروتا رہا۔ شاید اِس کی ایک وجہ میڈیکل سائینس میں وہ ترقی ہو جو اُس کے دور میں ہو رہی تھی۔ طب میں نئے اضافے اور معلومات کی وجہ سے نفسیات اور انسان کی مجموعی شخصیت کے بارے میں گفتگو نہ ہونے کے برابر تھی۔ بلکہ طب نے انسانی نفسیات کو بھی بائیولوجی کی سطح پر لا کر انسان کی شخصیت کے روحانی پہلو کا تو قلع قمع ہی کر دیا۔ اگر انسان کی جسمانی ساخت اور بناوٹ سے آگے بڑھ کر سوچا گیا ہوتا تو انسانی ساخت کی بندر سے مماثلت کوئی غلط فہمی پیدا نہ کرتی بلکہ انسانی شخصیت کے بارے میں اور بہت سی حیرت انگیز دریافتیں ممکن ہوتیں۔ اِنہی میں سے دو دریافتیں تو یہی ہیں کہ انسان کے اندر جبلی طور پر پائی جانے والی دو رغبتیں ایسی ہیں جن کا وجود جانوروں میں نہیں ہوتا اور وہ دو ہیں علم اور عزت کی رغبتیں۔ جو اتنی پیچیدہ ہیں کہ ان کی تخلیق کسی اور ارتقاء کی وجہ سے ممکن نہیں بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ ہیں۔

عزت کا مطلب ہے عزتِ نفس۔ یہ عزتِ نفس وہ ہے جس کی رغبت ماحول سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ پہلے ہی سال کے بعد انسان میں قدرتی طور پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جوں جوں علم کی رغبت میں اضافہ ہوتا ہے عزت کی رغبت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ انسان کو فطری طور پر اپنے معزز ہونے کا احساس ہے۔ وہ پُر وقار زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے۔ اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ اُسے پہچانیں۔ اُسے کوئی کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنے آپ کو منوانے کی رغبت ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے نام سے زیادہ نشان کا خواہش مند ہے تاکہ وہ پہچانا جائے۔ یہ سب اِس لیے کہ عزت حاصل کر کے اُسے ایک خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ اِسی طرح اُسے خوف رہتا ہے کہ کہیں اُس کی یا اُس کے خاندان کی عزت مجروح نہ ہو۔ اگر وہ اچھی شخصیت کا حامل ہے تو اُسے یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ اُس کے ہاتھوں کسی اور کی عزت کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اِسی طرح کسی اچھے عمل سے جو فائدہ خلقِ خدا کو ملتا ہے وہ انسان کی عزتِ نفس کا انعام ہے اور پھر انسان کو ہمیشہ اُمید رہتی ہے کہ اُس کی عزت میں اضافہ ہوگا۔ یہ عزتِ نفس انسان کے لیے نیند، خوراک اور جسم سے بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ اور یہی انسان کا امتیازی نشان ہے۔ انسان کا ذہن نیچے سے اُوپر کی طرف اٹھتا ہے۔ سب سے پہلے اُس کا Reptile Brain نشوونما پاتا ہے پھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبلی رغبتیں

اُس کا Mammal Brain اپنے اعلیٰ معیار کو حاصل کرتا ہے دماغ کے اِن دوحصوں کی تشکیل تک انسان میں نیند، خوراک اور جسم کی رغبتیں غالب رہتی ہیں۔علم اور پھر عزت کی رغبت کے نمودار ہونے کا مطلب ہے کہ اب انسان کے اندر Human Brain نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔

اگر یہ رغبت انسان کے لیے Human Brain کے درجہ پر رہے تو وہ عزت کی خاطر نیند اور غذا تو کیا اپنے جسم کو بھی قربان کر دیتا ہے۔مثلاً ایک مجاہد کو ہی دیکھئے۔ایک مجاہد کے نزدیک اُس کی عزت، نبی ﷺ اور اللہ کی عزت ہے۔اور چونکہ اُس کی عزت اسلام کی عزت سے وابستہ ہے اِس لیے وہ اسلام کی عزت کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔

بدقسمتی سے عزتِ نفس وہ مقدس چیز ہے جس کو ناپنے کا پیمانہ ایک صحت مند معاشرے میں نیک اعمال کے سوا کچھ نہیں۔نیک اعمال کا مطلب ہے تقویٰ۔اور تقویٰ ہی عزت کا باعث بنتا ہے۔اِس لیے ایک صحت مند معاشرے میں نیک اعمال کی کثرت ہوتی ہے۔چونکہ نیک اعمال کرنے کے لیے مال و دولت جیسی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اِس لیے عزت میں اضافہ زیادہ امیر یا طاقتور ہونے سے نہیں ہوتا۔تب ہی تو ایک صحت مند معاشرے میں شہید کے خاندان کی عزت ایک امیر خاندان سے زیادہ ہوتی ہے۔لیکن معاشرے میں بگاڑ کی صورت میں عزت کا معیار بدل جاتا ہے۔پھر لوگ عزت کا موجب اُسی رغبت کو سمجھتے ہیں جس پر وہ اپنے حکمران یا صاحبِ عزت کو پاتے ہیں۔اگر اُس معاشرے میں عزت طاقت سے ملے تو لوگ نوکر شاہی یا فوج میں جانا پسند کرتے ہیں۔اگر معاشرے میں طاقت اور عزت صاحبِ ثروت کے پاس ہو تو لوگ دولت کے چکر میں لگ جاتے ہیں یا اگر اُنہیں عزت لوگوں کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے متاثر کرنے میں نظر آئے تو وہ پھر میڈیا، موسیقی اور اداکاری جیسے شعبوں کا رخ کرتے ہیں۔اور یوں ایک بنیادی صالح رغبت جو اور بہت سی رغبتوں کا باعث بنتی ہے ایک غلط موڑ لے لیتی ہے پھر لوگ غلط قسم کی عزت حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دیتے ہیں۔وہ صرف اُن چیزوں کی طرف لپکتے ہیں جن سے ظاہری عزت نصیب ہوتی ہو۔یوں ایک نہایت ہی معصوم اور روحانی رغبت ایک گھناؤنے اور گھٹیا جنون میں بدل جاتی ہے۔جو رغبت لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھ کر، غریبوں کا سہارا بن کر پوری ہو سکتی تھی اب کروڑوں روپے خرچ کر کے، ظلم و ستم اور شہدے پن سے بھی تسکین نہیں پاتی۔ عزت کی رغبت کو پورا کرنے کے لیے اور بہت سی رغبتیں ہیں جن کا ذکر ہم اگلے ابواب میں کریں گے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۶. مادی رغبتیں

قرآن سے ہمیں رغبتوں کے بارے میں کئی دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔انسان کے لیے جو رغبتیں پیدا کی گئی ہیں اُن کی تعداد ۲۷ ہے۔ پھر اُن میں سے ۵ تو انسان کی جبلی رغبتیں ہیں جن کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔علم اور عزت کی رغبتوں کے بروئے کار آتے ہی انسان وہ علم حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے جس سے عزت میں اضافہ ہو سکے۔یہیں سے انسان کے اندر ۲۲ دوسری رغبتیں پیدا ہوتی ہیں۔

علم کے آنے سے عزت کا پتا چلتا ہے اور ایک نئی رغبت جنم لیتی ہے۔ پھر علم سے ہی واضح ہوتا ہے کہ اور کن چیزوں سے عزت ملتی ہے۔تب انسان اُن رغبتوں سے روشناس ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ اُسے پہلے مادی رغبتوں اور پھر معاشرتی رغبتوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انسان میں مادی رغبتیں پہلے جنم لیتی ہیں یا انسانی۔اب تک کی تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ مادی نوعیت کی رغبتیں انسانی نوعیت کی رغبتوں سے پہلے تخلیق ہوتی ہیں۔ یہ بات ہم دو بنیادوں پر کہہ سکتے ہیں۔اول تو آپ ایک بچے کا رویہ دیکھیں وہ اگر کسی چیز کے پیچھے لگ جائے تو اُسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ اِس معاملے میں بے تحاشہ ضد کرتا ہے اور اپنے بہن، بھائی، ماں، باپ ہر رشتے کو بھول جاتا ہے۔ایک سال کی عمر سے پیدا شدہ مادی رغبت پر معاشرتی رغبت غالب نہیں آسکتی۔کئی سال کے بعد جب بچے کی معاشرتی رغبتیں مضبوط ہوتی ہیں تو وہ اپنے بھائی بہن کی چیزیں زبردستی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اِس معاملے میں ایک اعتراض ماں کے رشتے پر ہو سکتا ہے کہ کیا پیدائش کے فوراً بعد بچہ ماں کی رغبت پیدا نہیں کر لیتا اور کیا ماں کی رغبت دوسری چیزوں کی رغبت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ واقعی ایک اہم نکتہ ہے اور بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ماں کی رغبت سب سے اہم اور مقدم ہے۔لیکن ایسا نہیں۔ بچے کے لیے ماں ایک رغبت نہیں بلکہ اس کی بنیادی رغبتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ بچے کی اصل رغبتیں نیند، خوراک اور جسم ہوتی ہیں جو ماں کے ذریعے سے پوری ہوتی ہیں۔وہ بچے کے لیے ایک وسیلہ ہے۔ ہاں ماں کے لیے بچہ ایک رغبت ضرور ہے۔

ماں کی رغبت کچھ سال کے بعد پیدا ہوگی۔تب بچے کے دماغ میں موجود ماں کی فائل میں بھی تبدیلی ہوگی۔اور اُسے احساس ہوگا کہ ماں وسیلے سے بڑھ کر ایک عظیم رشتہ ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آپ ایک بچے کے رویے کو دیکھیں وہ ماں کے پاس اپنی بنیادی رغبتوں کو پورا کرنے جاتا ہے اور باقی وقت وہ مادی رغبتوں کے چکر میں پھرتا رہتا ہے۔ اِس کے لیے اُس کے جوتے، کھلونے اور کپڑے بہت اہم ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اگر اُسے کوئی ایسی چیز پسند آجائے جو اُس کی ملکیت نہ ہو تو وہ اُسے حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگ جاتا ہے۔ اور یہی رغبت کی تعریف ہے۔ وہ ہمیں کسی شے کی طرف مائل کرتی اور کسی شے سے دور لے جاتی ہے۔ مادی رغبتوں کے معاشرتی رغبتوں سے پہلے ہونے کی دوسری وجہ قرآن کی وہ آیت ہے جس میں اِن دونوں اقسام کی رغبتوں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مریم (۱۵) کی ۷۳ آیت ہے۔ یہاں کافر مومنوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُن کی کون سی شے ہم سے بہتر ہے۔ اور اِس ذکر میں پہلے وہ اپنے مکان اور پھر اپنی محفل یعنی اپنے دوستوں اور رتبے کا ذکر کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں قارئین کے لیے یہ بات دلچسپ ہوگی کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی مشہور نظم لا الٰہ الا اللہ میں بھی انہی دو اقسام کی رغبتوں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اُنہیں اسی ترتیب سے لکھا ہے۔ آپ کہتے ہیں ؎

یہ مال و دولت دُنیا یہ رشتہ و پیوند
بُتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

آپ نے پہلے مال یعنی مادی رغبتوں کا ذکر کیا اور پھر آپ نے معاشرتی رغبتوں کی نشان دہی کی ہے یعنی رشتہ و پیوند۔ اور جیسا کہ دوسرے مصرع میں واضح کیا ہے کہ زمین اور ماں کی کوکھ سے جنم لینے والی یہ دونوں رغبتیں عارضی ہیں کیونکہ اُن کا وجود ایک محدود عرصے تک ہے۔ ان دونوں رغبتوں کی وجہ سے انسان جذبات کے بُت بنالیتا ہے کوئی رغبت اُس کے لیے خوف کا بُت ہوتی ہے تو کوئی اُمید کا بُت بن جاتی ہے۔ اگر اُسے کسی مادی رغبت کے چھُٹ جانے کا غم ہوتا ہے تو کوئی معاشرتی رغبت اُس کے لیے لذت کا سامان پیدا کرتی ہے۔ رغبت اور جذبے کے ملاپ سے پیدا ہونے والی اس سخت چیز کو جو ہمارے دل میں موجود ہوتی ہے علامہ اقبالؒ بُت کہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک بُت وہ نہیں جن کو مندروں میں پوجا جاتا ہے بلکہ اصل بُت تو رغبت اور جذبے کے ملاپ کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ جیسے ریت اور سیمنٹ کے ملاپ سے ایک بُت ۔ بلکہ اگر ہم بغور دیکھیں تو مندروں میں پڑے بُت بھی اپنا وجود دل میں چھپی مادی یا معاشرتی رغبتوں کی وجہ سے رکھتے ہیں۔ دراصل جو بُت ہمیں نظر آتا ہے وہ ہمارے لیے مادی یا جسمانی رغبت کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ ہم اس بات کو ماں کی مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مادی رغبتیں

ایک دو ماہ کے بچے کے لیے ماں جسمانی رغبت یعنی نیند، خوراک اور جسم کا تحفظ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے ویسے ہی مندر میں پڑا بُت انسان کے لیے مادی یا معاشرتی رغبت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ اُس کے ذریعے یا تو اُسے عزت ملتی ہے یا پھر خوراک یا کوئی اور رغبت۔

۲۰ ویں صدی کے شروع میں انسان صنعتی دور میں داخل ہو چُکا تھا جس کی وجہ سے مادہ پرستی نے جنم لیا۔ پھر انسان کو مادی اور معاشرتی رغبتوں کے چکر میں زیادہ سے زیادہ خریداری کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی گئی۔ تب سے انسان پتھر کے بُتوں کی نہیں بلکہ اپنے دل میں رغبتوں کے بنے بتوں کی پرستش کرتا ہے اور اپنی زندگی کا محور انہی بُتوں کو بنائے رکھتا ہے۔ اِسی نظم کا اگلا شعر اسی حوالے سے ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لاالہٰ الاللہ

اِس تفصیل کے بعد ہم آتے ہیں اُن گیارہ مادی رغبتوں کی طرف جو انسان کے لیے مرکزِ ثقل بنی رہتی ہیں اور انسانوں میں سے اکثر ان رغبتوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کے نرغے میں آجاتے ہیں۔

مال

مادی رغبتوں میں پہلا ذکر تو بلاشبہ مال کا ہے۔ مال کی رغبت کی ابتدا تو بہت ہی معصومانہ ہے۔ ہر وہ شے جس سے بچے کی پانچ بنیادی رغبتیں پوری ہو جائیں مال کہلاتی ہے۔ چنانچہ بچے کے لیے اپنا کمرہ یا سونے کی جگہ، اُس کا تکیہ، پھر اُس کے کھانے کی من پسند چیزیں، اُس کے کپڑے وغیرہ مال کی رغبتیں ہیں کیونکہ یہ اُس کی نیند، خوراک اور جسم کی رغبتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

ایک سال کے بچے کے لیے تو چپس (Chips) کا ایک پیکٹ مال کی رغبت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اُس کے لیے خوراک کی رغبت کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اِسی طرح علم اور عزتِ نفس حاصل کرنے کے لیے بھی جن اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی مال کی رغبت میں آتے ہیں۔ مثلاً ایک بچے کے لیے اپنے کھلونے کی اہمیت اِس لیے ہے کہ وہ اِس کو چلا کر، کھول کر اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ آپ گیند کو ہی لے لیجیے۔ گیند کو اُچھال کر، ٹھوکر مار کر، کسی لکڑی یا بلے سے مار کر بچہ گیند اور اپنی جسمانی قوت

مادی رغبتیں

کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے۔ اِسی طرح بچہ جو چیزیں بڑوں کے پاس دیکھتا ہے وہ لینے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بڑوں کی طرح لگے ایسا کرنے سے اُسے اپنی عزتِ نفس میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ چابیوں کی مثال دیکھ لیجیے۔ بچہ ایک تو چابیوں پر غور کرنا چاہتا ہے کہ اِس سے اُس کا علم بڑھتا ہے۔ دوسرے یہ بات ہمیشہ اُسے حیران رکھتی ہے کہ آخر اُس کے بڑے دروازے پر آ کر چابی جیسی چھوٹی سی چیز کے کیوں محتاج ہو جاتے ہیں۔ پھر جب لوگ چابی ڈھونڈ لیتے ہیں تو اُن کے چہروں پر ایک خوشی آتی ہے جسے بچہ پڑھ لیتا ہے۔ اب اُس کی دلچسپی چابی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اُس کا بغور جائزہ لینا چاہتا ہے۔ یہاں چابی کی اہمیت صرف علم کی رغبت کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اِسی طرح آپ عزتِ نفس کو لیجیے۔ چھ ماہ کا بچہ اپنے بڑوں کو دیکھ کر یہ یقین کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اُس کے بڑے کس بات میں عزتِ نفس محسوس کرتے ہیں۔ یہ کام وہ دو طرح سے کرتا ہے۔ ایک تو وہ دیکھتا ہے کہ اُس کے بڑے اپنا فالتو وقت عام طور پر کس طرح گزارتے ہیں اور پھر اگر وہ دوسروں سے ملتے ہیں تو کس رغبت کو خوشی سے دکھاتے ہیں۔ اِس مشاہدے کی بدولت وہ اپنے بڑوں کی رغبتوں کو جاننے اور اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ رغبتوں کو اپنانے کا یہ انداز بہت معصومانہ اور فطری ہے۔ انسان کے اندر عزتِ نفس کی رغبت بہت طاقتور ہے۔ انسان باوقار ہے۔ وہ اللہ کا نائب ہے اُس کی عزتِ نفس اتنی عظیم ہے کہ اللہ نے فرشتوں سے اُسے سجدہ کروایا۔ انسان کی عزتِ نفس میں چُھپی دراصل اللہ کی عزتِ نفس ہے۔ اور انسان فطری طور پر بچپن سے ہی اس عزتِ نفس کو حاصل کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اِس عزتِ نفس کو سمجھنے کے لیے اُن الفاظ پر غور کریں جو اللہ کے آخری نبی ﷺ دُنیا سے جاتے وقت ادا کر رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ دُنیا میں اُن لوگوں کی عزتِ نفس مجروح ہونے کا زیادہ امکان ہے جو دوسروں کے زیادہ محتاج ہیں اور وہ ہیں غلام، غریب، مزدور اور عورت۔

مزدور کا استحصال کرنا بہت آسان ہے۔ وہ اپنی روزی کے لیے اپنے آقا (Boss) کا محتاج ہے۔ اِن حالات میں جب وہ ایک دن کی مزدوری کے لیے کسی کا محتاج ہو مزدوری دینے میں دیر کرنا بھی اُس کی عزتِ نفس کو مجروح کرے گا۔ خواتین کے مسائل پر نظر رکھنے والے لوگ اِس بات کے گواہ ہیں کہ ایک عورت کو غربت میں اگر عزتِ نفس میسر آئے تو وہ خوش رہتی ہے لیکن دُنیا جہان کی رغبتیں ملنے کے باوجود عزتِ نفس جیسی بنیادی رغبت سے محرومی اُسے ڈپریشن کا شکار کر دیتی ہے۔ اِسی تناظر میں دیکھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مادی رغبتیں

جائے تو رسول اللہﷺ کی مسلمانوں کو آخری نصیحت بخوبی سمجھ میں آتی ہے آپ اللہ کے پاس لوٹ کر جانے سے پہلے جو الفاظ بار بار فرما رہے تھے وہ ہیں: ''اپنے غلاموں اور عورتوں کا خیال رکھنا''۔

تاریخ نے دیکھا کہ جب جب عورت کی عزتِ نفس کا خیال رکھا گیا آنے والی نسلیں مادی اور معاشرتی رغبتوں کے بارے میں اعتدال پسند رہیں اور جہاں بھی مزدور کی عزتِ نفس کو مجروح ہونے سے بچایا گیا وہاں ایک اعتدال پسند معاشرہ قائم ہوگیا۔ ورنہ ہر معاشرے کے زوال پر ہمیں عورت اور مزدور کی عزتِ نفس مجروح ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔ شاید ہی کوئی معاشرہ ایسا ہو جس کا زوال ان دو طبقوں کی عزتِ نفس کے فقدان سے نہ شروع ہوا ہو۔ دراصل زوال کے وقت قوم کے رہنما مادی اور معاشرتی رغبتوں پر مسلط ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنی مرضی سے بانٹتے ہیں۔ اُس وقت عزتِ نفس مادی اور معاشرتی رغبتوں کی فراوانی کا نام ہوتا ہے۔ یہ فراوانی کبھی بھی اتنی نہیں ہوسکتی کہ سب میں اُس کا برابر حصہ بانٹا جاسکے۔ جب عزتِ نفس مادی اور معاشرتی رغبتوں کی فراوانی کا نام ہو اور یہ فراوانی سمٹ کر طاقتور کے پاس جمع ہورہی ہو تو سب سے پہلے محرومی کا احساس کمزور کے اندر ہی جنم لے گا جس کے پاس اُس فراوانی کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا اور یہ دو طبقے ہمیشہ عورت اور مزدور ہوتے ہیں۔ جب مزدور کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے تو وہ محنت سے کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اُسے ہر وقت نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا ہونے سے صنعتی یونٹ کا سائز نہیں بڑھ پاتا کیونکہ زیادہ مزدوروں کی نگرانی ممکن نہیں رہتی۔ امیروں کے صنعتی ترقی کے خواب حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتے اور یوں معاشی ترقی رُک جاتی ہے۔ جب مزدور بیکار ہوجائیں یا جب اسامی ہو لیکن کام کرنے والا نہ ملے تو ایک طرف صنعتی ترقی کم ہوجاتی ہے اور دوسری طرف بیکار بیٹھا مزدور اپنی خوراک اور جسمانی تحفظ کی خاطر جرم کی راہ اپنا لیتا ہے۔ اِسی طرح عورت کی عزتِ نفس مجروح ہونے کی صورت میں عورت ڈیپریشن کا شکار ہو کر مادی اور معاشرتی رغبتوں کی طرف لپکتی ہے۔ وہ زمین، زر اور رتبے کے چکر میں پڑ جاتی ہے اور یوں وہ ایک ایسی نسل کو جنم دیتی ہے جس کے لیے عزتِ نفس مادی اور معاشرتی رغبتوں کے علاوہ کسی چیز کا نام نہیں ہوتا۔ یوں بچہ دو سال کی عمر سے عزتِ نفس کا مطلب مادی رغبتوں کے حصول کو ہی سمجھتا ہے۔

مادی رغبتوں میں مال دراصل کوئی بھی ایسی چیز ہے جو انسان کی بنیادی رغبتوں کے پورا کرنے کا ذریعہ ہو۔ مال کی رغبتوں میں گھر کا سامان، نقدی، لکڑی، مصنوعی آلات وغیرہ شامل ہیں۔ ہم

مادی رغبتیں

لکڑی کی مثال لیتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں آگ کے دریافت ہونے کے بعد سے لکڑی اوّلین مالی رغبت رہی ہے۔ انسان نے آگ سے بنیادی رغبتوں کے حصول کو ممکن بنایا۔ اِس سے اُسے سوتے وقت حرارت ملی۔ اِس پر اُس نے کھانا پکایا اور پھر آگ سے ہی اُس نے درندوں کو بھگایا اور یہ اُس کے لیے جسمانی تحفظ کا ذریعہ بنی۔ اُن علاقوں میں جہاں جنگلات کی فراوانی تھی لکڑی ہی نے جسمانی تحفظ کے لیے بنائے گئے گھر کے لیے بنیادی سامان کا کام دیا۔ یوں لکڑی انسانی تاریخ کی ابتداء سے ہی ایک اہم رغبت تھی۔ اگر مال کی فہرست کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا جائے تو لکڑی سرِ فہرست ہے۔ پہلے پہل لکڑی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اہم تھی۔ رفتہ رفتہ یہ خود ایک رغبت میں تبدیل ہوگئی۔ انسان کی مادی اور معاشرتی رغبتیں یوں ہی وجود میں آتی ہیں اور یہاں پر اِس بارے میں کچھ گفتگو کرنا ضروری ہے۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ پانچ بنیادی رغبتیں ہی باقی تمام رغبتوں کا منبع ہیں۔ یعنی بائیس مادی اور معاشرتی رغبتوں کا آغاز پانچ جبلی رغبتوں سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ بائیس مادی رغبتوں میں سے بعض پانچ جبلی رغبتوں سے رابطہ توڑ کر اپنا الگ وجود قائم کر لیتی ہیں۔ لکڑی کی مثال لیجیے۔ تاریخ کے شروع میں تو لکڑی جبلی رغبتوں کے لیے ضروری تھی لیکن رفتہ رفتہ اُس کی اہمیت کی بدولت وہ مال میں تبدیل ہوگئی اور بذاتِ خود ایک اہم رغبت بن گئی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ ہمیشہ یکساں رہی ہے۔ ایک انسان کی زندگی میں لکڑی کی اہمیت شاید کچھ سال تک تو بنیادی رغبتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ رہی لیکن پھر یہ بذاتِ خود ایک طاقتور رغبت میں تبدیل ہوگئی۔ اِس طرح اُس کے پانچ بنیادی جذبات لکڑی سے وابستہ ہوگئے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ جب اُس کے جذبات لکڑی کے حصول سے اِس لیے وابستہ تھے کہ یہ اُس کے لیے خوراک اور جسمانی تحفظ حاصل کرنے کا ذریعہ تھی تو کیا صورتِ حال تھی اور پھر ہم دیکھیں گے کہ جب لکڑی بذاتِ خود ایک مال کی صورت اختیار کر گئی تو پھر جذبات میں کیا تبدیلی آئی۔

☆ رغبت: خوراک (جس کے لیے لکڑی کی ضرورت ہے)

لذت: کھانے کو پکتا دیکھ کر

خوف: خوراک کے لیے کہیں لکڑی کم نہ پڑ جائے۔

غم: میں اس دفعہ لکڑی کافی جمع نہیں کر پایا۔ یا میرے فلاں واقف کار کے پاس لکڑی کم ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مادی رغبتیں

اُمید: کسی سے مزید لکڑی مل جائے گی۔ اگلی دفعہ زیادہ لکڑی جمع کروں گا۔

انعام: کھانا جو لکڑیوں کی آگ پر پکا۔

اب رفتہ رفتہ لکڑی جب مال کی شکل اختیار کرگئی تو پانچ بنیادی جذبات نے کیا رُخ اختیار کیا۔

لذت: میں لکڑیوں کے بڑے ڈھیر کا مالک ہوں۔

خوف: کہیں میرے ڈھیر کو کوئی نقصان نہ پہنچے یا کوئی مجھ سے مانگ نہ لے یا چوری نہ ہو جائے۔

غم: میرے پاس اس سے کہیں زیادہ لکڑی ہونی چاہیے۔ اس دفعہ میں لکڑی زیادہ جمع نہ کرسکا۔ یا یہ استعمال ہورہی ہے۔

انعام: لکڑیوں کے ڈھیر کو دیکھنا یا دوسروں سے تعریف سُننا۔

اب اِن دونوں میں فرق کو محسوس کیجیے۔ پہلی صورت میں لکڑی کی لذت اُسے کھانا پکانے میں بطور آگ استعمال ہوتا دیکھ کر ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں لذت لکڑی کے ڈھیر کو دیکھنے سے مل رہی ہے۔ اِس طرح پہلی صورت میں انعام اس کھانے کی صورت میں ہے جو اِس لکڑی کی مدد سے پکا۔ جبکہ دوسری صورت میں ایک بار پھر انعام لکڑی کے انبار کو دیکھنے سے ملتا ہے۔ یہی صورت غم کی ہے پہلی صورت میں غم ہے کہ کافی لکڑیاں جمع نہیں کرسکا جبکہ دوسری صورت میں لکڑی کے استعمال ہونے کا غم ہے۔ اور یوں لکڑی مال میں تبدیل ہو کر ایک رغبت میں ڈھل گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مال نے کئی صورتیں اپنالیں۔ یہاں تک کہ آج گھر میں رکھی ہوئی اشیاء مال کی صورت میں اہمیت اختیار کر چکی ہیں۔ اِن میں سے ایک اہم شے جس سے بعض لوگ اپنی پانچ بنیادی ضرورتوں کی تکمیل محسوس کرتے ہیں ٹی وی TV ہے۔ آج کے دور میں ٹی وی بنیادی رغبتوں کو پورا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ انسان نے علم کے حصول کے لیے ٹی وی کو بُلند درجہ دے دیا ہے۔ جبکہ اپنے تحفظ کی خاطر ٹی وی کا کردار بہت اہم سمجھا جاتا ہے اور ہر گھر کے لیے ایک ۲۴ انچ کا ٹی وی سیٹ ناگزیر ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ بڑے ٹی وی سیٹ کو عزت کی رغبت حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور یوں بڑے سے بڑے ٹی وی سیٹ کے لیے جدوجہد شروع ہوجاتی ہے جس سے ہمارے پانچ بنیادی جذبات وابستہ ہوجاتے ہیں۔

زمین، زراعت، پانی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مادی رغبتیں

مال کے بعد دوسری دس ایسی رغبتیں ہیں کہ جو مادی نوعیت کی ہیں اور جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں آیا ہے۔ اِن میں سے تین: زمین، زراعت اور پانی ہیں۔ انسان نے جب سے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کی ہے اور زراعت اپنائی ہے زمین کی ترجیح بطور رغبت بڑھ گئی ہے۔ اور اب تو انسان نے چونکہ شہروں میں رہنا شروع کردیا ہے اِس لیے زمین کی رغبت میں بے تحاشہ اضافہ ہوگیا ہے۔ شہری علاقوں میں آبادی بڑھنے کی وجہ سے زمین کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں۔ ایسی صورت میں جب زراعت کے لیے زمین کم پڑ رہی ہو اور شہروں میں دوگز زمین ملنا بھی محال ہو زمین کی بطورِ رغبت اہمیت میں ترقی ہورہی ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ زمین کا مالک بن کر لذت محسوس کرتا ہے۔ اُسے اپنی زمین کے ٹیکسوں اور قیمتوں کے کم ہونے کا خوف رہتا ہے۔ وہ اُمید رکھتا ہے کہ اُس کی زمین کی قیمت اور بڑھے گی اور وہ مزید زمین حاصل کرپائے گا۔ اُسے غم رہتا ہے اُن تمام مواقع کا جب وہ ایک اچھی زمین حاصل نہ کرپایا۔ اِس سے ملتے جلتے جذبات انسان زراعت کی رغبت سے وابستہ رکھتا ہے۔ بہتر فصل کا انعام، اپنی زراعت کو دیکھ کر ملنے والی لذت اور ماضی میں فصل تباہ ہوجانے کا غم۔ یہ سب جذبات بہت طاقتور ہیں۔ چونکہ زراعت ہی کے لیے پانی کی ضرورت ہے اِس لیے پانی بھی انسان کے لیے اہم رغبت ہے بلکہ یہ انسان کی ابتدائی اور تاریخی رغبتوں میں سے ایک ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں نے میٹھے پانی کے کنارے ہی جنم لیا۔ انسانی استعمال سے لے کر زراعت کی پیداوار تک انسان کو میٹھے پانی کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے۔ بدقسمتی سے آج کے دور میں شہروں کی آبادی میں زیادتی اور پانی کی کمی نے میٹھے پانی کی اہمیت میں کئی گُنا اضافہ کردیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگلی عالمی جنگ شاید میٹھے پانی کی رغبت کی وجہ سے چھڑ جائے۔

مکان

مادی رغبتوں میں سے ایک اہم رغبت مکان ہے۔ یوں تو مکان جسمانی رغبت کا حصہ ہے کہ یہ ہمیں جسمانی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ لیکن انسانی شخصیت کی کمزوری کہیے کہ یہ جسمانی رغبت کا حصہ نہیں رہتا اور بذاتِ خود ایک رغبت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ مکان کی رغبت کے پیدا ہوتے ہی انسان بہتر سے بہتر مکان کی جستجو شروع کردیتا ہے۔ اُس کے دل میں پانچ بنیادی جذبات اُس رغبت سے مل کر ایک طوفان برپا کردیتے ہیں۔ بڑے بڑے محلات سے لے کر آج کے ماڈرن آسائشوں سے پُر گھر اِسی رغبت کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تحت وجود میں آئے ہیں۔ اِس رغبت کو جنون کی شکل اختیار کرنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ بعض اوقات ایسے لوگ جن میں یہ رغبت شدید ہو جائے ہر وقت اپنے مکان کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اگر اُن کے پاس اچھا مکان نہ ہو تو اُنہیں غم رہتا ہے اور اس کے ساتھ خوف بھی کہ شاید وہ ایک اچھے مکان میں کبھی نہ رہ سکیں۔ اگر وہ ایک اچھے مکان میں رہ رہے ہوں تو وہ اس کی لذت کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ اُنہیں ایک رات بھی اپنے مکان سے باہر نیند نہیں آتی۔

مویشی

مادی رغبتوں میں سے ایک اور رغبت مویشیوں کی ہے۔ انسان ہمیشہ سے ہی مویشیوں کا دلدادہ رہا ہے۔ اُن مویشیوں کو وہ حفاظت سے رکھتا ہے اور اُن سے بہت سے فائدے حاصل کرتا ہے۔ عام طور پر پائے جانے والے مویشی بکریاں، گائے، بھینس اور اونٹ وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لوگ مرغیاں اور بطخیں بھی پالتے ہیں۔ ان سب مویشیوں سے جو ہمیں تین اہم چیزیں ملتی ہیں وہ ہیں دودھ، گوشت اور کھالیں۔ مویشیوں کی رغبت کا اندازہ اِس بات سے لگایئے کہ انسان نے جسمانی تحفظ کی خاطر کھال کا متبادل Synthetic Material تو بنالیا ہے لیکن آج کی تمام تر سائینسی ترقی کے باوجود دودھ اور گوشت کا متبادل وجود میں نہیں آسکا۔ اِن دو بنیادی غذاؤں کی وجہ سے آج تک انسان مویشی پال رہا ہے اور اِسی وجہ سے مویشیوں کی رغبت ہمیشہ سے انسان کے لیے اہم رہی ہے انسان کو مویشیوں کے بیمار ہونے کا خوف رہتا ہے۔ مویشیوں کی موت سے غم ملتا ہے۔ اُسے اپنے مویشیوں کو گن کر اُن کا دودھ حاصل کر کے لذت ملتی ہے۔ ریوڑ میں نئے بچے کی پیدائش اور جانوروں سے حاصل ہونے والی چیزیں اُس کے لیے انعام ہوتی ہیں اور وہ ان انعامات میں اضافہ کے لیے پُر اُمید رہتا ہے۔

سواری

یوں تو گھوڑے بھی مویشیوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن قرآن نے گھوڑوں کو الگ رغبت کے تحت درج کیا ہے اور وہ رغبت ہے سواری کی۔ انسان کی خواہش ہے کہ وہ جسمانی مشقت کم کرے۔ اِس لیے وہ بیٹھ کر سفر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اِس سے سواری کی رغبت نے جنم لیا ہے۔ گھوڑا اُس جسمانی مشقت کو کم کرنے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو خاص اِس لیے پیدا کیا ہے کہ انسان کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جسمانی محنت کم کرنا پڑے اور وہ اپنے رزق کے حصول کے لیے جو سفر کرے وہ بیٹھ کر کرے۔ یعنی اگر وہ غذا حاصل کرنے کے لیے تجارت کرتا ہے اور اُسے غلہ منڈی جانا ہے تو وہ اس مقصد کے لیے گھوڑے کی پیٹھ استعمال کر سکے۔ پھر جیسے ہم دوسری رغبتوں کے بارے میں کہہ چکے ہیں، سواری بنیادی رغبتوں کے حصول سے بڑھ کر خود ایک رغبت بن جاتی ہے۔ انسان نئی نئی سواریوں کی تلاش میں رہتا ہے جن سے اُسے لذت حاصل ہو سکے اُس کے لیے اُس کی شاندار سواری ایک انعام ہوتا ہے۔ وہ اِس اُمید میں رہتا ہے کہ وہ اِس سے بھی بہتر سواری حاصل کر سکے گا۔ پھر اُس کو یہ غم بھی ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ ایک نئی سواری حاصل نہیں کر سکا یا یہ کہ اُسے اچھی سواری بہت دیر سے میسر آئی اور زندگی کا ایک بڑا حصہ سواری کے بغیر ہی گزر گیا۔ ایسے ہی یہ خوف بھی رہتا ہے کہ اُس کی سواری کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ کہیں یہ چوری نہ ہو جائے۔ ۲۰ ویں صدی کے شروع میں گاڑی کی ایجاد کے بعد سے سواری کی رغبت میں جانور کے ساتھ مشین بھی بطور سواری شامل ہوگئی۔ چند دہائیوں میں گھوڑا بطور سواری رغبت کے درجے میں نیچے چلا گیا اور گاڑی سرفہرست ہوگئی۔ آج نئی نئی گاڑیاں اور اُن کے اشتہار انسان کو سواری کی رغبت کی طرف شدت سے مائل رکھتے ہیں۔ انسان بہتر سے بہتر گاڑی لینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اِس رغبت کو پورا کرنے کے لیے بنک اپنے سودی کاروبار کو پھیلانے میں حد درجہ کامیاب رہے ہیں اور یوں سواری جو کہ انسان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ تھی ایک طاقتور رغبت بن گئی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں سودی نظام کو پنپنے میں مدد ملی ہے۔

لباس

سواری کی طرح لباس بھی ایک بنیادی رغبت یعنی جسمانی تحفظ کا ذریعہ ہے۔ بچپن سے ہی انسان یہ مشاہدہ کرنا شروع کر دیتا ہے کہ لباس جسمانی تحفظ سے بڑھ کر عزت بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ لباس کے ذریعہ کی گئی نمود و نمائش اور اِس سے ملنے والی عزت انسان کو بہتر سے بہتر لباس کی طرف راغب کرتے ہیں۔ ایک پانچ سال کا بچہ بھی عزتِ نفس کی خاطر لباس کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور یوں چند سال میں لباس جسمانی تحفظ سے بڑھ کر ایک طاقتور رغبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسان نئے نئے لباس پہنتا ہے۔ پھر وہ خود کو آئینے میں دیکھ کر لذت محسوس کرتا ہے۔ اُسے کوئی لباس نہ ملنے کا غم رہتا ہے۔ نئے لباس میں خود کو دیکھنا اور دوسروں کا اُس کے نئے لباس کو دیکھنا اُس کا انعام ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اِس اُمید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں رہتا ہے کہ مستقبل میں بہتر لباس حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا۔ پھر اُسے یہ بھی خوف رہتا ہے کہ اُس کے موجودہ لباس پرانے نہ ہو جائیں اور فیشن کے مطابق نہ رہیں۔

لباس کے حوالے سے اگر ہم کالر کی بات کریں تو لباس کی رغبت سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ آج لباس میں کالر خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کالر مردوں کے کپڑوں میں کندھوں کے اُوپر وہ اضافی حصہ ہے جو بالعموم مرد کی گردن کو چھُپا دیتا ہے۔ انسان نے جب کپڑا بنانا شروع کیا تو اُس کے پاس بمشکل تن ڈھانپنے کا کپڑا تھا۔ لہٰذا کالر کا تو تصور ہی محال تھا۔ دوسرے الفاظ میں چونکہ لباس جسمانی تحفظ کے زمرے میں آتا تھا اِس لیے گردن کو چھُپانے کے لیے زائد کپڑے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سلسلہ شروع ہوا جب انسان نے باقاعدہ ایک معاشرے میں رہنا شروع کیا۔ سرکاری اور مذہبی رسومات کسی بھی معاشرے کا اہم حصہ ہوتی ہیں اور اگر حکومت ہوگی تو حاکم بھی ہوگا۔ اِسی طرح مذہبی رسومات کو ادا کرنے کے لیے کسی پیشوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جہاں حاکم اور مذہبی پیشوا ہوں گے وہیں غیر معمولی عزت اور احترام کی ضرورت ہوگی۔ کم از کم اِن دونوں شخصیات کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسروں سے ممتاز نظر آئیں اِس کے لیے جہاں اور بہت سے امتیازات ہوں گے وہاں ایک فرق لباس کا بھی ہوگا۔ اوپر کو اُٹھا ہوا کالر اُن کے لباس کو نمایاں کر دیتا تھا۔ اِس سے معاشرے میں عزت ملنے کے امکانات بڑھتے تھے کیونکہ وہ شخصیت دوسروں سے مختلف نظر آتی تھی۔ کچھ یہی صورتِ حال سر ڈھانپنے کی ہے۔ سر ڈھانپنے سے جسمانی تحفظ کی رغبت پوری ہوتی ہے۔ ایسا کرنے سے دماغ موسمی اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ تحقیق نے ظاہر کیا ہے کہ سر کو ڈھانپنے سے سر کا درجہ حرارت ایک سے دو ڈگری بڑھ جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے دماغ میں خون کا دورانیہ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اِس سے دماغ میں زیادہ طاقت پیدا ہوتی ہے۔ انسان بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے اور بعض تحقیقات کے مطابق انسان کی ذہانت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب حکمران اور مذہبی پیشواؤں نے ممتاز نظر آنے کی کوشش کی تو بادشاہ نے ٹوپی کی جگہ پگڑی پہن لی اور مذہبی پیشوا نے ٹوپی میں یا تو کپڑے کا اضافہ کر کے پگڑی میں تبدیل کر لیا یا پھر ٹوپی کو عموداً بڑا کر کے خود کو ممتاز کر لیا۔ رفتہ رفتہ عام افراد نے بھی ممتاز لوگوں کی نقل میں کالر اور پگڑی کو اپنایا اور یوں لباس ایک اہم رغبت میں تبدیل ہو گیا۔

تجارت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مادی رغبتیں

زرعی دور تک انسان زیادہ تر اجناس کا تبادلہ کرتا تھا۔ ایک جگہ سے کھجور دوسری جگہ چلی جاتی تھی اور وہاں کی گندم اِدھر آجاتی تھی لوگ آلو کے بدلے کپڑا اور پھل کے بدلے دالیں خرید لیتے تھے۔ یوں بنیادی رغبتوں کو پورا کرنے کے لیے تجارت نے جنم لیا۔ لیکن ہر غذائی جنس ہر جگہ پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ اِس لیے ایک علاقے کے لوگوں نے اپنی غذائی اجناس ایک جگہ جمع کرلیں جو قافلے کی صورت میں دوسرے علاقوں میں پہنچنے لگیں۔ جوں جوں انسان کی رغبتوں میں اضافہ ہوا، سواری کے جانوروں اور پھر پہیے کی ساخت میں بہتری آئی تجارت کے فاصلوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جو تجارت ایک دو دن میں ہو جاتی تھی قافلوں کی صورت میں مہینوں پر پھیل گئی۔ یوں انسانی رغبتوں کی تکمیل کے لیے جو تجارت وجود میں آئی وہ خود ایک رغبت میں تبدیل ہوگئی۔ جوں جوں انسانی رغبتیں پیچیدہ تر ہوتی گئیں تجارت بھی اُتنی ہی پیچیدہ ہوگئی۔ تجارت کی رغبت رکھنے والے لوگ نوکری نہیں کرسکتے۔ اگر اُن کو مجبوراً نوکری کرنا پڑے تو اِس کوشش میں رہتے ہیں کہ موقع ملتے ہی تجارت شروع کردیں۔ اُنہیں ایک جگہ سے مال جمع کرکے دوسری جگہ بیچنے میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ سامان کا بکنا اور اُس سے حاصل ہونے والا منافع اُن کا انعام ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ نوکری کرتے وقت اُنہیں جو تنخواہ ملتی ہو وہ اُس منافع سے زیادہ ہو جو اُنہیں تجارت سے حاصل ہوتا ہے لیکن وہ کم منافع کو زیادہ تنخواہ پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اُنہیں تجارت سے رغبت ہوتی ہے۔ اُنہیں اس بات کا غم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر اُنہوں نے ایک اچھی چیز کی تجارت نہ کی اور نقصان اُٹھایا۔ بعض اوقات اچھا سودا نہ کرنے کا غم بھی ہوتا ہے۔ تجارت کی رغبت میں خوف کسی سامان کے نہ بکنے کا ہوتا ہے۔ سامان کے خریدتے ہی تاجر کا بہت سا سرمایہ پھنس جاتا ہے پھر جب تک اُس کا مال اچھے داموں بک نہیں جاتا اُسے خوف رہتا ہے۔ تاجر کو اُمید رہتی ہے کہ اُسے اچھا منافع ملے گا اور تجارت میں ترقی ہوگی۔ تجارت کی ابتدا میں عرصے تک تاجر ایک چیز کو دوسری جگہ لے جاکر کسی اور چیز سے بدل لیتے۔ نئی چیز لے کر کسی دوسرے علاقے میں جاتے اور وہاں سے اس کے بدلے کوئی اور چیز لے کر اپنے وطن لوٹتے اور پھر اپنے علاقوں میں پیدا ہونے والی چیزوں کا تبادلہ کرلیتے۔

کرنسی کے آنے سے یہ سلسلہ پہلے کم اور پھر ختم ہوگیا۔ تاجروں نے ایک جگہ کی چیز کسی دوسرے علاقے میں بیچ دی اور اُس کے بدلے کرنسی لے لی۔ یہ کرنسی پہلے تو صرف قیمتی دھاتوں کے سکوں کی صورت میں ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ سکوں کی جگہ کرنسی نوٹ نے لے لی۔ اب تاجر کے پاس یہ سہولت تھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ اگر وہ اپنا مال کسی دوسرے علاقے میں لے جا کر فروخت کرے تو وہ وہاں سے مال کے بدلے مال لینے کی بجائے کرنسی وصول کر سکتا تھا۔ یوں کرنسی تجارت کا وسیلہ بنی۔

سونا اور جواہرات

سونا اور جواہرات کی رغبت کے دو دلچسپ پہلو ہیں ایک آرائش اور دوسرا کرنسی کا متبادل۔ ہم دوسری بات سے پہلے شروع کرتے ہیں۔ لوگوں نے جب بہت سی کرنسی جمع کر لی تو دو مسائل پیدا ہوئے ایک تو کرنسی وقت کے ساتھ اپنی قدر کھوتی رہتی ہے دوسرا مسئلہ اُس کو سنبھالنے کا ہے۔ ایک لاکھ کی کرنسی چھپانا زیادہ بڑا مسئلہ ہے بہ نسبت ایک لاکھ کا سونا چھپانے کے۔ تو یوں لوگ سونے کو بطور زر جمع کرنے لگے۔ کرنسی کی نسبت سونے کی قدر میں اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ تقریباً یہی کیفیت ہیرے اور جواہرات کی بھی ہے۔ اِس صورت میں سونا اور ہیرے جواہرات کی موجودگی اور اُن کی قدر میں اضافہ انسان کے لیے لذت کا باعث ہوتا ہے۔ انسان کو اِن کے کھونے اور چوری ہونے کا خوف رہتا ہے۔ اِن قیمتی دھاتوں کے زیادہ مقدار میں نہ ہونے کا غم رہتا ہے۔ سونے اور دیگر قیمتی دھاتوں کی لذت بہت شدید ہوتی ہے۔ انسان کے لیے کوئی انعام بھی کافی نہیں ہوتا۔ ایک کلو سونا حاصل ہوتے ہی ایک کلو اور سونا حاصل ہونے کی اُمید ہوتی ہے۔ آدھا کلو سونا اُس کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک کلو سے دو کلو سونا ہونے پر انسان مزید اُمید لگا لیتا ہے۔ اور یوں یہ سلسلہ موت تک جاری رہتا ہے۔ سونے اور جواہرات کی دوسری رغبت انسان کی عزت کے حوالے سے ہے۔ انسان اِن قیمتی دھاتوں کو اپنے جسم اور ماحول میں سجا کر اضافی عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو انسان اپنی ذات میں کمتر محسوس کرے یا اُسے اُس کی حیثیت سے بڑھ کر مقام مل جائے یا وہ کسی ایسی بات پر لوگوں کو قائل کرنا چاہے جو صحیح نہ ہو تو وہ ایسی چیزوں کا محتاج ہوتا ہے جو اُسے دوسروں سے ممتاز کر سکیں تو ایسے لوگوں کے لیے قیمتی دھاتوں اور جواہرات سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چنانچہ معاشرے کے اکثر معززین نے اِن دھاتوں سے فائدہ اُٹھایا اور اُن کی دیکھا دیکھی معاشرے کے عام افراد کے لیے یہ دھاتیں خود رغبت میں تبدیل ہو گئیں۔ لوگ اپنے جسم یا ماحول میں دھاتوں اور ہیروں کا مظاہرہ کر کے جب لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں تو اُنہیں لذت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے عوام کی توجہ انعام ہوتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معدنیات

انسان قیمتی دھاتوں سے بہت پہلے اُن دھاتوں سے متعارف ہوا جو بنیادی رغبتوں کو پورا کرنے کے لیے اہم ہیں مثلاً کھانا پکانے کے برتن، زراعت کے اوزار اور شکار کے لیے ہتھیار۔ یہ سب دھاتوں سے بنتے ہیں جن میں سرِ فہرست لوہا ہے۔ جوں جوں انسان نے لوہے کے ساتھ کام کیا وہ اُس کے نئے نئے مصارف سے واقف ہوتا چلا گیا۔ لوہا، تانبا اور کانسی وغیرہ سے انسان نے بہت اہم چیزیں بنائیں۔ اگر ہم اِن معدنیات میں تیل کو بھی شامل کرلیں تو ظاہر ہوگا کہ ایک گھر میں استعمال ہونے والی بیشتر چیزیں یا تو دھات کی بنی ہیں یا پھر پلاسٹک سے جو تیل سے بنتا ہے۔ ایک بار پھر ضروریات کو پورا کرنے والی دھاتیں اور تیل بذاتِ خود ترغیبات میں تبدیل ہوگئے۔ انسان کرنسی، ہیرے اور سونے کی طرح زیادہ سے زیادہ تیل اور دوسری معدنیات کو جمع کرنے میں لذت محسوس کرنے لگا۔ یہ رغبتیں انسان کے قومی جذبات پر حاوی ہوجاتی ہیں کیونکہ اِن میں پوری قوم کا دفاع اور بقاء پوشیدہ ہیں۔ مثلاً تیل کی پیداوار سے پوری قوم لذت محسوس کرتی ہے۔ اس قوم کو ماضی میں تیل کی قیمتیں کم ہونے کا غم ہوتا ہے۔ یا اگر اس کے پاس تیل نہ ہو تو اُسے تیل نہ ہونے کا غم ہوتا ہے۔ اِس قوم کو یہ بھی خوف رہتا ہے کہ اگر تیل کی ترسیل بند ہوگئی تو کیا ہوگا؟ تیل کے نئے ذخائر کی دریافت اُس کے لیے انعام ہوتا ہے۔

انسانی ذات میں زمین سے پیدا ہونے والی اشیاء کی رغبت انسانی شخصیت کے تضاد کو ظاہر کرتی ہے۔ انسان خود کو سب مخلوقات سے ممتاز اور افضل سمجھتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب بھی ہے۔ کیونکہ اللہ نے اُسے واقعی سب مخلوقات سے افضل بنایا ہے۔ لیکن اُسے چند بنیادی رغبتوں سے آزاد نہیں رکھا اور اِن بنیادی رغبتوں کو پورا کرنے کے لیے زمین کے اندر ہی وسائل چھُپا دیے گئے ہیں۔ انسان کو یہ وسائل دریافت کرنے یا زمین سے اُگانے ہیں۔ چونکہ یہ وسائل انسان کے زمین پر آنے سے لے کر اس کے یہاں سے جانے تک کے لیے ہیں اس لیے اِن کو زمین کے اندر محفوظ کیا گیا ہے۔ زمین کا بطن اِن وسائل کو محفوظ بھی رکھتا ہے اور تازہ بھی۔ اندازہ کیجیے اگر قیامت تک کام آنے والے لوہے کا ذخیرہ ڈھیروں کی صورت میں زمین پر ہوتا تو اُسے زنگ لگ گیا ہوتا اور وہ استعمال کے قابل ہی نہ رہتا۔ اِس طرح سارے وسائل زمین کے اندر محفوظ حالت میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ انسان کی ضرورت کے مطابق انسان ہی سے دریافت کرواتا ہے۔ بنیادی رغبتوں کے لیے درکار وسائل کی کم یابی ہی اُن کے کردار

کوتبدیل کر دیتی ہے۔انسان بھول جاتا ہے کہ گیارہ مادی رغبتوں کی ضرورت پانچ بنیادی رغبتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔لیکن انسان گیارہ مادی رغبتوں کے پیچھے ایسا پڑتا ہے کہ وہ اپنی بنیادی رغبتوں کو ہی بھول جاتا ہے۔مادی رغبت کے گرد انسان کے پانچ بنیادی جذبات گردش کرتے ہیں۔ جذبات میں شدت آتی جاتی ہے اور یہ شدت ختم ہوتی ہے صرف موت سے۔

زمین سے جنم لینے والی رغبتوں کے ذکر کے بعد اب ہم آتے ہیں اُن رغبتوں کی طرف جو عورت کے پیٹ سے جنم لیتی ہیں۔انسان کے انسان کے ساتھ رشتے اور تعلق سے بھی رغبتیں پیدا ہوتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۷. معاشرتی رغبتیں

ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مادی رغبتوں کی طرح معاشرتی رغبتوں کی تعداد بھی گیارہ ہی ہے۔

دوست

معاشرتی رغبتوں میں سے جو رغبت انسان میں سب سے پہلے پیدا ہوتی ہے وہ ہے دوست کی رغبت۔ ایک دفعہ پھر اِس بات کا اعادہ ہو جائے کہ والدین کی رغبت بلا شبہ ایک اہم رغبت ہے جس پر ہمارے معاشرے کی بنیاد ہے لیکن درحقیقت یہ رغبت انسان کی ذات میں بہت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مغربی معاشرے میں تو یہ رغبت پیدا ہی نہیں ہوتی تو غلط نہ ہوگا۔ بچہ اپنے والدین کو اپنی بنیادی رغبتوں کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اِس کے برعکس دوست کی رغبت اُس میں بتدریج ایک سال کی عمر سے پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اصل میں دوست وہ ساتھی ہوتا ہے جس کے ساتھ مل کر بچہ دو بنیادی رغبتوں یعنی علم اور عزتِ نفس کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ مثلاً بچہ جو کام اپنے دوست کے ساتھ سب سے زیادہ کرتا ہے وہ ہے کھیل۔ اِس کھیل کے ذریعہ بچہ سب سے زیادہ علم حاصل کرتا ہے۔ دونوں کا کھلونوں سے کھیلنا اُنہیں فطرت میں موجود چیزوں کے بارے میں علم سے آشنا کرتا ہے۔ بچے کو احساس ہوتا ہے کہ اُس کا دوست کسی کھلونے کے بارے میں کوئی ایسی بات بتا رہا ہے جو اُس کی اپنی نظر سے اُوجھل تھی۔ تب اُسے اپنے دوست کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے جسم سے کھیلتے ہیں۔ یعنی آنکھوں کو ہاتھ لگاتے ہیں، کُشتی کرتے ہیں یوں اُن کو انسانی جسم کے بارے میں علم حاصل ہوتا ہے۔

کھیل بچے کے لیے علم حاصل کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے اور اوائل عمر میں بچے کے لیے اُس کے بہن بھائی بھی دوست کی رغبت میں آتے ہیں وہ اپنی بڑی بہن یا بھائی کو بھی دوست شمار کرتا ہے کیونکہ ابھی اُس کے اندر خاندان اور خاندانی درجہ بندی کی رغبت پیدا نہیں ہوئی ہوتی۔ بعض مشرقی معاشروں میں چھوٹے بچے کو اپنے بڑے بھائی یا بہن کا نام لیتے ہوئے اُس کے ساتھ ایک احترام کا لفظ ضرور ملانا سکھایا جاتا ہے۔ مثلاً باجی یا بھائی جان لیکن بچہ چونکہ اُنہیں دوست سمجھتا ہے اِس لیے وہ ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے اور باوجود کوشش کے اُنہیں احترام سے نہیں بُلاتا۔ عمر کے ساتھ ساتھ دوست کی ترغیب میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے۔ پہلے جو دوست علم حاصل کرنے کا ذریعہ تھا آگے چل کر عزتِ نفس کا باعث بن جاتا ہے۔ انسان ایسے دوست کی تلاش میں رہتا ہے جس سے اُس کی ذہنی ہم آہنگی ہو سکے جس کی بدولت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشرتی رغبتیں

وہ خوف، غم، لذت، انعام اور اُمید جیسے تمام جذبات ظاہر کرنے کے قابل ہو جائے۔ ایسا کرنے سے ایک فرد کو جسمانی تحفظ کا احساس ہوتا ہے اور اُس کی عزتِ نفس بحال ہو جاتی ہے اگرچہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہی ہو۔ جوں جوں انسان کی رغبتوں میں اضافہ ہوتا ہے اُسے دوست کی رغبت میں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

جوانی تک انسان کے بہت سے دوست بن جاتے ہیں جن سے وہ اپنے جذبات اور اُن سے وابستہ رغبتوں کا اظہار کرسکتا ہے۔ پھر رغبتوں کی نوعیت میں بھی فرق ہے۔ بعض لوگ ایک دوست کے ساتھ ہی ساری بات کہہ سُن لیتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ بہت سے دوستوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی بات کرتے ہیں۔ مثلاً کاروباری حضرات کچھ دوست ایسے رکھتے ہیں جن سے وہ اپنی تجارت کی رغبت کے بارے میں گفتگو کریں گے لیکن سواری کی رغبت کے بارے میں باتیں کرنے کو اُن کے دوست مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ کاروباری رغبت رکھنے والا دوست ممکن ہے سواری کی رغبت نہ رکھتا ہو۔ چونکہ مرد کا دائرۂ اثر زیادہ وسیع ہے اور اُس پر ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں اِس لیے اُس کی رغبتوں کی تعداد بھی عورت سے زیادہ ہوتی ہے اکثر مردوں کی دوست کی رغبت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اُن کے دوست کئی قسم کے ہوتے ہیں جن سے وہ مشترکہ رغبت کی باتیں کرتے ہیں۔ دوستی کی ابتداء کسی ملاقات سے ہوتی ہے۔ دو افراد اِسی پہلی ملاقات میں اندازہ لگالیتے ہیں کہ اُن کی رغبتیں کس قدر مشترک ہیں۔ اگر اُن کو کوئی ایک رغبت مشترک لگے تو دوستی میں وقت لگ سکتا ہے۔ لیکن اگر کئی رغبتیں مشترک ہوں تو دوستی جلد ہو جاتی ہے۔ اور اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک دونوں افراد کی رغبتیں مشترک رہیں۔ اِسی لیے ۱۰ سے ۲۵ سال کی عمر کی دوستیاں بعد کی عمر میں اکثر قائم نہیں رہتیں کیونکہ آگے چل کر افراد کی رغبتوں میں تبدیلی آجاتی ہے اور دوستی کی ضرورت نہیں رہتی۔ مثلاً ممکن ہے کہ ۱۴ سال کے دوستوں کی خاص رغبت گاڑیاں ہوں اور اِسی کی بدولت اُن کی دوستی پکی ہو۔ لیکن آگے چل کر ہو سکتا ہے کہ ایک کی رغبت گاڑیاں رہیں جبکہ دوسرے کی رغبت میں زراعت سواری سے اہم ہو جائے تو اُن کی دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔

شوہر اور بیوی

اللہ نے انسان کو بالخصوص مرد کو ایک دوست ایسا دیا ہے جس کی رغبت عین اُس کے مطابق ہوتی ہے یا ہو جاتی ہے اور وہ ہے اُس مرد کی بیوی۔ عورت شادی کے بعد کچھ عرصے میں ہی یہ بھانپ لیتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشرتی رغبتیں

ہے کہ اُس کے شوہر کی رغبتیں کیا کیا ہیں۔عورت کو اللہ نے یہ لچک اور فراخ دلی دی ہے کہ وہ اپنی رغبتوں کو جو شادی سے پہلے کچھ بھی ہوں کم کر کے اپنے شوہر کی رغبتوں کو اگر اپناتی نہیں تو کم از کم اُن میں دلچسپی ضرور پیدا کر لیتی ہے۔ممکن ہے عورت کی اپنی رغبت سونا اور جواہرات ہو لیکن اُس کے خاوند کو اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو اور اُس کی تمام تر رغبت تجارت ہو۔تو عورت سونا چاندی کی رغبت کم کر کے اپنے اندر تجارت کی رغبت پیدا کر لے اور اِس مرد کی اچھی دوست ثابت ہو۔یعنی عورت،مرد کی رغبتوں سے پیدا ہونے والے جذبات کو اپنا لیتی ہے اور یوں میاں بیوی ایک دوسرے کو اعتدال اور سکون عطا کرتے ہیں۔یہی کام انسان کے جسم پر لباس کرتا ہے۔لباس انسان کو دھوپ اور سردی سے بچا کر اعتدال اور سکون مہیا کرتا ہے اور اِسی وجہ سے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔یہاں پر لباس سے مراد جسم کا لباس نہیں بلکہ اُن جذبات کا لباس ہے جو رغبتوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کو ڈھانپنے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔دوست کے ساتھ وابستہ ہمارے پانچ بنیادی جذبات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ہمیں دوست کی ناراضگی اور تکلیف کا خوف رہتا ہے۔ہمیں اُس کی جدائی یا ماضی میں اُس کو خوش نہ رکھنے کا غم ہوتا ہے۔دوست کی محبت لذت مہیا کرتی ہے اور ہم ہمیشہ پُر اُمید رہتے ہیں کہ ہمیں دوست کی محبت کا انعام میسر آئے گا۔

چونکہ ہم دوست کے زمرے میں بیوی کا ذکر پہلے بھی کر چکے ہیں اِس لیے اب ہمارا رخ شوہر اور بیوی کی رغبت کی طرف ہے۔غالباً جنت میں آنے کے بعد حضرت آدم کے اندر جو پہلی معاشرتی رغبت پیدا کی گئی وہ بیوی کی ہی تھی کیونکہ باقی کی ساری معاشرتی رغبتیں اِسی ایک رغبت کی بدولت وجود میں آئی ہیں۔بیوی اور شوہر ایک دوسرے کے لیے دوست تو ہیں ہی لیکن اُن کی دوستی کی نوعیت میں کچھ فرق ہے۔مرد کے لیے بیوی جنسی سکون اور لذت کا ذریعہ ہے۔بیوی کے ساتھ اِس تعلق کی وجہ سے مرد کے سارے دن کی تھکن اور ذہنی کھچاؤ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔دوسرے یہ کہ مرد کو گھر کا سکون بھی بیوی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔پھر جب بیوی اپنے خاوند کی دلجوئی کرتی ہے۔اُس کی تعریف کے ساتھ ساتھ اُسے حوصلہ دیتی ہے تو اِس سے مرد کا نہ صرف پورے دن میں بننے والا منفی رویہ مثبت ہو جاتا ہے بلکہ اِس کی بدولت اُسے اگلے دن کے لیے ہمت اور ذہنی طاقت بھی میسر آتی ہے۔دوسری طرف عورت کے لیے خاوند ایک پناہ ہے جس کے سائے میں عورت خود کو محفوظ تصور کرتی ہے۔عورت فطری طور پر مرد سے کمزور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔اور چونکہ اُس کا باپ اُسے ہمیشہ یہ پناہ مہیا نہیں کرسکتا اِس لیے اُسے باپ کے بعد خاوند کی پناہ کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ بڑے بڑے کام کرلیتی ہے اگر یہ پناہ موجود ہو۔اِس کے برعکس مرد کے لیے بیوی پناہ نہیں بلکہ سکون ہے۔میاں بیوی کے رشتے میں یہی بنیادی فرق ہے۔اِسی وجہ سے دونوں کے جذبات میں بھی فرق ہوتا ہے۔مرد کو عورت کے جنسی تعلق، دلجوئی اور تعریف سے لذت ملتی ہے۔جبکہ عورت کو مرد کے ساتھ جنسی لذت تو ملتی ہے لیکن اُس سے کہیں زیادہ لذت اُسے مرد کی صحبت، محبت اور ہمدردی سے میسر آتی ہے۔مرد کو اُمید ہوتی ہے کہ بیوی اُس کی آسائش کا سامان مہیا کرے گی۔بیوی کے ہاتھ کا کھانا، اُس کا لمس اور جسمانی تعلق مرد کے لیے انعام ہوتا ہے۔جبکہ بیوی مرد کی طرف سے ملنے والا سہارا اور تحفظ انعام کے طور پر قبول کرتی ہے۔مرد کو غم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تحفظ فراہم نہیں کرسکا یا یہ کہ اُس کی بیوی اُس کو سکون نہیں پہنچاتی اور اپنی خواہشات کو اُس کے سکون پر حاوی کرلیتی ہے۔دوسری طرف بیوی کو غم ہوتا ہے کہ اُس کا خاوند اُس کو تحفظ نہیں دے سکا اور اُس کو پناہ دینے میں ناکام رہا۔خاوند اور بیوی کو ایک دوسرے کی جدائی، بیماری اور موت کا خوف ہوتا ہے جو کہ ایک فطری امر ہے۔

اولاد

خاوند اور بیوی کے تعلق کی وجہ سے ایک اور رغبت وجود میں آتی ہے اور وہ ہے اولاد کی رغبت۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی نسل کی بقاء کے لیے والدین میں اولاد کی بے پناہ رغبت رکھی ہے۔انسان اِس رغبت پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا۔اولاد کے پیدا ہوتے ہی یہ رغبت اُمڈ آتی ہے۔اولاد کی رغبت اتنی طاقتور ہے کہ صرف بچے کی مسکراہٹ ہی والدین کے لیے بے پناہ لذت کا باعث ہوتی ہے۔انسان کو اپنی اولاد کو لاحق ہونے والی بیماریوں اور پریشانیوں کا دُکھ رہتا ہے۔اِسی طرح وہ اپنی اولاد کی ناکامیوں اور بیماریوں سے خوف محسوس کرتا ہے۔پھر اولاد کی تعلیمی اور معاشی کامیابیاں والدین کے لیے انعام ہوتی ہیں۔والدین اُمید رکھتے ہیں کہ اُن کی محنت کی بدولت اُن کی اولاد بہت سے انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

والدین

والدین میں تو اولاد کی رغبت بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی قوی ہو جاتی ہے۔لیکن اولاد میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشرتی رغبتیں

والدین کی رغبت بہت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ اِس رغبت کے تخلیق ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک فرد اپنے پیروں پر کھڑا ہو یعنی اُسے اپنے ماں باپ کی ضرورت بنیادی رغبتوں کے لیے نہ ہو۔ وہ اپنی غذا اور جسمانی تحفظ کا ذمہ دار ہو۔ یہ استعداد اور عقل حاصل کرنے کے بعد ہی اولاد میں والدین کی رغبت پیدا ہوتی ہے ایسی رغبت میں انسان کو یہ غم ہوتا ہے کہ اُس کے والدین کئی باتوں کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتے یا اُن کی زندگی میں ایک جھول ہے جسے اب وہ ٹھیک نہیں کرسکتا۔ اُسے اپنے ماں باپ کی ناراضی، صحت اور زندگی کا خوف رہتا ہے۔ اِس لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ اُس کے ماں باپ اطمینان سے رہیں۔ اب یہاں سے مغربی اور مشرقی معاشروں میں والدین کی رغبت کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔

مغرب میں والدین کی رغبت عام خاندان کی رغبت کی طرح ہے آپ جن لوگوں سے خونی رشتہ رکھتے ہیں اُن کے لیے ایک خاص ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً آپ اُن سے ملتے ہیں اور خاص مواقع پر اُن کے ساتھ تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ خاندان اور پھر والدین آپ کی ذمہ داری نہیں ہوتے۔ تب ہی تو مغربی معاشرے میں بوڑھے ماں باپ کو ساتھ رکھنے کا رواج نہیں۔ اِس کے برعکس مشرقی معاشرے میں ماں باپ کی رغبت اتنی شدید ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ نہ صرف انسان کے مشاہدے پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ اُس کی وجہ سے انسان میں کئی اور رغبتیں بھی جنم لیتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ کسی انسان میں خود تو سواری کی رغبت نہ ہو لیکن والدین میں ہو اور پھر والدین کی اِس رغبت کو حاصل کرتے کرتے خود اُس میں سواری کی یہ رغبت اپنے والدین سے بھی زیادہ شدت سے پیدا ہو جائے۔ ماں باپ کا لمس اُن کی مسکراہٹ، خوشی اور سکون انسان کے لیے لذت کا باعث ہوتے ہیں۔ ماں باپ کو یہی چیزیں دینے کی اُمید انسان میں زندہ ہوتی ہے اور والدین کو خوش کرنا ہی انسان کا انعام ہوتا ہے۔

خاندان

والدین کی وجہ سے ہی انسان میں ایک اور رغبت پیدا ہوتی ہے اور وہ ہے خاندان کی۔ ایک بالغ فرد کے لیے خاندان کی تشریح کئی طرح سے ہوسکتی ہے لیکن بنیادی طور پر اِس میں اُس کے خون کے رشتے شامل ہیں۔ اِس کے بہن بھائی، خالہ، چچا، تایا وغیرہ سب اِسی رغبت کا حصہ ہیں۔ مغربی معاشرے میں چونکہ والدین کی رغبت کمزور ہوتی ہے اِس لیے خاندان کی رغبت بھی اتنی شدید نہیں ہوتی۔ دوسری طرف مشرقی معاشرے میں والدین کی رغبت مضبوط ہونے کی وجہ سے خاندان کی رغبت بھی مغرب سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ اِس رغبت کی بدولت انسان اپنے خاندان کے لوگوں سے جُڑ کر رہتا ہے۔ اُسے اپنے خاندان کے لوگوں کی خوشی اور ترقی میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ خاندان کی رغبت کا مسئلہ بھی عجیب ہے ایک تو انسان کو خاندان والوں کی ناراضی کا خوف ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے خاندان والوں کی ناکامی کا بھی خوف رہتا ہے اور اگر اُس کے خاندان کا کوئی فرد بہت کامیاب ہوجائے تو وہ اِس غم میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اُس کے حالات خاندان کے دوسرے فرد جیسے اچھے کیوں نہیں اور یوں غم سے حسد جنم لیتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اِس فرد کے دل میں پہلے سے کوئی خاص مادی رغبت نہ ہو۔ لیکن اپنے خاندان کے ایک فرد کے نئے گھر کو دیکھ کر اس میں بھی مکان کی رغبت پیدا ہوجائے۔ خاندان والوں کا پیار اُس کے لیے ایک انعام ہوتا ہے جس کی اُمید میں وہ اپنے خاندان والوں کی خوب مہمانداری کرتا رہتا ہے اور بعض اوقات بہت اچھا برتاؤ کرنے کے باوجود جب اُسے خاندان والوں سے عزت نہیں ملتی تو وہ اس رغبت کے غم میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

قبیلہ

خاندان کی رغبت ہی آگے بڑھ کر قبیلے کی رغبت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اُس کے آباواجداد نے بڑے کام کئے تھے۔ پھر وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کی خاص شکل وصورت، بولنے کا انداز اور قد کاٹھ قبیلے کے دوسرے افراد سے ملتا ہے۔ یوں انسان اپنی عزتِ نفس کی خاطر اپنے قبیلے کے ساتھ اپنی شناخت کرتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ قبیلے کی رغبت عزتِ نفس کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ خود ایک طاقتور رغبت بن جاتی ہے۔ انسان اپنے قبیلے کی حفاظت اور سربلندی کے لیے مال، وقت اور جان سب قربان کرنے کو تیار ہوجاتا ہے۔ قبیلے کی رغبت میں بھی دو انتہائیں نظر آتی ہیں۔ یہ رغبت یا تو ایسے لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنی عزتِ نفس کو بڑھانے کے خواہش مند ہوں۔ یا پھر اُن لوگوں میں شدید ہوتی ہے جن کی اپنی عزتِ نفس بہت طاقتور ہو اور اُنہیں یہ احساس ہو کہ اُن کے قبیلے کے لوگ کمزور ہیں یعنی اُن کی عزتِ نفس اُتنی بلند نہیں جتنی اُن کی اپنی ہے۔ تب وہ اپنے قبیلے کی ترقی کے لیے کوشاں ہوجاتے ہیں۔ اپنے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر، اُن کے حالات کو بہتر بنا کر اُنہیں لذت ملتی ہے۔ اُنہیں مخالف قبیلے کے حملے سے لے کر مخالف کی معاشرتی اور معاشی ترقی کا خوف رہتا ہے۔ انہیں اپنے قبیلے کے مٹ جانے، یا تنزل کا شکار ہونے کا شدید خوف ہوتا ہے۔ پھر اپنے قبیلے کی سطوت کے کھوجانے یا ترقی کے

معاشرتی رغبتیں

مواقع نہ ملنے کا غم بھی ہوسکتا ہے۔ قبیلے کے وقار میں اضافہ اُن کے لیے ایک انعام ہے۔

میڈیا اور ذرائع آمدورفت کی وجہ سے دنیا جب سے ایک ''عالمی گاؤں'' میں تبدیل ہوئی ہے اُس کے بڑے بڑے چوہدریوں کی کُل تعداد اب چند سو سے زیادہ نہیں۔ اور وہ دنیا کی کُل معیشت اور معلومات کا کم از کم ۷۰ فیصد اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ اُن میں بہت سے یہودی کچھ عیسائی اور قلیل تعداد میں مسلمان ہیں۔ اُن کے نزدیک مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن مادہ پرستی گاؤں کا سرکاری معاشرہ تصور کیا جاتا ہے۔ وہ گاؤں کو دو قبیلوں میں بانٹنا چاہتے ہیں جس میں وہ اب کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ ایک قبیلہ جو زندگی میں تفریح اور عیاشی کا خواہش مند ہے۔ جو چوہدریوں کا جاری کردہ اخبار پڑھتا ہے۔ اِنہی میں سے ایک چوہدری کی فیکٹری کے بنے TV پر گھنٹوں چوہدریوں کی مرضی کے پروگرام دیکھ کر گاڑی، مکان اور جواہرات کی رغبت پیدا کر لیتا ہے جس کو پورا کرنے کے لیے اُسے کسی چوہدری کے بینک سے سود پر قرضہ لینا پڑ جاتا ہے۔ یہ قبیلہ چوہدریوں کا چہیتا ہے۔ اِس کے علاوہ وہ تمام لوگ جو دُنیا کو عارضی سمجھتے ہوئے مادہ پرستی میں مبتلا ہونے پر آمادہ نہیں چوہدریوں کو قبول نہیں۔ اِس لیے چوہدریوں نے اُنہیں دوسرے قبیلے میں شامل کر کے انتہا پسندوں کا نام دے دیا ہے۔ آپ نے گاؤں میں جنگ کروانی ہے تو دو قبیلے بنوا دیں اور پھر ایک قبیلے کے دل میں یہ خوف ڈال دیں کہ دوسرا قبیلہ اُن کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ جنگ شروع ہو جائے گی اور یہی آج دنیا میں ہو رہا ہے۔ چوہدریوں کے پسندیدہ قبیلے کو خوف ہے کہ دوسرا قبیلہ اس کی آزادیاں ختم کر دے گا یا غصے میں آ کر دنیا کو مٹا دے گا۔ اُسے مخالف قبیلے کو اذیت دے کر اور اس کے خوف سے نجات حاصل کر کے لذت مل رہی ہے۔ اُسے اُمید ہے کہ چوہدری اپنی عقل اور فراست کی بنا پر بنیاد پرستوں سے نجات حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے اُنہیں اپنے قبیلے کے بہت سے لوگوں کا غم ہے جو دوسرے قبیلے سے جا ملے ہیں اور اُن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُنہیں غم ہے کہ مزے سے زندگی گزر رہی تھی یہ نیا قبیلہ بیچ میں کہاں سے آ ٹپکا۔

اسی طرح سماجی، کاروباری، تجارتی، سیاسی،، طلبا اور مزدور تنظیمیں بھی قبیلوں ہی کی ایک مصنوعی صورت ہیں۔ انسان ان سے کامیابی کی اُمید رکھتا ہے۔ اپنی تنظیم کا نشان (Logo) دیکھ کر لذت محسوس کرتا ہے۔ تنظیم کی بدنامی پر غم میں مبتلا ہوتا ہے۔ تنظیم کی ناکامی کا خوف دل میں ہوتا ہے۔ مالی فوائد انعام ہوتے ہیں۔ اسی طرح ممالک کی موجودہ تقسیم بھی قبیلوں کی مصنوعی صورت ہے۔ ان کے حوالے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے بھی ہمارے پانچوں جذبات بنتے ہیں۔

سماج

والدین سے شروع ہونے والی رغبت، خاندان اور پھر قبیلہ کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے سماج پر مکمل ہوتی ہے۔ کسی دور میں جب انسان چھوٹی بستیوں میں قبیلے کی شکل میں رہتا تھا تب انسان کا قبیلہ اور معاشرہ ایک ہی تھے۔ قبیلے کی کچھ روایتیں اور معاشرتی ضوابط تھے جو اُس کا سماج تصور کیے جاتے تھے۔شہروں میں آکر رہنے سے قبیلہ اور سماج ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔ سماج اب کلچر کا نام ہے۔ سماج کسی علاقے یا ملک کے لوگوں کے رہن سہن، فیشن، موسیقی، تفریح اور تہواروں کا نام ہے۔ ہوسکتا ہے یہ لوگ اپنے قبیلے کے تہوار منانے کے لیے اپنے قبیلے کے ساتھ جمع ہوتے ہوں لیکن اپنے ملک کے تہوار پورے ملک کے ساتھ مل کر مناتے ہوں۔ ایرانی سماج میں نوروز کا تہوار ہے جو وہاں کے لوگ مناتے ہیں اِسی طرح بعض ملکوں میں بادشاہ کی تاج پوشی بھی ایک تہوار ہوتی ہے جو اُس ملک کے تمام قبیلے اور خاندان مناتے ہیں۔ ۲۰ ویں صدی سے سماج قبیلے پر حاوی ہونا شروع ہو گیا۔ ایسا کرنا یا ہونا کاروبار کے لیے ضروری تھا۔ ایسا کرنے سے فیکٹریوں کی پیداوار میں اضافہ ممکن تھا۔ کیوں؟ قبیلے کی اپنی روایات تھیں اُن کے تہوار اپنی تاریخوں پر پڑتے تھے۔ کسی ایک قبیلے کے لیے چیزیں بنانا اور پھر اُن کو میڈیا پر تشہیر دینا ممکن نہ تھا۔ پھر ایک مسئلہ اُس سے بھی بڑا ہے۔ والدین، خاندان اور قبیلے کی سطح پر ہونے والے پروگراموں اور تہواروں میں مادہ پرستی کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ تین رغبتیں ۱۰۰ فیصد انسانی تعلق، بول چال وغیرہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک قبیلے کے لوگ جب اپنا کوئی تہوار منانے کے لیے جمع ہوتے ہیں تو اُن کے قبیلے کے باقی افراد کے لیے دور سے آئے ہوئے فرد کی موجودگی ایک انعام یا تحفہ ہوتی ہے۔ اِسی طرح خاندان کا ایک ساتھ جمع ہونا، اولاد کا اپنے والدین کی خدمت کرنا بھی لذت کا باعث ہوتا ہے۔

سماج کا حال یکسر مختلف ہے۔ سماج میں ہونے والے تہوار ایک تو بڑے پیمانے یعنی ملک گیر (بلکہ اب تو عالمی) سطح پر ہوتے ہیں دوسرا اُن کی تشہیر بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہے۔ پھر سماج کی سطح پر ہونے والے تہواروں اور تقریبات کو مادی رنگ دینا آسان ہے لوگوں کو سماجی تقریبات، تہوار وغیرہ کے لیے خریداری کرنے پر اُکسایا جاسکتا ہے۔ میاں بیوی، خاندان اور قبیلے کی اکائی کو مضبوط کیے بغیر معاشرے میں مادہ پرستی کا راج ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے جہاں مادہ پرستی ہے وہاں سماج کے پیچھے قبیلے، خاندان اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشرتی رغبتیں

والدین کی رغبت کمزور ہو جاتی ہے اِس کے برعکس اگر سماج کی رغبت کم ہو جائے تو لوگ قبیلے کی رغبت پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب قبیلے کی رغبت میں شدت آتی ہے تو یہ خاندان کی رغبت میں بدل ہو جاتی ہے۔ اور پھر والدین یا اولاد کی رغبت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک ملک میں جہاں لوگ صرف اپنی غرض کی خاطر ایک دوسرے سے تعلق رکھیں مادہ پرستی یعنی نمود و نمائش، تحفے اور انعام کے لالچ میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ سماج کا درجہ ہے۔ اگر اُن میں محبت پیدا ہو جائے تو وہ سماج کو ایک قبیلہ تصور کرتے ہیں اور اپنے ملک کے دوسرے افراد کے لیے قبیلے جیسی رغبت پیدا کر لیتے ہیں۔ پھر اگر یہ محبت بڑھے تو وہ اپنے آپ کو ایک خاندان میں ڈھال لیتے ہیں اور اپنے سے بڑے کو اپنے ماں باپ اور چھوٹے کو اپنی اولاد کی طرح سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

سماج کی رغبت کے زیر اثر پیدا ہونے والے جذبات بہت ظالم ہوتے ہیں۔ انسان کو یہ غم رہتا ہے کہ وہ سماج کے رسم و رواج اور طور طریقوں کے مطابق زندگی نہیں گزار رہا۔ وہ اس دور کو یاد کر کے غمگین ہو جاتا ہے جب اُس کی گفتگو اور رہن سہن سماج کے معیار سے کم تھا۔ پھر اُسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں موجودہ کلچر کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے اُس کا مذاق نہ اُڑایا جائے یا لوگ اُس پر طنز نہ کریں۔ اُسے لذت تب ملتی ہے جب اُس کے آس پاس کے لوگ اِس بات کی تصدیق کریں کہ اُس کا معیارِ زندگی سماج کے قائم کردہ اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اور انسان کی تمام تر محنت اِس اُمید پر ہوتی ہے کہ اُسے سماج میں قبولیت کا انعام ملتا رہے گا۔ سماج میں مقام حاصل کرنے کے لیے انسان کسی رتبے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اُسے سماج کی طرف سے رد کیے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ اِس ڈر کی وجہ وہ غم ہے جو اُسے اُن تمام مواقع پر ملتا ہے جب سماج نے اُس کی یا اُس کے والدین کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا ہوتا۔ اِس غم اور خوف کو کم کرنے کے لیے وہ سماج میں کسی خاص مقام کا متلاشی ہوتا ہے اور یوں رتبے کی رغبت جنم لیتی ہے۔

رتبہ

قوم کے رہنما رتبے کی اِس رغبت کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔ یہ رتبہ اتنا اہم ہوتا ہے کہ اُس کے مل جانے پر بہت سی مادی رغبتوں کی یا تو ضرورت نہیں رہتی یا پھر مادی رغبتیں اُس رتبے کی بدولت خود بخود میسر آ جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں آنے والے جادوگروں کو انعام میں رتبہ ہی پیش کیا تھا۔ گیارہ سال کی عمر کا بچہ بخوبی جانتا ہے کہ اُسے اپنے معاشرے میں کس رتبے سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشرتی رغبتیں

زیادہ عزت مل سکتی ہے۔ مثلاً اگر زیادہ عزت بادشاہ کا درباری ہونے میں ہے تو پھر وہ ہر صورت میں اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کرے گا جس کی بدولت وہ دربار میں جا سکے۔ یا پھر اُسے معاشرے میں مقام فوج میں جانے سے ملے گا تو وہ جسمانی ورزش کرے گا اور فوج میں داخلے کے امتحان کی تیاری میں دن رات ایک کر دے گا۔

رتبے کی رغبت میں لذت عزت سے ملتی ہے۔ یہ عزت اُسے سماج کے لوگوں کی گفتگو، احترام اور تحائف کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اُسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں اُس کا رتبہ کم نہ ہو جائے یا کوئی اور رتبے میں اُس پر حاوی نہ ہو جائے۔ اُسے اُمید ہوتی ہے کہ اُس کا رتبہ بلند تر سے بلند ہوتا جائے گا اور اُس کا انعام لوگوں سے ملنے والی عزت اور رتبے سے ملنے والا مادی فائدہ ہوگا۔ رتبے کے لحاظ سے انسان کا کمتر ماضی یا جس رتبے کی خواہش تھی اُس کا نہ ملنا غم کا موجب ہوتا ہے۔ انسان رتبے کے حوالے سے ہمیشہ اپنے سے اُوپر والے فرد کو دیکھتا ہے۔ دنیا میں کوئی رتبہ ایسا نہیں جس سے اُوپر ایک رتبہ اور نہ ہو۔ اگر موجودہ دور میں نہ ہو تو تاریخ میں تو کوئی رتبہ ایسا مل ہی جاتا ہے جسے نہ پانے کا انسان کو غم ہوتا ہے۔ اگر وہ رتبہ جس کا انسان خواہش مند ہو تاریخ کا حصہ ہو تو انسان کچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر ایسا رتبہ اُس کے آس پاس ہو تو انسان پہلے تو اُس کے حامل فرد سے حسد کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ حسد ایک نئی رغبت کو جنم دیتا ہے اور وہ رغبت ہے: دشمن۔

دشمن

انسان وہ واحد مخلوق ہے جو اپنے اندر دشمن کی رغبت کو پرورش کرتا ہے۔ شیر جیسا خونخوار درندہ جو ہرن کا شکار کرتا ہے اور دوسرے شیروں سے لڑتا ہے اپنے اندر دشمن کی رغبت نہیں رکھتا۔ دشمن کی رغبت اگر لمبے عرصے تک اپنا وجود برقرار رکھ لے تو کافی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اِس کا وجود تو کسی اور رغبت کا مرہونِ منت ہوتا ہے جیسے کہ کسی اور کو وہ رتبہ مل جائے جس کا انسان خواہش مند ہو تو پھر انسان دشمن کی رغبت پیدا کر لیتا ہے، لیکن زیادہ دیر تک انسان کے اندر اِس رغبت کا وجود رہ جائے تو پھر اصل رغبت جس کی وجہ سے یہ رغبت پیدا ہوئی تھی ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک انسان کو والدین کی رغبت ہے۔ اِس کے والدین کو کسی فرد سے دکھ پہنچا۔ ممکن ہے کہ والدین کچھ عرصے بعد اُس دکھ کو بھول کر دکھ دینے والے فرد کو معاف کر دیں لیکن اولاد معاف نہ کرے اور والدین کی رغبت کی بدولت دشمن کی رغبت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیدا کر لے۔ پھر والدین کا انتقال ہو جائے لیکن اُس کے بعد بھی کئی سال تک اولاد میں دشمن کی رغبت موجود رہے۔ بعض اوقات عورت کسی مرد سے شادی کی خواہشمند ہوتی ہے لیکن وہ مرد اُس عورت کو ٹھکرا کر کہیں اور شادی کر لیتا ہے ایسی صورت میں یہ عورت جس مرد سے محبت کرتی تھی اُس کو دشمن بنا لیتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ایسی عورتیں زندگی بھر اُس فرد کے لیے دشمن کی رغبت رکھتی ہیں جس نے اُنہیں ٹھکرا دیا تھا۔ دشمن کے حوالے سے پانچ بنیادی جذبات بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ انسان کو یہ ڈر رہتا ہے کہ اُس کا دشمن کہیں کوئی خوشی حاصل نہ کر لے۔ اُسے یہ غم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمن کو اتنی تکلیف نہیں پہنچا سکا جتنی اُسے پہنچنی چاہیے تھی۔ تکلیف پہنچانے کا جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان اپنے دشمن کو تکلیف میں دیکھ کر لذت محسوس کرتا ہے۔ اُسے اُمید ہوتی ہے کہ اُس کا دشمن ناکام ہو گا اور شدید تکلیف کا شکار رہے گا۔ یہی اِس کا انعام ہوتا ہے۔ دشمن ذاتی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی مثلاً انسان کی اپنے خاندان میں دشمنی ہو سکتی ہے۔ اُس کی دشمنی قبیلے میں بھی ہو سکتی ہے۔ اجتماعی دشمنی کی صورت میں پورے قبیلے یا ملک کے دشمن کو انسان اپنا ذاتی دشمن تصور کرتا ہے۔ لیکن دشمنی کا ایک پہلو تو بہت ہی خطرناک ہے یہ دشمنی ہے اپنی ذات سے۔ بعض دفعہ انسان اپنا ہی دشمن بن جاتا ہے۔ وہ خود کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے اُسے خود سوزی میں لذت میسر آتی ہے۔ اپنی ذات سے دشمنی کی انتہاء خودکشی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔

رہنما

رہنما بذاتِ خود ایک طاقتور رغبت ہے جو دوسری کئی رغبتوں کا موجب بنتی ہے۔ ہر رہنما کے حوالے سے اُس کے پیروکاروں کے پانچ بنیادی جذبات ہوتے ہیں۔ اُنہیں اپنے رہنما کی صحبت میں لذت ملتی ہے، پھر اُنہیں اپنے رہنما کا حکم بجا لا کر بلکہ اُس کے حکم پر جان قربان کر کے بھی لذت ملتی ہے۔ اُنہیں اپنے رہنما کی جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اُنہیں یہ بھی ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اُن کا رہنما اُن سے ناراض نہ ہو جائے۔ اُنہیں اِس بات کا بھی غم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رہنما کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکتے پھر اُنہیں یہ بھی غم ہوتا ہے کہ دنیا نے اُن کے رہنما کو تسلیم نہیں کیا۔ اِس کے علاوہ اُنہیں اُن تمام مواقع کا سوچ کر دکھ ہوتا ہے جب اُنہوں نے اپنے رہنما کی بات نہیں مانی تھی۔ رہنما کی کامیابی اور اُس کی طرف سے ملنے والی تعریف اُن کا انعام ہوتی ہے جس کی اُمید میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہم معاشرتی رغبتوں میں جس رغبت کا ذکر اب کر رہے ہیں وہ مرد میں تو ہوتی ہے لیکن عورتوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نہیں۔اور یہ رغبت ہے عورت کی۔قرآن خاص طور پر مردوں میں اِس رغبت کا ذکر کرتا ہے۔شاید جنسی تعلق کی وجہ سے یا پھر اِس لیے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہے۔مرد عورتوں کے لیے خاص رغبت رکھتا ہے۔مرد کے برعکس عورت ایک ہی مرد کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہے بشرطیکہ وہ مرد اُسے ٹھیک سے تحفظ فراہم کر سکے اور اُس کی عزتِ نفس کا بھی خیال رکھے۔لیکن مرد ایک عورت سے سکون اور جنسی لذت ملنے کے باوجود مزید عورتوں سے تعلق کا خواہش مند رہتا ہے۔مرد کی اِسی رغبت کی تکمیل کے لیے اُسے چار شادیوں تک کی اجازت دی گئی ہے۔مرد کو ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے لذت ملتی ہے۔اُسے عورتوں کے ساتھ صحبت میں سکون اور خوشی میسر آتی ہے۔وہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے بارے میں پُر اُمید رہتا ہے۔اُسے غم رہتا ہے کہ وہ ماضی میں فلاں عورت کے ساتھ تعلق قائم نہ کر سکا یا یہ کہ اُسے زیادہ عورتوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے مواقع میسر نہیں آئے۔پھر اُسے یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ اُس کے تعلق میں کوئی رخنہ نہ پڑ جائے یا یہ کہ جن عورتوں کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں وہ تعلقات خراب نہ ہو جائیں۔عورتوں کی صحبت اُس کے لیے ایک انعام ہوتا ہے جس کے لیے وہ کوشاں رہتا ہے۔عورتوں کی رغبت کے اِس ذکر کے ساتھ ہی ہماری ۲۷ رغبتوں کا ذکر مکمل ہوا۔

آپ انسانی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں آپ کو تمام تر انسانی تاریخ اِنہی ۲۷ رغبتوں کے گرد گھومتی نظر آئے گی۔اِسی طرح آپ ادب یا شاعری کی کوئی بھی چیز پڑھ لیں۔وہ بھی اِن ۲۷ رغبتوں کی وجہ سے جنم لیتی ہوئی محسوس ہوگی۔آپ اپنی شخصیت یا اپنے اِرد گرد کسی بھی فرد کی شخصیت کا جائزہ لیں آپ کو اِن کے تمام اعمال، گفتگو اور مستقبل کا لائحہ عمل اِنہی ۲۷ رغبتوں کے تانے بانے سے بُنے ہوئے نظر آئیں گے۔

---

۱۸. دل و دماغ

ہر طرف زرق برق لباس میں لوگ گھوم رہے ہیں۔ شامیانے کے باہر گاڑیوں کا اژدہام ہے۔ شامیانے کے اندر ریشمی غلاف والی کرسیوں پر بیٹھے لوگ دلہن کو دیکھ رہے ہیں جو سٹیج پر بیٹھی اپنی کزن سے باتیں کر رہی ہے۔ گھر کے مہمان خانے کا دروازہ کُھلتا ہے اور لڑکی کی ماں بڑے فخر سے ٹینٹ تلے جمع عورتوں کو اندر آنے کا اشارہ کرتی ہے۔ اُس کی دعوت پر عورتیں پلک جھپکنے میں کھڑی ہو جاتی ہیں اور مہمان خانے کی طرف دوڑ لگا دیتی ہیں۔ مرد پیچھے ہاتھ ملتے اپنی قسمت پر افسوس کرتے ہیں کہ کاش اُنہیں بھی یہ دیدار نصیب ہوتا۔ مہمان خانے میں سے صوفے کرسیاں پہلے ہی نکال دی گئیں تھیں اب وہاں کمرے کے بیچ میں ایک بڑی سی میز پڑی ہے جس کے گرِد شادی میں آئی عورتیں ایک مجمع کی صورت میں جمع ہیں۔ دُور سے یوں لگتا ہے جیسے کھانا کُھل گیا ہو لیکن کسی کے ہاتھ میں نہ تو پلیٹ ہے نہ ہی منہ چل رہا ہے۔ پھر یوں لگتا ہے کہ یہ کسی بزرگ کی بات سُن رہی ہیں لیکن ایسا بھی نہیں اور نہ ہی وہاں کوئی وعظ ہو رہا ہے۔ یہ سب میز پر رکھا لڑکی کا جہیز دیکھ رہی ہیں۔ بھاری بھاری ڈیزائن کے سیٹ۔ وزنی وزنی کڑے جن میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ اِس کے علاوہ گھڑیاں، مردانہ گرم کپڑے اور باورچی خانے میں استعمال ہونے والی بجلی کی مشینیں۔ تمام عورتیں ان سب چیزوں کو دیکھ رہی ہیں۔

ہم ہند و پاک کی اِس شادی سے کرۂ ارض کی دوسری طرف امریکہ کی ایک شادی پر چلتے ہیں جہاں میاں بیوی پہلے کورٹ میں جاتے ہیں اور ایک قانونی دستاویز پر دستخط کرتے ہیں۔ اِس دستاویز پر لکھا ہے کہ طلاق کی صورت میں مرد عورت کو اپنی آدھی جائیداد دے گا۔ اُس کے بعد یہ دونوں چرچ (Church) جاتے ہیں جہاں بہت سے لوگوں کی موجودگی میں مرد عورت کو ایک قیمتی ہیرے کی انگوٹھی پہناتا ہے۔ جوں ہی پادری شادی کی رسم مکمل ہونے کا اعلان کرتا ہے لڑکی کے عزیز و اقارب اِس کے پاس جا کر اُس کی انگلی میں چمکتی انگوٹھی کو خوشی اور حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ لوگ شادی کے موقع پر زیور اور کپڑے کیوں دیکھتے ہیں؟ وہ کیوں شادی کے موقع پر جائیداد کا بٹوارہ کرتے ہیں؟ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری رغبتیں ہمارے عمل کو جنم دیتی ہیں۔ انسان آج تک کوئی ایسا عمل نہیں کر سکا جس کے پیچھے کوئی رغبت نہ ہو اور ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ کوئی طاقتور رغبت کسی جذبے کے ملاپ سے تخلیق ہو اور وہ کسی عمل کی صورت میں نمودار نہ ہو۔ رغبت اور جذبے کے

دل ودماغ

ملاپ سے جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ ہے محرک اور ہر محرک کسی نہ کسی عمل کو جنم دیتا ہے انسانی نفسیات کے اِس پہلو کو اُجاگر کرنے کے لیے ہم ایک فارمولے کا سہارا لیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ D = E x A یہاں D سے مراد محرک (Drive) ہے۔ جبکہ E کا مطلب جذبہ (Emotion) اور A کا مطلب ہے رغبت (Aspiration)۔

محرک ہماری شخصیت بھی ہے اور ہمارا ارادہ بھی۔ انسان کے عمل کو سمجھنے کے لیے محرک کو سمجھنا ضروری ہے اور محرک اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک جذبہ اور رغبت سمجھ میں نہ آئیں۔ ہر انسان کا عمل اُس کے محرک کی وجہ سے ہوتا ہے جو اُس کے جذبات اور رغبتوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ چونکہ محرک کا انحصار جذبات اور رغبتوں پر ہے اِس لیے انسان کے محرکات اُتنے ہی طاقتور ہوں گے جتنے اُس کے اِس فارمولے میں جذبات مضبوط ہوں گے۔ اِسی طرح جوں جوں ترغیبوں میں اضافہ ہوتا جائے گا محرکات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

جن ترغیبات کا جذبہ طاقتور ہوتا ہے وہ زیادہ طاقتور محرک کو جنم دیتا ہے۔ یہ محرک دوسری کمزور ترغیبات پر حاوی آجاتا ہے۔ ممکن ہے ہم کسی ایک ترغیب کی وجہ سے پیدا ہونے والے محرک کے تحت کام کررہے ہوں یا کام کرنے پر مجبور ہوں لیکن ایک دوسرا محرک جو پہلے محرک سے زیادہ طاقتور جذبہ رکھتا ہو ہمارے پہلے عمل پر حاوی ہوجائے یا اُس میں پہلے سے زیادہ طاقتور ترغیب کا رنگ جھلکنے لگے۔ اب ہم واپس چلتے ہیں شادی کی دو تقریبات میں جن کا ذکر ہم نے اِس باب کے شروع میں کیا تھا۔ شادی کا انعقاد تو میاں بیوی کی رغبت کی وجہ سے ہورہا ہے۔ میاں بیوی کی رغبت جسمانی تحفظ اور پھر عزتِ نفس کے حوالے سے بنیادی رغبت ہے۔ لیکن جہیز اکٹھا کرنے، اُسے دکھانے اور دیکھنے کا عمل، شادی سے پہلے ایک معاہدے پر دستخط اور اُس کے بعد انگوٹھی میں لگے ہیرے کی قدر شناسی یہ سب کچھ ایک دوسری رغبت کے تحت ہورہا ہے۔ یہ رغبتیں ہیں مال اور ہیرے جواہرات کی۔ یہ دو رغبتیں دنیا کے دونوں سروں پر رہنے والے لوگوں میں اتنی مضبوط ہیں کہ اِن کا اظہار اپنے اپنے طریقے سے وہاں کے لوگوں کی شادی میں نظر آرہا ہے۔ یوں انسان اپنی ایک رغبت کی وجہ سے کسی دوسری ترغیب کا عملی مظاہرہ کرتا ہے۔ ممکن ہے رتبہ کی رغبت رکھنے والا شخص سواری کی رغبت قطعی طور پر نہ رکھتا ہو۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ نئی سواری حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ تو دراصل اُسے یہ احساس ہوا ہے کہ اچھی سواری رتبہ حاصل کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لیے ضروری ہے۔

یہی اصل مسئلہ ہے کہ محرک اور عمل کے تعلق کا پتہ چلانا مشکل کام ہے۔ انسان عمل کرتے وقت اپنے محرک کو چُھپانے میں اکثر کامیاب رہتا ہے۔ مثلاً ایک امیر شخص ایک خوب صورت مکان تعمیر کروار ہا ہے جس کی اُونچی اُونچی دیواریں اور مضبوط دروازے دور سے ہی نمایاں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُس کے اِس عمل کا محرک مکان کی رغبت ہے لیکن ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص شدید جسمانی عدم تحفظ کے خوف میں مبتلا ہو اور یہ مضبوط مکان اُس کے اِس خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہو جس کا ذکر اُس نے کبھی کسی سے نہ کیا ہو یہاں تک کہ اپنی بیوی سے بھی نہیں جو چالیس سال سے اُس کی ساتھی ہے۔

کیا ہم ایسے شخص کو بے وفا کہہ سکتے ہیں جس نے اتنا مہنگا اور خوبصورت مکان بنانے کا اصل محرک اپنی بیوی کو بھی نہ بتایا ہو۔ شاید نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بچپن میں وہ لوگ ایسے علاقے میں رہتے ہوں جہاں چوری اور ڈاکہ زنی عروج پر تھے۔ اُس کا خاندان غیر محفوظ تھا اور ڈاکے کے خوف میں مبتلا تھا۔ وہاں سے جسمانی عدم تحفظ کا خوف اُس میں پیدا ہوا اور آج تک اُس کے اندر موجود ہے لیکن اُسے یاد بھی نہیں۔ اب یہی جسمانی عدم تحفظ ایک محرک کے طور پر سامنے آیا ہے جو دیکھنے میں مکان کی رغبت کا مظاہرہ معلوم ہوتا ہے۔

انسانی محرک کی یہی بات دلچسپ ہے کہ اُس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ محرک کی وجہ سے ایک عمل جنم لیتا ہے اور وہ ہے ایک مضبوط مکان بنانے کا۔ ہمیں صرف عمل نظر آتا ہے کیونکہ محرک خود کو بے نام اور پوشیدہ رکھتا ہے۔ اِس کے ذریعے انسان کی رغبت اور جذبات تک پہنچا جاسکتا ہے۔ جبکہ انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ اُس کی رغبت اور جذبات کسی کو نظر نہ آئیں۔ جب محرک خود کو بے نام اور پوشیدہ رکھتا ہے تو اِس سے رغبت اور جذبے کا پتا نہیں پوچھا جاسکتا۔ یہی دراصل انسانی شخصیت کی پیچیدگی ہے ورنہ ۲۷ رغبتوں اور ۵ جذبات کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ انسان کی ۲۷ رغبتیں اور ۵ جذبات ہمیشہ سے وہی ہیں اور وہی رہیں گے۔ لیکن ہر دور میں حالات، ایجادات اور معاشرت کی وجہ سے وقوع پذیر ہونے والے اعمال میں فرق پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ایک دور تھا جب پانی کی رغبت میں انسان دریاؤں کے کنارے آباد ہوتا تھا۔ وہ اپنے استعمال کے لیے پانی جمع کرتا تھا۔ پھر اُس نے کنوئیں کھودنا شروع کردیے۔ لیکن آج کے دور میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دل و دماغ

پانی کی رغبت سے ہی انسان پانی کی بوتل خریدتا ہے اور پانی صاف کرنے کے پلانٹ ایجاد ہوئے ہیں۔

لیکن انسان کے محرک سے ہوتے ہوئے رغبت اور جذبے تک پہنچنا کیوں ضروری ہے؟ اِس کی دو اہم وجوہ ہیں۔ ایک تو خود شناسی یعنی انسان اپنے اعمال کا تجزیہ کر کے یہ فیصلہ کر سکے کہ اُس کا کون سا عمل کِس رغبت اور اُس سے وابستہ کِس جذبے کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ ایسا کرنے سے انسان اپنے جذبات اور رغبتوں کو قابو کر کے اپنے رویّے کو بہتر بنا سکتا ہے۔

ایک فرد بڑے بینک بیلنس کا خواب دیکھتا ہے۔ اِس کی کوشش ہے کہ اُس کے پاس ایک خطیر رقم جمع ہو جائے۔ اُس کی یہ خواہش جنون کی حد کو چھو رہی ہے۔ وہ خود اپنی اِس خواہش سے پریشان ہے لیکن اِس مقصد کے لیے عمل جاری رکھتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اِس عمل کا محرک کون سی رغبت اور جذبہ ہیں۔ کیا بڑے بینک بیلنس کی خواہش، دولت کی رغبت سے جنم لے رہی ہے؟ کیا اِس کی وجہ دولت کی لذت ہے یا مستقبل میں دولت نہ ہونے کا خوف؟ اگر انسان رغبت اور جذبے تک پہنچ جائے تو وہ گویا بہتے دریا کے سرچشمے تک پہنچ گیا۔ یہ خود شناسی کا ایک مرحلہ ہے۔

ممکن ہے کہ بینک بیلنس بڑھانے کا محرک نقدی کی براہِ راست رغبت نہ ہو بلکہ اولاد کی رغبت ہو۔ انسان کو اپنی اولاد کی مفلسی کا خوف ہو اور دولت اُس خوف سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ۔ یا پھر اپنے دشمن سے بہتر نظر آنے کی رغبت ہو۔ اُسے یہ سوچ کر لذت محسوس ہوتی ہو کہ اُس کے پاس دشمن سے زیادہ دولت ہے۔ اِس صورت میں اُس کی ساری دولت دراصل دشمن کی رغبت کے تحت ہی آئے گی۔

اِس علم کی دوسری اہمیت اِن لوگوں کے لیے ہے جن کا کام انسانوں کی نفسیاتی یا ذاتی سطح پر مدد کرنا ہے۔ صحت، نفسیات اور تعلیم جیسے اہم شعبوں میں ہمیں اکثر ایسے مواقع پیش آتے ہیں جہاں ایک انسان کے کسی غلط عمل یا بُرے رویّے کو درست کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دس سال کا ایک بچہ دوسرے بچوں پر پانی پھینکتا ہے۔ ایک ماہرِ نفسیات کے پاس ایک مریضہ ہے جس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا اور وہ اکثر روتی رہتی ہے۔ ایک ماہر طب کا مریض بلڈ پریشر کا شکار ہے اور کسی کی ذرا سی غلط بات اُس کے بلڈ پریشر کو بڑھانے کا موجب بنتی ہے۔

اِن صورتوں میں اگر ماہرین چاہیں کہ اُن سے منسلک افراد ٹھیک ہو جائیں تو اِس کے لیے اُنہیں محرکات سے ہوتے ہوئے جذبات اور رغبتوں تک پہنچنا ہوگا۔ اِس کے بغیر اُن کا علاج ممکن نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوگا۔ مثلاً بچے کو ڈانٹنے یا سزا دینے سے ممکن ہے وہ دوسرے بچوں پر پانی پھینکنا بند کردے لیکن وہ اب چوری شروع کردے۔ اگر ہم سزا دینے سے پہلے یہ یہ تجزیہ کریں کہ بچہ پانی کیوں پھینکتا ہے تو شاید مسئلے کا حل آسان ہوجائے۔ ممکن ہے بچہ کی عزتِ نفس کی رغبت متاثر ہوئی ہو۔ یہاں ہمیں عزتِ نفس سے وابستہ بہت سا غم لپٹا نظر آئے جو گھر میں ماں باپ کی عدم توجہ کا نتیجہ ہو۔ توجہ اور اہمیت سے بچے کی عزتِ نفس کی رغبت میں سے غم کا جذبہ کم ہوگا۔ اُسے عزت کی لذت میسر آئے گی جسے وہ دوسروں پر پانی پھینک کر گنوانا نہ چاہے گا۔

اِسی طرح وہ لڑکی جو لوگوں سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتی اور روتی رہتی ہے اپنی دوست کی ناراضی سے غم زدہ ہو۔ یا پھر اُسے یہ خوف ہو کہ اُس کے سب دوست اُس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ دوست کی رغبت اور اُس سے وابستہ خوف یا غم اتنا بڑھ جائے کہ وہ لڑکی کنارہ کشی کرلے اور روتی رہے۔ اُس صورت میں اس کا حل صرف یہ ہے کہ دوست کی رغبت سے وابستہ غیر ضروری جذبات کو اعتدال پر لایا جائے اُس میں خوف اور غم کے جذبے کو کم کرنے کے لیے دوست سے ملنے والی لذت اور اِسی رغبت سے وابستہ اُمید اور انعام کو بڑھایا جائے۔

یہاں خاص طور پر ایک عمل کا ذکر اِسی حوالے سے بہت موزوں ہے جو لڑکیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے اور وہ ہے ہسٹریا کا عمل۔ ہسٹریا یوں تو کئی قسم کا ہوتا ہے لیکن اِن میں سے وہ قسم عموماً دیکھنے میں آتی ہے جس میں کوئی لڑکی کسی جسمانی مرض میں مبتلا نہ ہوتے ہوئے بھی وقتی طور پر اپنے حواس کھو بیٹھتی ہے۔ ہسٹریا کے محرک کو دیکھا جائے تو اس کے پیچھے ہمیں سماج، والدین یا شوہر کی رغبت ہی نظر آتی ہے۔ لڑکی کو دکھ ہوتا ہے کہ اُسے سماج میں عزت نہیں ملتی (ہسٹریا زدہ لڑکیاں عام طور پر دوسروں سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں) یا پھر اسے خوف ہوتا ہے کہ اُس کو اچھا شوہر میسر نہیں آئے گا یا وہ اپنے والدین کی رغبت سے ملنے والی لذت سے محروم ہوتی ہے۔ اِسی طرح بلڈ پریشر بھی رغبت کی وجہ سے پیدا ہونے والے عوامل میں سے ایک اہم عمل ہے۔ بلڈ پریشر کے محرکات آج کے دور میں زیادہ تر نفسیاتی ہیں۔ بلڈ پریشر زیادہ لوگوں میں جن محرکات کی وجہ سے ہوتا ہے وہ رغبتوں اور جذبات سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ جسمانی امراض سے۔

انسان کسی بھی رغبت کی وجہ سے غم، خوف یا دونوں کا شکار ہوجاتا ہے اور یوں اُس میں جو محرک جنم لیتا ہے وہ بلڈ پریشر کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً انسان اپنے خاندان کے بارے میں خوف کا شکار ہو جس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے اِس میں اُمید اور لذت کم ہوجائیں اور یہ وجہ بن جائے اُس کے بلڈ پریشر کی۔ یا پھر کوئی شخص تجارت سے وابستہ ہو اور پے در پے خساروں سے ملنے والے غم کے باعث وہ بلڈ پریشر کا شکار ہوجائے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہر عمل کے پیچھے ایک محرک، ہر محرک کے پیچھے کوئی رغبت اور ہر رغبت سے وابستہ کوئی جذبہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل سے جس رغبت اور جذبے کا اظہار ہو اصل میں بھی وہی رغبت اور جذبہ کارفرما ہو۔

اِس نکتہ کی وضاحت کے لیے ہم مثال لیتے ہیں مذہبی پیشوا اور مذہبی رسوم کی۔ کسی مذہبی تقریب میں خدا کا ذکر کرتے کرتے ایک مذہبی پیشوا کی آنکھ سے آنسو بہنا شروع ہوگئے روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ اُس نے بھرائی آواز میں خدا کو پکار پکار کر التجا کی اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ خدا اُس کا رہنما ہی نہیں دوست ہے۔ ایسی صورت میں بظاہر وہ رہنما دوست کی رغبت میں آہ وزاری کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن اصل میں ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ انسان کی اصل رغبت رتبہ کی ہو اور اُسے لذت کی اُمید ہو کہ لوگوں کے سامنے بزرگ اور متقی نظر آنے سے اُس کے رتبے میں اضافہ ہوگا۔ معاشرتی رغبتیں اور اُن سے متعلقہ جذبات کی متعین تعداد میں نہ اضافہ ہوا ہے نہ ہی تبدیلی آئی ہے۔ لیکن اِن رغبتوں اور جذبات کی وجہ سے جنم لینے والے اعمال لامحدود ہیں۔ ہر معاشرہ اور ماحول میں اقتصادی درجہ رکھنے والا فرد اُن ترغیبات اور جذبات کے زیر اثر اپنی جسمانی قوت اور ذہنی استعداد کے مطابق عمل کرتا ہے۔

زراعت اِس کے لیے ایک اچھی مثال ہے۔ زراعت اپنے آغاز سے لے کر آج تک بہت سے ادوار سے گزری ہے۔ ہل چلانے کے عمل کو ہی لے لیجیے۔ انسان نے زراعت کے زیرِ اثر اِس اُمید پر کہ اُسے فصل حاصل ہوگی پہلے ہل چلانے کے لیے خود کو استعمال کیا پھر جانوروں کو اور آج اِس مقصد کے لیے مشینوں کا استعمال کرتا ہے۔ لیکن آج بھی دنیا کے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں انسان اپنی ذات یا جانوروں کو ہل چلانے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ دوسری طرف ترقی یافتہ ممالک میں سائنسی ترقی کی بدولت اِس عمل میں بہت سی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور آتی رہیں گی۔

دل میں پیدا ہونے والے محرکات انسانی ذہن کو حرکت دیتے ہیں اور یوں دماغ اور دل کے تعلق کا جو سلسلہ دماغ کے مشاہدے سے شروع ہوتا ہے تجزیہ، نتیجہ، ترغیبات اور جذبات کو جنم دیتا ہوا دوبارہ دماغ سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ اب یہ دماغ کا کام ہے کہ وہ دل میں پیدا ہونے والے محرکات کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دل ودماغ

عین مطابق عمل کرے۔ وہ دماغ جس نے دل کو ترغیبات سے آشنا کر کے اپنی برتری کا ثبوت دیا تھا دل کے پیدا کردہ محرکات پر عمل کر کے دل کی غلامی کا ثبوت دیتا ہے۔ دل و دماغ کا یہ تعلق ایک دائرے میں چلتا ہے۔ دماغ نے سیکھا، دماغ نے دل کو ترغیبات سے روشناس کیا۔ دل نے ترغیبات کے گرد جذبات کا جال بُن دیا۔ دل نے ترغیبات اور جذبات سے محرک کو جنم دیا اور محرک نے دماغ کو عمل کرنے کا پابند کردیا۔ انسانی شخصیت ازل سے اِس دائرے میں چل رہی ہے اور ابد تک اسی دائرے میں چلتی رہے گی۔

آخر میں ہم ذکر کرتے ہیں اُن اعمال کا جو محرکات کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات نے انسان کے اُن اعمال کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن دماغ کے زیرِ اثر ہونے والے اِن اعمال کی تقسیم کو جدید اور موثر طریقے سے واضح کرنے کا سہرا ہمارے نزدیک ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہارورڈ گارڈنر کے سر جاتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پروفیسر گارڈنر نے اپنے بہت سے طلبہ کے ساتھ دماغ کے پیدا کردہ اعمال کو ۸ بنیادی اقسام میں تقسیم کردیا۔ اُن کے مطابق انسان کے اندر ان ۸ بنیادی اقسام کے اعمال انجام دینے کی بنیادی صلاحیت ہونا ضروری ہے۔ لیکن اُس کا دماغ اِن میں سے کسی ایک آدھ میں ہی کمالِ فن کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ یہاں ہم ڈاکٹر گارڈنر کی ۸ اقسام کے اعمال کا ذکر کرتے ہیں۔ انسان کا پہلا عمل دماغ میں ایک خواب یا خیال کی صورت میں اُبھرتا ہے۔ وہ اپنے دماغ میں کوئی منصوبہ بناتا ہے یا آنے والے دور کی تبدیلی یا بہتری کو دیکھتا ہے۔ وہ کسی چیز یا دور کے نقش ونگار بناتا ہے۔ اِس خواب کو تعبیر تک پہنچانے کے لیے اپنے اندر موجود کمزوریوں کا ادراک کرتا ہے۔ اُس کا دماغ اُسے بتاتا ہے کہ اُس میں کیا صلاحیتیں ہیں اور اِس کام کو کرنے کا کیا لائحہ عمل ہونا چاہئے۔

دراصل محرک رغبت اور جذبات کا ایسا پیغام رساں ہے جو دل کی بات دماغ تک پہنچا کر اپنا کام ختم کردیتا ہے اور دماغ محرک کے پیغام کو پڑھ کر جو پہلا عمل کرتا ہے وہ خیال ہے۔ اب دماغ کسی نہ کسی طور پر زود یا بدیر خیال کو عملی جامہ پہنائے گا یہ ایک پیچیدہ طریقِ کار ہے۔ اب خیال کی طاقت مختلف طریقوں سے مختلف اعمال کا روپ دھارنا شروع کرے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض افراد نے دماغ میں آئے خیال کو سوچنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کیا اور اُن کا یہی سوچنا انہیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ ایسے افراد میں سرِفہرست آئن اسٹائن کی شخصیت ہے۔ آئن اسٹائن کو بچپن سے ایک ہی چیز کی رغبت تھی اور

دل ودماغ

وہ تھا علم۔ اُس کے علم کی نوعیت طبعیات سے تعلق رکھتی تھی اور اس رغبت کی لذت کی خاطر اُس نے طرح طرح کے مفروضے قائم کیئے اور اُن کے بارے میں خیالات کو وسعت دینا شروع کردی۔ دماغ میں خیالات کو وسعت ملتی گئی اُس کے مشاہدے میں بہت سی ایسی باتیں آئیں جو اُس کے خیالات کے عین مطابق تھیں۔ اِس سے اُس کے علم کی رغبت سے ملنے والی لذت میں اضافہ ہوا جس نے اُسے دماغ میں خیالات کو اور گہرائی سے سوچنے کی طاقت فراہم کی۔ آئن اسٹائن کے مشاہدے سے خیال تک کا یہ دائرہ تیزی سے چلنا شروع ہوگیا اور یوں آئن اسٹائن دنیا کو نظریۂ اضافیت کی صورت میں وہ خیال دینے کے قابل ہوا جس نے طبعیات کی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔

دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات سے جو عام طور پر دوسرا دماغی عمل شروع ہوتا ہے وہ ہے زبان سے اظہار کا۔ بچپن میں تو انسان یہ اظہار صرف بول کر کرتا ہے لیکن آگے چل کر اِس اظہار میں تحریر بھی اپنی جگہ بنالیتی ہے۔ کچھ ہی عرصہ میں انسان یہ طے کرلیتا ہے کہ وہ اپنا اظہار بول کر کرنا پسند کرے گا یا لکھ کر۔ یوں انسان زبان کے ذریعے اپنی دماغی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے عمل شروع کردیتا ہے۔ زبان کے ذریعے نثر اور شاعری دونوں میں اظہار ممکن ہے۔ پھر اِن دو اقسام کے ذرائع میں بھی بہت سی اقسام ہیں جو زبان کے ذریعے اظہار کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

زبان کے ذریعہ دماغی صلاحیتوں کے استعمال میں جس شخصیت کا نام ذہن میں آتا ہے وہ ہے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کا۔ ہم شاعرِ مشرق کی شاعری کا ذکر اُن کے مشاہدے سے شروع کرتے ہیں۔ اُنہوں نے جوانی اور شاید بچپن سے ہی مسلمانوں کی زبوں حالی کا مشاہدہ کیا۔ دوسرا مشاہدہ اپنے باپ کی رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تھا اور تیسرا مشاہدہ قرآنِ حکیم کی آیات کا تھا۔ یوں اِن تین مشاہدات نے تجزیے کو جنم دیا اور اُنہوں نے موجودہ حالات کا ماضی کے حالات سے موازنہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور مسلمانوں کی حالتِ زار کو دیکھا۔ اس سارے تجزیے کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ رسول اللہ ﷺ سے بہتر رہنما ممکن نہیں۔ اُن پر ایمان لانے والے تب ہی فلاح پا سکتے ہیں جب وہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن کو سمجھیں اور اُن کی زندگی کو مشعلِ راہ بنائیں۔ اِن نتائج کی بدولت اُن کے اندر کئی ایک رغبتیں پیدا ہوئی ہوں گی۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اِن کے اندر رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی کے لیے رغبت پیدا ہوئی۔ اُن کو خوف ہوا کہ اُنہوں نے خود اور مسلمانوں نے بالعموم رسول اللہ ﷺ کے بتائے

دل ودماغ

ہوئے راستے سے انحراف کیا۔ اُنہیں روزِ قیامت رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی کا خوف تھا۔ اُنہیں رسول اللہ ﷺ کی ذات کے بارے میں سوچ کر لذت ملتی تھی پھر اُنہیں اُمید تھی کہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا انعام میسر آئے گا۔ رہنما کی اِس رغبت اور اُس سے پیدا ہونے والے اتنے طاقتور جذبات نے ایک اور رغبت کو جنم دیا۔ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی امت کو اپنا قبیلہ نہیں بلکہ خاندان سمجھا اور یوں دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے وہ رغبت پیدا کر لی جو عام لوگوں میں اپنے قریبی رشتے داروں کے لیے ہوتی ہے۔ جتنی شدید محبت اُنہیں اپنے رہنما ﷺ سے تھی اُتنی ہی شدید محبت اُنہیں اُن کی امت سے ہوگئی۔ اِس رغبت کے تحت اُنہیں امتِ مسلمہ کے بارے میں سوچ کر لذت ملنے لگی وہ اُن کی نشاۃِ ثانیہ کے بارے میں پُر اُمید ہوگئے۔ اُن کے لیے مسلمانوں کا عروج ایک انعام تھا جس کی اُنہیں آرزو تھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر اُن کو مسلمانوں کے زوال کا شدید دکھ تھا۔ رہنما اور خاندان کی رغبتوں سے اُٹھنے والے جذبات کا غبار شعلوں میں تبدیل ہوگیا۔ یہ شعلے اُن کے دماغ میں خیالات کو پیدا کرنے کے محرک بن گئے۔ اِن دو رغبتوں سے پیدا ہونے والے جذبات کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ علامہ اقبالؒ کے دماغ میں خیالات ایک دریا نہیں بلکہ بپھرے ہوئے سمندر کی صورت میں موجزن ہونے لگے۔ اِن خیالات کا اظہار اُنہوں نے شاعری کی صورت میں کرنا شروع کیا۔ خیالات اتنے طاقتور تھے کہ شاعری کی صورت میں ڈھلتے ڈھلتے ایسا زبردست دماغی عمل شروع ہوجاتا کہ علامہ بےخود ہوجاتے۔ لہٰذا اقبالؒ کی زیادہ تر شاعری بےخودی کے عالم میں وجود میں آئی۔ زبان ایک بنیادی صلاحیت ہے۔ اِس صلاحیت کا ایک بنیادی معیار حاصل کرنا ہر فرد کی ضرورت ہے۔ پھر آج کے دور میں جس تیزی سے معلومات میں اضافہ ہورہا ہے زبان کی اہمیت کئی گُنا بڑھ گئی ہے۔ اب تو عمل کوئی بھی ہو زبان کی صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اِس حوالے سے زبان کی صلاحیت پر گفتگو کرنا ناگزیر ہے لیکن کتاب کی طوالت کے خوف سے ہم نے یہ مضمون کتاب کے آخر میں درج کیا ہے۔

مسلمانوں کے احیاء کی مستقبل میں جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو اُس کا نقطۂ آغاز بیسویں صدی ہی تصور ہوگا۔ علامہ اقبالؒ کے علاوہ بیسویں صدی نے دو اور ایسی مسلم شخصیات کو جنم دیا جن کے اندر رہنما اور مسلم خاندان کی وہی دو رغبتیں موجود تھیں جن کا وجود علامہ اقبالؒ اپنے اندر رکھتے تھے۔ دنیا کی عظیم ترین شخصیت کے لیے رہنما کی رغبت رکھنا اور پھر اُس کی امت کے لیے خاندان کی رغبت دو ایسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دل ودماغ

طاقتور رغبتیں ہیں کہ جہاں بھی اور جب بھی مسلمانوں میں پیدا ہوئیں انہوں نے انقلاب برپا کر دیا۔ اور جن دو شخصیات کا ہم ذکر کرنے چلے ہیں اُنہوں نے بھی ایسے ہی انقلاب برپا کیے ہیں۔ لیکن اُن کے ذکر سے پہلے ہم چلتے ہیں ہارورڈ گارڈنر کی تیسری دماغی صلاحیت کی طرف جس کا استعمال انسان رغبتوں کے زیرِ اثر کرتا ہے۔ یہ دماغی صلاحیت ہے انسانی تعلق کی، انسان اس صلاحیت کی بدولت لوگوں سے تعلق بناتا ہے۔ اُنہیں اپنی بات سمجھاتا ہے اور اُن کی بات سمجھتا ہے۔ اِسی صلاحیت کے حامل لوگ دوسرے لوگوں کے دل میں اُترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لوگ اُن کے لیے اپنی جان اور گھر بار تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں لوگوں کو جماعت میں منظّم کر کے اُن سے کام لینا آتا ہے۔ اُن کی بات میں وزن ہوتا ہے۔ خیال اور زبان کے ساتھ اِس دماغی صلاحیت کے لوگ اگر طاقتور رغبتیں رکھیں تو تاریخ اُن کے ہاتھوں بڑے بڑے انقلاب برپا ہوتے دیکھتی ہے۔ اور یہی انقلاب برپا کئے بیسویں صدی کی دو عظیم شخصیات مولانا الیاس اور امام خمینی نے۔

مولانا الیاس کا تعلق ہند سے تھا۔ علامہ اقبالؒ کی طرح وہ بھی رسول اللہ ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور امت کو رسول اللہ ﷺ کے رستے سے بھٹکتے دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے اور یوں رغبتوں اور جذبوں کے اِس ملاپ سے اُن کے دماغ میں نئے خیالات نے جنم لیا۔ اُن کے دل سے پیدا ہونے والے محرک کی شدت اُس وقت انتہا کو پہنچی جب وہ رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری دینے گئے اور وہیں سے اُن کو ''حکم'' ملا کہ ''واپس ہندوستان جاؤ۔ اور '' کام'' شروع کرو۔ واپس آ کر اُنہوں نے اپنے علاقے کے اَن پڑھ اور غریب عوام کو اسلام کا کام کرنے کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ وہ لوگ جو دن میں روزی کما کر رات کو اپنے خاندان کا پیٹ بھرتے تھے اپنے کام کاج اور گھر بار چھوڑ کر مولانا الیاس کے بتائے ہوئے طریقے پر تبلیغ کرنے چلے گئے۔ لوگوں کو ایک نئے طریقے پر کام کے لیے تیار کرنا ایک مشکل کام ہے جس میں مولانا الیاس کے دماغ کے انسانی تعلق کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مولانا الیاس کا شروع کردہ یہ کام اِس وقت دنیا کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ تبلیغی جماعت میں ایک وقت میں ہزاروں لوگ سارا سال اپنی تحریک کے لیے وقت دیتے ہیں۔ جبکہ سال میں ایک سے ۴ مہینے کا وقت دینے والے لوگ غالباً لاکھوں میں ہیں۔ یہ سب مولانا الیاس کی سرپرستی میں ہوا۔ اُن کی رہنمائی میں شروع ہونے والا کام اُن کی موت کے بعد کم نہیں ہوا بلکہ کئی گُنا بڑھ گیا اور یہ کامیابی اُن کے دماغ کی تین صلاحیتوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دلیل ہے: خیال، زبان اور انسانی تعلق۔

مولانا الیاس نے ان تین دماغی صلاحیتوں کو استعمال کر کے ایک عظیم الشان انقلاب برپا کیا لیکن اُن کا انقلاب انفرادی اور پھر معاشرتی ہے۔ جبکہ بیسویں صدی میں ایک شخصیت ایسی بھی گزری ہے جس کی انتہائی گہری اور طاقتور رغبتوں نے انتہائی بلند ذہنی صلاحیتوں کو جنم دیا اور اُس نے اِس صدی کا سب سے بڑا انقلاب برپا کیا۔ یہ شخصیت ہے امام خمینی کی۔ ایران میں اُن کا انقلاب انفرادی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی سطح پر حیرت انگیز تبدیلیاں لانے کا موجب بنا۔

امام خمینی کی ترغیبات کیا تھیں؟ بلا شبہ اتنی بڑی شخصیت کے بارے میں کوئی ایک رائے قائم نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ نہ صرف ایک جید عالم تھے بلکہ علم میں ڈوبی گفتگو کرتے تھے تو بلا شبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ایک بہت طاقتور رغبت تو علم کی ہوگی۔ اُن کے نظریات سے دوسرا اندازہ جو ہم لگا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اُن کی عزتِ نفس کی رغبت بہت مضبوط تھی۔ پھر ہم آتے ہیں اِس حقیقت کی طرف کہ وہ اہل بیت سے بہت محبت کرتے تھے اور چوں کہ محبت کا تعلق ہی رغبت سے ہے تو ہم اُن کی اہل بیت سے محبت کو رہنما کی رغبت شمار کرتے ہیں۔ اِن کے علاوہ ایران کے غریب عوام کو بالخصوص اور دنیا کے مسلمانوں کو بالعموم اپنا قبیلہ یا خاندان سمجھنے کی رغبت بھی موجود تھی۔

ایک اور رغبت جس کا ہمیں اُن کی تحریک کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے وہ ہے دشمن کی رغبت۔ وہ ہر اُس نظام کو جو اسلام کے منافی ہو باطل تصور کرتے تھے۔ اِس لیے اُن تمام لوگوں کو جو باطل نظام کے سرپرست تھے دشمن سمجھتے تھے اور یوں علم، عزت نفس، رہنما اور خاندان کی رغبتوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی دشمن کی رغبت بھی گہری تھی۔ یاد رہے کہ رغبت جتنی گہری ہوتی ہے اُتنی ہی مضبوط ہوتی ہے۔ اِس گہری اور مضبوط رغبت سے ایک اُونچی اور مضبوط ذہنی صلاحیت نشوونما پاتی ہے۔ امام خمینی کی رغبتوں نے خیال، زبان اور انسانی تعلق کی ذہنی صلاحیتوں کو جنم دیا اور ان صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے وہ ایک عظیم الشان انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہمارے خیال میں پچھلے دوسو سال میں امام خمینی کے ایرانی انقلاب سے بڑا انقلاب برپا نہیں ہوا۔ کیونکہ پچھلے دوسو سال میں آنے والے ہر انقلاب کے لیے کچھ زمینی حقائق واضح طور پر ایک انقلاب کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ لیکن انقلابِ ایران میں نہ تو کسی قسم کی خارجی مدد شامل تھی اور نہ ہی اندرونی حالات زیادہ موافق تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دل ودماغ

چوتھی ذہنی صلاحیت جو ہمارے لیے عمل کا باعث ہے جسمانی کنٹرول اور استعمال ہے۔ اس صلاحیت کی بدولت انسان اپنے ہاتھ، پاؤں، زبان، چہرے اور آواز کو استعمال کرتا ہے۔ یہ صلاحیت کھیل، اداکاری، گلوکاری کے علاوہ گھڑ سواری اور کھیتی باڑی کے لیے ضروری ہے۔ اِس صلاحیت کا استعمال معمار، مزدور، کاریگر اور فنکار کرتے ہیں۔

جسمانی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرنے کا سہرا ہمارے نزدیک کسی ایک نہیں بلکہ ایک پوری قوم کے سر ہے اور وہ ہے افغان۔ افغان قوم کی ترغیب کا ذکر بھی کافی دلچسپ ہوگا۔ یہ مضبوط عزتِ نفس کے حامل ہیں کیونکہ جہاد اور وہ بھی اتنے طویل عرصے تک نہایت طاقتور عزتِ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔ اُن کے رہنما کی رغبت بھی بہت مضبوط ہوگی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو دل کی گہرائی سے رہنما تسلیم کئے بغیر اتنا طویل جہاد کرنا ناممکن ہے۔ اور پھر اُن کے لیے دشمن کی رغبت بھی بہت اہم لگتی ہے۔ جہاد میں دشمن کی رغبت ہوتے ہوئے ہارنے کا غم نہیں ہوتا نہ ہی زیر ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ یہ دونوں جذبات اگر اُبھریں بھی تو انسان شہادت کی لذت کے لیے اِن جذبات پر قابو پالیتا ہے۔ لیکن جہاد کی صورت میں انسان کو اپنے رہنما کی تعلیمات کو غالب کرنے کی بہت قوی اُمید ہوتی ہے۔ مجاہد کے لیے جیتنے کی لذت تو ہوتی ہے لیکن ایسی جیت جس میں اللہ کے نام کو سربلند کیا جاسکے۔ اِس کا انعام اسلام کی سربلندی ہوتا ہے۔ اِن رغبتوں کے حامل افغان ایک، دو یا تین سال نہیں بلکہ بیس سال سے جہاد کر رہے ہیں۔ اِس کے لیے دماغی صلاحیتوں میں خیال کے علاوہ جسمانی صلاحیتوں کو کام میں لانا بھی اشد ضروری ہے کیونکہ جسمانی صلاحیتوں کا موثر استعمال ہی انسان کو اپنی جان بچاتے ہوئے دشمن سے مقابلہ کرنے کی طاقت فراہم کرتا ہے۔ افغانوں نے اپنی جسمانی صلاحیتوں کا استعمال اِس حکمتِ عملی سے کیا کہ ایک نہیں بلکہ دو سپر پاورز زیر ہوگئیں۔ انسانی تاریخ میں دو سپر پاورز کو کبھی بھی چند لوگوں کی جماعت نے اتنی واضح شکست نہیں دی۔
(بنیادی جسمانی صلاحیتوں کے حوالے سے ضمیمہ کتاب کے آخر میں دیکھیے)

ڈاکٹر ہارورڈ کے مطابق دماغی صلاحیتوں میں سے ایک اور صلاحیت ہے حساب کی۔ اِس دماغی صلاحیت کی بدولت انسان شمار کرتا ہے۔ اُسے دنوں کا حساب رکھنا آتا ہے، روپے پیسے کا حساب، چیزوں کا وزن اور اُن کی جسامت بھی اسی صلاحیت کی بدولت ناپی جاسکتی ہیں۔ اِس صلاحیت کی بدولت انسان سائنسی تجربات کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ وقت کے ساتھ چیزوں میں آنے والی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دل ودماغ

تبدیلی، موسم اور ماحولیاتی اثرات وغیرہ بھی اِسی صلاحیت کی وجہ سے معلوم کئے جاتے ہیں۔ایک اچھا سائنسدان بننے کے لیے اِس صلاحیت کا استعمال بہت ضروری ہے۔انجینئر، کیمیادان، کمپیوٹر کے ماہرین بھی اِسی صلاحیت کی وجہ سے عملی کام کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اِس صلاحیت سے جس شخصیت نے بھرپور فائدہ اُٹھایا وہ ہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے عمل کو سمجھنے کے لیے بیسویں صدی کی سب سے بڑی ہجرت کا علم ضروری ہے۔ جو برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے وقت ہوئی۔ اِس حصے پر انگریز کا قبضہ ۱۹۴۷ میں ختم ہوا اور اِس علاقے کے لوگ مذہبی بنیادوں پر بٹ گئے۔ مسلمانوں نے اُن علاقوں کا رخ کیا جو آج پاکستان کہلاتے ہیں جبکہ ہندوؤں نے ہندوستان جا کر رہنے کا فیصلہ کیا۔لوگ برس ہا برس سے جس جگہ رہ رہے تھے وہ چھوڑ کر کسمپرسی کی حالت میں کئی سو میل کا سفر طے کر کے کسی نئے علاقے کی طرف چل پڑے۔ چونکہ دونوں مذاہب کے لوگوں میں نفرت شدید بڑھ چکی تھی اِس لیے دشمن کی رغبت میں اچانک اور شدت آ گئی۔ ہجرت کے دوران جو لوگ بھی ایک علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقے میں جا رہے تھے وہ دشمن کے نرغے میں تھے۔انہیں پناہ تب ہی مل سکتی تھی جب وہ اپنے نئے وطن کی سرحد کے اندر داخل ہو جاتے۔ دشمن کے علاقے سے گزرتے ہوئے اِن نہتے مہاجرین کے پاس اپنے دفاع کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ دوسرے مذہب کے لوگوں نے اپنی دشمنی کی رغبت کے زیرِ اثر نہتے مہاجرین کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔مسافروں سے بھری پوری پوری ٹرینیں جلا دی گئیں۔ ہزاروں لوگوں نے ہجرت شروع کی تو منزل پر پہنچنے والے اکا دکا ہی تھے۔خاندانوں کے خاندان مارے گئے یا شہید کر دیئے گئے۔ اِس سفر میں شامل بڑی عمر کے لوگ تو اپنی بقیہ زندگی اپنے آبائی علاقے کا سوچتے رہے، بچھڑنے والوں کو یاد کرتے رہے اور نئے دیس میں زندگی بہتر بنانے میں مصروف ہو گئے۔ جو چھوٹے تھے اُنہوں نے اپنے دشمن کے حوالے سے جو رغبت پیدا کی اُس میں غم کا جذبہ شامل تھا۔ اُنہیں غم تھا کہ اُن کا دشمن اُن پر حاوی ہو گیا اور اُنہیں نقصان پہنچانے میں کامیاب رہا۔ جب قومی دشمن کو ذاتی دشمن کی رغبت میں تبدیل کر دیا جائے تو پھر قوم بھی اپنا خاندان یا قبیلہ بن جاتی ہے۔ انسان اپنے دشمن کے دشمن کو اپنے قبیلے میں شمار کرتا جاتا ہے۔ چاہے اُس کے دشمن کے دشمن سے اُس کا کوئی رشتہ یا تعلق نہ ہو۔ اِسی طرح اپنے دشمن کے دوست کو بھی اپنا دشمن بنا لیتا ہے چاہے وہ اُس کا قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔ بچپن میں پیدا ہونے والی دشمن کی رغبت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دل ودماغ

نے نہ صرف پاکستانی قوم کوڈاکٹرعبدالقدیر کا قبیلہ بنادیا بلکہ پاکستان کے لیے ایک طاقتور رغبت میں بھی تبدیل کردیا۔ اِن دو رغبتوں کے زیر اثر ڈاکٹر عبدالقدیر نے فیصلہ کیا کہ وہ دشمن کو اپنے یا اپنی قوم کے اُوپر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ اِس مقصد کے تحت اُنہوں نے اپنے دماغ کی تین صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ اول تو خیال کہ پاکستان کو ناقابلِ تسخیر ہونا چاہئے۔ اِس مقصد کے لیے انسانی تعلق کی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ایک ادارہ بنایا جہاں پر ایٹم بم بنانے پر تحقیق ہوئی اور پھر اپنی حسابی صلاحیت کو جو ایسی تحقیق کے لیے اشد ضروری ہے کام میں لائے اور اپنے تمام تر تجربے کی بنیاد پر اِس انتہائی پیچیدہ اور عمیق تحقیق کو پورا کیا اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

ایک اور دماغی صلاحیت جس کا ڈاکٹر ہارورڈ ذکر کرتے ہیں چیزوں اور جگہوں سے متعلق ہے۔ یہ صلاحیت آرٹ، خطاطی اور کشیدہ کاری کا محرک بنتی ہے اور خوبصورت رنگوں کے امتزاج اور ڈیزائن بنانے میں مدد کرتی ہے۔ ایک جاذبِ نظر پینٹنگ سے لے کر ایک خوبصورت عمارت تک، ایک خوبصورت گاڑی سے لے کر ایک کتاب کے دلکش سرِ ورق تک۔ ہر خوبصورت تخلیق اسی دماغی صلاحیت کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔

ڈاکٹر ہارورڈ گارڈنر نے جن دماغی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے اُن میں سے ایک موسیقی کی صلاحیت ہے جس کو استعمال کرکے انسان نئی نئی دھنیں اور راگنیاں تخلیق کرتا ہے۔ اِسی فہرست میں سے ایک دماغی صلاحیت ماحول سے متعلق ہے جس کی بدولت انسان فطرت میں موجود اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو سمجھ پاتا ہے۔ یہ ایک وسیع صلاحیت ہے۔ اِس کا استعمال طب کے ماہرین انسانی جسم کو سمجھنے کے لیے کرتے ہیں۔ پودوں، زراعت اور دوسرے نباتاتی علوم کو سمجھنے کے لیے بھی یہی صلاحیت کام آتی ہے۔ جانوروں اور حشرات کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے بھی یہی صلاحیت درکار ہے۔ ماحول سے متعلق دماغی صلاحیت کا استعمال جغرافیہ سے لے کر فلکیات تک پھیلا ہوا ہے۔ تاہم ایک انسان ایک وقت میں ایک ہی قسم کی ماحولیاتی صلاحیت حاصل کرپاتا ہے۔ مثلاً انسانی جسم کا ماہر ضروری نہیں کہ فلکیات کا بھی ماہر ہو۔ لیکن طب کی بنیادی صلاحیت ہر انسان کے لیے لازم ہے اِس حوالے سے ایک مضمون کتاب کے آخر میں پڑھیئے۔

ڈاکٹر ہارورڈ گارڈنر کی اِن آٹھ دماغی صلاحیتوں سے ہمیں انسان کے عمل کو سمجھنے میں بھرپور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مدد ملتی ہے۔ انسان اِن صلاحیتوں کی بدولت یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے عمل میں کتنا کامیاب رہا۔ اُسے اپنے عمل سے حاصل کردہ نتائج کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی رغبت کی تسکین سے کتنا قریب ہوا ہے۔ وہ اپنے ماحول کا بھی مشاہدہ کرتا ہے تاکہ اُس پر اپنے عمل کے اثر کا جائزہ لے سکے۔ مشاہدہ کرنے کے بعد انسان عمل سے پہلے کی صورتِ حال کا موازنہ عمل کے بعد کی صورتِ حال سے کرتا ہے۔ یہ اُس کا تجزیہ ہوتا ہے۔ اِس تجزیہ سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اُن سے پتا چلتا ہے کہ اُس کا عمل کارگر ہوا یا نہیں۔ یہ نتائج اُس کی رغبتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ممکن ہے کسی فرد نے اپنے عمل سے جوں ہی تبدیلی وقوع پذیر ہوتی دیکھی اُس کے عمل کرنے کی ایک رغبت کم ہوگئی۔ یا یہ کہ تبدیلی دیکھ کر رغبت میں اضافہ ہوگیا۔ یا پھر انسان اِس نتیجہ پر پہنچے کہ اُس کا عمل اُسے منزل تک پہنچانے میں معاون ثابت نہیں ہوا اور یہ نتیجہ اُس میں اِس عمل کے لیے مزید رغبت کا باعث بن جائے جبکہ دوسرا شخص کام ہونے کے بعد اِس عمل کے لیے رغبت کھو بیٹھے۔

مشاہدے سے تجزیہ پھر نتیجہ۔ نتیجہ سے رغبتوں کی تخلیق اور اُس سے محرک کی ابتدا۔ محرک کی بدولت عمل اور پھر عمل کا مشاہدہ۔ یہ ہے انسان کی شخصیت کا نفسیاتی چکر جس میں ہر فرد کسی نہ کسی طرح شریک ہے۔ کچھ دوڑ کر، کچھ کھڑے ہو کر، اور کچھ چل کر۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۹. انسانی ماڈل

انیسویں باب کو شروع کرتے وقت یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پچھلے ۱۸ ابواب اِس باب کی تمہید یا تعارف ہیں۔ اِس کتاب میں جو چیز بالخصوص متعارف کرانا مقصود ہے وہ ہے انسانی شخصیت کا وہ ماڈل جس کا ذکر ہمیں احادیث کی کتابوں میں ملتا ہے۔ پچھلے ابواب میں درج معلومات کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ معلومات انسانی شخصیت کے ماڈل کا حصہ ہیں جو مل کر تصویر مکمل کرتی ہیں۔ اِس سے پہلے کہ ہم احادیث کی روشنی میں انسانی شخصیت کے خدوخال سے ایک ماڈل بنائیں آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی شخصیت کا ماڈل کسے کہتے ہیں؟ اِس کی تاریخ کیا ہے؟ اور اِس ماڈل کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

انسان فطری طور پر علم کو سمجھنے اور تصور میں لانے کے لیے تشبیہات اور مثالیں استعمال کرتا آیا ہے۔ ہاتھی جتنا بڑا، چیتے جتنا تیز، دودھ کی طرح سفید۔ یہ سب تشبیہات ہیں جن کی مدد سے ہم اپنے آس پاس موجود چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے آس پاس بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو فطری طور پر اپنے رنگ، جسامت اور خصوصیات کی وجہ سے نمایاں اور مخصوص ہیں۔ ہاتھی بڑا ہے۔ چیتا تیز ہے اور دودھ سفید ہے۔ اب ہمیں کسی بھی اور چیز کو بڑا، تیز یا سفید بتانا ہو تو ہم اُنہیں بالترتیب ہاتھی، چیتے اور دودھ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔

پیچیدہ موضوعات کے لیے یہ تشبیہات اور مثالیں پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔ مثلاً قوم ایک وسیع موضوع ہے۔ ایک قوم میں لیڈر ہوتے ہیں، متوسط طبقہ ہوتا ہے اور پھر غریب عوام بھی اُس قوم کا حصہ ہوتے ہیں۔ قوم کا دفاعی نظام ہوتا ہے اور اُس کی کچھ قدریں بھی ہوتی ہیں۔ اِس لیے قوم کی تشبیہ کے لیے کسی پیچیدہ چیز کی ضرورت پڑے گی۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے مسلم قوم کی مثال انسانی جسم سے دی ہے۔ طب سے ذرا سی واقفیت بھی ہم پر یہ واضح کر سکتی ہے کہ انسانی جسم بہت پیچیدہ ہے۔ اِس میں کئی نظام بیک وقت کام کرتے ہیں۔ اِس کا بھی ایک دفاعی نظام ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان کے جسم کا بھی ویسے ہی ایک مزاج ہے جیسے کسی قوم کا ہوتا ہے۔

تشبیہات کو ہم ماڈل کا روپ بھی دے سکتے ہیں۔ اُس صورت میں ماڈل کا اپنی اصل سے ملنا اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ یعنی ماڈل ہمارے لیے وہ منزل ہے جس کو ہم حاصل کرنا چاہیں گے۔ ماڈل ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خیال، ایک دلیل، ایک مثال، ایک مقصد اور ایک نشانی ہے جو ہمیں منزل کا پتا دیتا ہے۔ ایک ماڈل ہمیں صحیح راستے پر گامزن ہونے میں مددگار رہتا ہے۔ یہی ماڈل ہمیں ایک نظریئے پر متحد بھی کر سکتا ہے۔ اِس کی بدولت لوگوں میں یکسوئی پیدا ہوتی ہے اور وہ مل کر کسی ایک طرزِ حکومت، اقتصادی نظام اور معاشرت کو اختیار کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک فرد کسی ماڈل کو اپنا لے تو پھر اُس کے پاس زندگی گزارنے کا ایک مقصد آ جاتا ہے۔ اگر کوئی قبیلہ ایک ماڈل اپنا لے تو وہ متحد ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک قوم کسی ماڈل کی مدد سے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر سکتی ہے۔

انسان ہمیشہ سے ہی اپنی شخصیت کے لیے کسی ماڈل کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ اُس نے نہ صرف فطرت میں موجود بہت سی چیزوں کا سہارا لیا بلکہ اِس مقصد کے لیے اپنے ذہن میں بھی بہت سے خاکوں، شکلوں اور صورتوں کو جنم دیا ہے۔ انسان کی شخصیت کے لیے بہترین ماڈل کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے اِس لیے کہ انسان ذہنی طور پر کائنات کی سب سے طاقتور مخلوق ہے۔ انسان سے زیادہ عقلمند اور کوئی نہیں ہے۔ اب انسان کے لیے کسی ایسی چیز کی مثال کیسے دی جا سکتی ہے جو اُس سے کم ذہین ہو؟ اِس دشواری کو حل کرنے کے لیے اہلِ دانش نے انسان کو کسی جانور سے تشبیہ دینے کے بجائے خود ماڈل بنانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ سلسلہ یونانیوں سے ہی شروع ہو گیا تھا مگر عیسائیت کے ظہور سے تشبیہات اور ماڈل سازی کا یہ کام کلیسا کے پاس چلا گیا۔ اسلام آیا تو وہ ماڈل یا تشبیہ تیار ہوئی جس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ اِسی دوران مغرب علمی پسماندگی کا شکار ہو گیا۔ لیکن مسلمان بھی رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے ماڈل پر کام آگے بڑھانے کے بجائے یونانی فلسفے اور اُس میں موجود ماڈل کی گرفت میں آ گئے۔ مغرب مذہب کی زنجیر توڑ کر علمی پسماندگی سے نکلا تو ذہنی اختراعات میں بہت آگے نکل گیا۔ اب اُسے انسانی شخصیت کے لیے ہر قسم کا ماڈل بنانے کی پوری آزادی تھی۔ اِسی دوران ڈارون کا فلسفہ منظرِ عام پر آیا تو سب سے پہلی تشبیہ تو انسان کو بندر سے دی گئی۔ نیوٹن اور مشین کی حکمرانی کے آتے ہی انسان کو مشین سے تشبیہ دی جانے لگی۔ اقتصادی نظام نے ترقی کی تو انسان انسان نہ رہا بلکہ اقتصادی اکائی میں تبدیل ہو گیا۔ پیداوار بڑھی تو انسان کو صارف بنا دیا گیا۔ ایک اچھے صارف کی تشریح ہوئی اور انسانی ماڈل ایک اچھے صارف کی صورت میں سامنے آیا۔ تعلیم کا مقصد ایک اچھا صارف پیدا کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور یوں یونیورسٹیاں، کالج اور سکول اچھے صارف کا ماڈل سامنے رکھ کر تعلیم دینے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل

تعلیمی ادارے ہی نہیں اخبار، ریڈیو اور TV کے کارپرداز بھی اِس ماڈل کو سامنے رکھتے ہیں۔ مثلاً اچھے گاہک کا ماڈل ہر میڈیا کے اجارہ دار کے پاس ہے چاہے اُس کا تعلق دنیا کے کسی بھی ملک سے ہو۔آج کی بڑی کارپوریشن سے لے کر سپر پاور تک اپنے وجود کا جواز ''اچھے گاہک'' کے ماڈل کی کامیابی میں ڈھونڈتے ہیں۔'اچھے گاہک' کا ماڈل تلف کر دیں تو موجودہ دور کا تمام تر سماجی اور اقتصادی نظام تاش کے پتوں کی طرح تتر بتر ہو جائے گا۔اِس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ماڈل کتنا اہم ہے اور ہر قوم، قبیلہ اور ملک کی کامیابی کے پیچھے ایک طاقتور ماڈل ضرور کارفرما ہوتا ہے۔

اب ہم آتے ہیں انسانی شخصیت کے اِس ماڈل کی طرف جو ہمیں احادیثِ رسول اللہ ﷺ سے ملتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مومن کھجور کے درخت کی مانند ہے جس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے''۔

مومن کھجور کے درخت سے کیسے مماثلت رکھتا ہے؟ درخت کے پتے جھڑنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ درخت کے پتوں سے ملتی جلتی چیز انسان میں کیا ہے؟۔کھجور کے درخت کا مطالعہ ہمیں انسان کے بارے میں کیا بتاتا ہے اور انسان کھجور کے درخت کی مانند نہیں رہتا تو اُس میں کیا کیا تبدیلیاں وقوع پذیر ہو جاتی ہیں؟

ہم پچھلے ابواب میں انسانی شخصیت کے اِن اجزاء کی نشاندہی کر چکے ہیں جن کی اب ہمیں کھجور کے درخت کا ماڈل سمجھنے کے لیے ضرورت ہے۔انسانی شخصیت کے اجزاء کو ہم نے ترتیب وار ایک دائرے میں شمار کیا تھا۔اِس ماڈل کو سمجھنے کے لیے ہمیں اِس دائرے کا ہی کھجور کے درخت سے موازنہ کرنا ہوگا۔

ہم نے دیکھا کہ انسانی شخصیت کی ابتداء مشاہدے سے ہوتی ہے۔کھجور کے درخت میں پتوں کا کام روشنی کو جذب کرنا ہوتا ہے۔جس طرح انسان کے حواسِ خمسہ کے ذریعہ معلومات دماغ میں داخل ہوتی ہیں ویسے ہی روشنی درخت کے پتوں سے ہوتی ہوئی درخت کے اندر تک پہنچتی ہے۔

معلومات انسان کے اندر داخل ہونے کے بعد تجزیے کو جنم دیتی ہیں۔انسان حاصل ہونے والی معلومات کی کانٹ چھانٹ شروع کرتا ہے تاکہ اُن سے نتائج حاصل کیے جا سکیں۔درخت میں یہی کام پتے کے اندر Photosynthesis کی صورت میں ہوتا ہے۔درخت روشنی کی مدد سے اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اندر اپنے لیے توانائی پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

تجزیہ کرنے سے نتائج جنم لیتے ہیں جو کہ ہماری شخصیت کا مستقل حصہ بن جاتے ہیں۔ اِسی طرح پتے میں جو توانائی اور طاقت پیدا ہوتی ہے وہ تنے کو بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ جس طرح نتائج کے بڑھنے سے انسان کی سمجھ اور تجربے میں اضافہ ہوتا ہے ویسے ہی پتوں میں پیدا ہونے والی توانائی درخت کے تنے کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ یعنی کھجور کا تنا انسانی ذہن میں نتائج کی تمثیل ہے۔ اِن کی نمو، مضبوطی اور ترقی کی دلیل ہے۔

نتائج کی وجہ سے رغبتیں تشکیل پاتی ہیں اور پھر رغبتوں کے ساتھ جذبات وابستہ ہو جاتے ہیں۔ کھجور کے درخت میں یہ حیثیت درخت کی جڑوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جوں جوں تنا بڑھتا ہے اُسی تناسب سے درخت کی جڑیں گہرائی میں جاتی ہیں تنے کی اُونچائی اور جڑوں کی گہرائی دونوں متناسب رہتے ہیں۔ یہ ایک توازن ہے جو تنے اور جڑوں میں ہر صورت برقرار رہتا ہے۔ انسان میں بھی نتائج کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ رغبتوں کی گہرائی اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ تناسب بھی تنے اور جڑوں کی طرح ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ رغبتوں اور جذبوں کے ملاپ سے محرکات پیدا ہوتے ہیں جو اعمال کو جنم دیتے ہیں۔ درخت میں یہی عمل کھجور کی پیدائش کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

کھجور درخت کی پیداوار ہے جس سے دنیا کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ویسے ہی جیسے انسان کے اعمال سے دنیا مستفید ہوتی ہے۔ اپنے عمل کی سطح پر آ کر کھجور کا درخت اور انسان ایک ہو جاتے ہیں۔ دونوں کی ذات دوسروں کے لیے باعثِ راحت و تسکین بن جاتی ہے۔

کھجور کے درخت کی انسانی شخصیت کے ساتھ مماثلت کی اِس گفتگو کے بعد ہم کھجور کے درخت کی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ کھجور کے درخت کے پتے اپنی ساخت میں بہت خاص ہیں۔ اس کا ہر پتہ Parabolic ساخت کا ہوتا ہے یعنی ابتداء سے پتلا پھر درمیان سے موٹا اور اگلے سرے پر پتلا۔ بہت سے پتے مل کر بھی ایک Parabolic شکل بناتے ہیں۔ درخت کے پتوں کی یہ انفرادی شکل اور پوری شاخ کی شکل تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ Parabolic ساخت ایک سادہ سی ابتدا ایک مضبوط وسط اور ایک توانا سرے کی علامت ہے۔

Parabolic ساخت کائنات میں توازن کی مظہر ہے یہ جیومیٹری کی وہ ساخت ہے جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل

کائنات کی تشکیل کا عکس ہے۔ پوری کائنات ایک سادہ ابتدا رکھتی ہے۔ یہ ایک نقطے سے شروع ہوئی پھر ایک دھماکے سے اِس نقطے نے پھیلنا شروع کیا جسے بگ بینگ کہتے ہیں اور بالآخر یہ اپنے پھیلاؤ کے اختتام پر پھر سمٹ جائے گی۔ یہ بھی ایک Parabolic ابتدا، درمیان اور انتہا ہے۔ پیدائش کے مراحل میں بھی انسان اِسی Parabolic شکل میں ہوتا ہے۔

انسان کی سجدے میں صورت وہی ہوتی ہے جو کائنات کی شروع سے آخر تک ہے یا جو کھجور کے درخت کے انفرادی پتہ کی حالت پتوں کے ساتھ مل کر ہوتی ہے۔ Parabolic شکل پورے اسلام کے فلسفے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ چاہے وہ انسان ہو یا درخت یا پوری کی پوری کائنات سب ایک غیر اہم نقطے، بیج یا ذرے سے شروع ہوئے ہیں۔ یہ سب ایک عرصے تک پھیلتے رہتے ہیں، ترقی کرتے ہیں اور پھر آخر میں سمٹ کر ایک نقطے پر جمع ہو جاتے ہیں۔ انسان پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے اس دوران وہ خود Parabolic حالت میں جا کر اِس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ ایک نقطے سے شروع ہوا۔ وقت کے ساتھ پھیل گیا اور بالآخر سمٹ جائے گا۔

انسان کے برعکس جو ایک خاص وقت پر اپنی مرضی سے اس حالت کو اپناتا ہے، کھجور کا درخت ہر لحاظ سے اور ہر وقت اِس حالت میں رہتا ہے۔ ہم نے پتے اور شاخ کا ذکر کیا جو Parabolic حالت میں ہوتے ہیں۔ اگر آپ کھجور کے پورے درخت پر غور کریں تو وہ بھی اسی حالت میں ملے گا۔ درخت کا سب سے اُوپر کا اور نیا پتہ ایک پتلا سا سر نکالے اُوپر کی طرف ہوگا۔ پھر پتوں کا پھیلاؤ ہوگا اور نیچے تنا زمین میں ایک مقام پر اندر جا رہا ہوگا۔ یہ پوری صورت Parabolic حالت ہے۔ اب آپ اِس کے پھل پر غور کریں۔ کھجور بھی Parabolic پھل ہے۔ اور پھر آپ اِس کے بیج پر غور کریں تو یہ بالکل اور اصل Parabolic شکل ہوتی ہے۔ اگر آپ کھجور کے بیج کا موازنہ ایک سجدے میں گئے انسان سے کریں تو کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ اب اگر اسی درخت کی جڑوں کا مشاہدہ کیا جائے تو یہی حالت نظر آئے گی۔ درخت کی جڑیں بھی Parabolic حالت میں زمین کی گہرائی کی طرف بڑھتی ہیں۔ درخت کی جڑیں ایک نقطے سے شروع ہوتی ہیں پھر ان کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور پھر ایک مضبوط گہری جڑ نیچے کی طرف جاتی نظر آتی ہے۔

دراصل Parabolic شکل فطرت سے ہم آہنگی کی نشانی ہے۔ اِس لیے زیادہ سے زیادہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل

ترقی اور عروج اِسی ساخت کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔ Parabolic حالت فطرت کی بہترین ساخت ہے۔ کھجور کے درخت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ بیج سے لے کر پورے درخت تک ہر وقت اور ہر موسم میں اپنی Parabolic ساخت کو برقرار رکھتا ہے۔ اِسی لیے یہ فطرت سے ہم آہنگ ہے اور اِسی لیے یہ ترقی اور کامرانی کی علامت ہے۔ انسان کو بھی کامیابی کے لیے اِسی ساخت میں آنا ضروری ہے۔ دن میں بیسیوں دفعہ سجدے میں جا کر انسان اِس بات کا ذہنی، جذباتی اور جسمانی طور پر اعادہ کرتا ہے کہ وہ اپنی Parabolic حالت کو زائل نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنے ذہن کو اُوپر کی طرف ہی لے جائے گا اور اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دے گا۔ پھر یہ کہ وہ اپنی جڑوں کو گہرائی کی طرف لے جائے گا اور کسی دوسری طرف مڑنے نہیں دے گا۔ یعنی وہ اپنی رغبتوں کو مضبوط رکھے گا اور جذبات میں توازن برقرار رکھے گا۔ اور اُس کے عمل سے لوگوں کو فائدہ ہی پہنچے گا۔ کھجور کے درخت کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ موسم کوئی بھی ہو اِس کے پتے نہیں جھڑتے۔ پتے جھڑنے کا عمل مشاہدے کے کم یا ختم ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ عمل انسانی شخصیت میں ایک بڑی تبدیلی کی ابتدا ہے اِس لیے اِس پر توجہ دینا ضروری ہے۔ پتے کب جھڑنا شروع ہوتے ہیں؟ جب انسان مشاہدہ نہیں کرتا اور انسان مشاہدہ کب نہیں کرتا؟ جب اُس کا ذہن Bush ٹائپ یعنی Mammal Brain سے ہوتا ہوا Dead ٹائپ یعنی Reptile Brain میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

انسان کا دماغ Dead ٹائپ میں تب تبدیل ہوتا ہے جب اُس کی کوئی ایک یا ایک سے زیادہ رغبتیں شدید ہو جاتی ہیں۔ انسان کے جذبات شدید ہو جاتے ہیں اور پھر انسان اپنی رغبت کے حصول کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ ممکن ہے انسان کو اپنی اولاد کے حوالے سے خوف ہو کہ وہ ترقی نہیں کرے گی۔ بس پھر وہ ہر وقت اپنے دماغ کو اِسی مقصد کے لیے استعمال کرے گا اور ایسا کرتے ہوئے اُس کا مشاہدہ ختم ہو جائے گا وہ مسلسل اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے حواسِ خمسہ کا استعمال کرے گا۔ ممکن ہے اُسے اچھی غذا کھانے کی لت پڑ جائے۔ پھر چونکہ اُس کا دماغ بہترین غذا کے حصول کے لیے سرگرم ہو گا اِس لیے اُس کا مشاہدہ اِسی پر مرکوز رہے گا۔ وہ اچھی غذا کے بارے میں سُنے گا کہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ وہ غذا کو سونگھے گا اُس کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے وہ اچھے کھانے دیکھنے کے لیے ہی اپنی آنکھوں کو استعمال کرے گا۔ اور یوں اُس کا مشاہدہ ختم ہو جائے گا اور وہ مسلسل اپنے حواسِ خمسہ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

استعمال اپنی رغبتوں کے لیے کرے گا۔

جس کے پتے نہیں جھڑتے اُس کا مشاہدہ نہیں رُکتا اور جس کا مشاہدہ نہیں رُکتا وہ اپنی رغبتوں کے شکنجے سے آزاد ہوتا ہے۔ رغبتوں کے نرغے میں آتے ہی انسانی مشاہدہ ختم ہو جاتا ہے اور حواسِ خمسہ کا استعمال رغبتوں کے زیرِ اثر آ جاتا ہے۔

کھجور کا درخت اچھا ماڈل ہونے کی ایک اہم وجہ اُس کا تنا ہے۔ کھجور کے درخت کا ایک طاقتور تنا ہونے کا مطلب ہے ذہنی یکسوئی۔ اِس کا مطلب ہے کہ انسان نے اپنی زندگی چند اصول وضوابط کے تحت منظّم کر رکھی ہے۔ اُس کے خیالات میں انتشار نہیں ہے اور وہ پل میں تولہ پل میں ماشہ نہیں ہوتا۔ وہ دورُخا نہیں۔ وہ ایک وقت میں دو دو کام نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کی بات سُنتے ہوئے کچھ اور نہیں سوچتا۔ وہ دوسروں کو تحمل اور دلائل کے ساتھ سمجھاتا ہے۔ مشکل حالات اُسے اپنے مقصد سے نہیں ہٹاتے اور اُس کے پاس اپنی بات سمجھانے کے واضح دلائل موجود ہوتے ہیں۔

کھجور کے درخت کا ایک تنا طاقتور جڑوں کو جنم دیتا ہے۔ یعنی انسان کی رغبتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی اُس کے جذبات میں ایک توازن برقرار رہتا ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ انسان کی تمام رغبتوں سے پیدا ہونے والے خوف، غم، لذت، اُمید اور انعام برابر ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کو عزتِ نفس کے حوالے سے زیادہ دُکھ ہو اور لذت کم۔ لیکن اُسے علم سے جو لذت مل رہی ہو وہ عزتِ نفس کی لذت کی کمی کو پورا کر دے۔

کھجور کے درخت کے ماڈل میں تمام جذبات کا توازن برقرار ہونا بہت ضروری ہے۔ یوں سمجھیے کہ انسان جذبات کا ترازو ہے جس کے پانچ پلڑے ہیں۔ اِس ترازو کے پانچوں پلڑوں میں برابر وزن ہونا نہایت اہم ہے۔ برابر وزن ہی دل میں ایسا توازن قائم کرتا ہے جس کی بدولت جذبات کو گہرائی میسر آتی ہے۔

اگر ایسا نہ ہو تو جذبات کا توازن برقرار نہیں رہتا یعنی جڑ ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً غم بڑھ جاتا ہے اور انعام کم ہو جاتا ہے۔ جڑ کے ٹیڑھا ہونے کا مطلب ہے کہ تنا اپنا عمودی وجود برقرار نہیں رکھ پائے گا۔ لہٰذا تنا بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور انسان تیزی سے Bush ٹائپ میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔

کھجور کے درخت کا مطالعہ ایک توازن کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایسا توازن جس میں تنے اور جڑ کا تناسب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قائم ہے اور اِسی طرح پانچ جذبات بھی اپنا تناسب برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ انسان کو بھی اپنے اندر یہ توازن برقرار رکھنا ہے۔ اپنی سوچ اور نظریات کو واضح ،مضبوط اور مربوط رکھنا ہے۔ کھجور کے درخت کا توازن اللہ کی طرف سے قائم ہے جبکہ انسان کو اپنا توازن خود قائم کرنا ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے۔ انسان کو کیسے پتا چلے کہ اُس کا توازن بگڑ رہا ہے وہ کیسے دل و دماغ کا تناسب برقرار رکھ سکتا ہے۔ کیا اِس کے لیے کوئی لائحۂ عمل ہے؟

اِس سوال کا جواب ہم اگلے باب میں تلاش کریں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۲۰. انسانی ماڈل کے محرکات

کھجور کے درخت کا ایک ننھا سا بیج زمین میں پھوٹ پڑا اِس میں سے دو چیزیں برآمد ہوئیں۔ جڑ نے نیچے زمین کا رُخ کیا جبکہ پتہ اُوپر کی طرف اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ جڑ گہرائی کی تلاش میں آگے بڑھی۔ پتہ سورج کی جستجو میں اُوپر کو لپکا۔ یہ درخت جس نے آج یہ لمبا سفر شروع کیا ہے، دونوں سمتوں میں سفر کرے گا۔ بلندی کی طرف بھی اور گہرائی کی طرف بھی۔ اپنی پیدائش کے دن سے درخت کے اُوپر اور نیچے والے حصوں پر دو الگ الگ اور اہم ذمہ داریاں ہیں جن کو یہ بے چون وچرا اپنی زندگی کے آخری دن تک نبھائیں گے۔ جڑیں معدنیات اور پانی کی تلاش میں زمین کے اندر اپنا مشن پورا کریں گی۔ جبکہ اُوپر اُٹھنے والے پتے روشنی کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش میں جُت جائیں گے۔ جڑ سے ملنے والی خوراک اور سورج کی روشنی سے حاصل ہونے والی توانائی درخت کو پھلنے پھولنے میں مدد دیں گی اور پھر وہ انسانیت کے فائدہ کے لیے پھل دیتا رہے گا۔

انسان کی شخصیت بھی مشاہدہ اور جذبات کی مرہونِ منت ہے۔ مشاہدہ جتنی وسعت کے ساتھ ہوگا وہ اُتنا ہی بہتر ہوگا۔ معلومات جتنی تیزی سے جمع کی جائیں گی وہ آلودگی سے اُتنی ہی پاک ہوں گی۔ انسان اپنے مشاہدے کو جتنی وسعت دے گا، جتنے زیادہ ذرائع سے معلومات جمع کرے گا، جس قدر وہ دوسروں کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر مشاہدہ کرے گا اُتنا ہی اُس کا مشاہدہ خالص اور مستند ہوگا۔ مزید برآں انسان کے جذبات اور رغبتوں کو تبدیل کرنا مشکل ہوگا۔ یہی انسان کی نفسیاتی طور پر صحت مند ہونے کی نشانی ہے۔ اِس گہرائی کی بدولت انسان اپنے راستے سے نہیں بھٹکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان اِن کیفیات کو کیسے حاصل کرتا ہے۔ یعنی وہ کیسے کھجور کے درخت کے ماڈل کے مطابق خود کو ڈھال سکتا ہے؟ اِس مقصد کے لیے ہمیں نور کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ نور کی حقیقت روشنی سے مختلف ہے۔ روشنی ہمارے اردگرد موجود ہوتی ہے اور ایک منبع سے پیدا ہوتی ہے۔ روشنی کا بڑا منبع تو سورج ہے۔ اِس کے علاوہ بھی بہت سے ذرائع سے روشنی حاصل ہوتی ہے۔ بلاشبہ روشنی اور نور میں فرق ہے لیکن کچھ باتیں مشترک بھی ہیں۔ اِس سلسلے میں ہم روشنی کی اِن خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں طبیعات کے میدان میں ہونے والی تحقیق سے پتا چلتا ہے۔ روشنی کی اہمیت کے بارے میں گفتگو کا آغاز ہم آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت سے کرتے ہیں۔ نظریۂ اضافیت سے ہمیں روشنی کے دو خواص کا اندازہ ہوتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روشنی ایسی چیز ہے جسے کھڑے ہو کر دیکھیں یا کسی تیز رفتار سواری میں سفر کرتے ہوئے دیکھیں یہ ایک سی نظر آئے گی۔ اِس خوبی کی بدولت روشنی کا مشاہدہ کرنے کے لیے حرکت میں ہونا یا کھڑے ہونا ضروری نہیں ہے۔ روشنی کی دوسری خوبی مشاہدہ کرنے کے مقام سے متعلق ہے۔ اِس بات کو ہم ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ ایک فرد زندگی میں پہلی دفعہ ہاتھی کی تصویر دیکھتا ہے۔ تصویر میں صرف ہاتھی کی ٹانگیں اور چھوٹی سی دم واضح ہے۔ اِس تصویر کو دیکھنے والا چاہے کتنے ہی غور سے کیوں نہ دیکھ لے کبھی بھی تصور نہیں کر سکتا کہ اِس جانور کے منہ پر ایک لمبی سونڈ لگی ہے جو اُس کی دم سے کئی گُنا بڑی ہے۔ ہم کسی بھی چیز کا مشاہدہ جب ایک طرف سے کرتے ہیں تو اُس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم نے اُس کو چاروں طرف سے دیکھ لیا ہے۔ جوتے جیسی چھوٹی سی چیز کو ہی لے لیجیے۔ جوتے کو اُوپر، نیچے، آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں طرف سے دیکھ لینے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ نے جوتے کے تلوے کے بارے میں بھی جان لیا۔ تلوے میں کیا میٹریل استعمال ہوا ہے اِس بارے میں ہم قیاس تو کر سکتے ہیں لیکن حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک ہم اُس حصے کا مشاہدہ نہ کر لیں۔ روشنی کے ساتھ یہ قباحت نہیں ہے۔ روشنی ہر سمت سے ایک سی ہی ہوتی ہے۔

روشنی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ روشنی دنیا بلکہ یوں کہیئے کہ کائنات کی تیز ترین شے ہے۔ کوئی اور شے روشنی کی رفتار سے حرکت نہیں کر سکتی۔ روشنی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہم اِس کو حرکت کرتا نہیں دیکھ سکتے۔ بٹن دبائیں تو بلب سے روشنی اتنی تیزی سے نکلے گی کہ ہم اُس کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا ادراک نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا ہم روشنی کی رفتار سے سفر کر سکتے ہیں؟ اب تک تو یہ ممکن نہیں ہے اگر ہم روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کے قابل ہو جائیں تو کیا ہو؟ روشنی کی رفتار تک پہنچ کے مادی وجود رکھنے والی ہر شے اپنی مادی ہیئت کھو بیٹھتی ہے۔

آپ کسی تیز رفتار سفر کا تصور کریں۔ سو میل فی گھنٹہ پر ممکن ہے ایک فرد کو خوف محسوس ہو۔ لیکن وہ جسمانی طور پر اپنا وجود برقرار رکھے گا۔ دو سو میل پر خوف کی وجہ سے یا تو اُس کا بلڈ پریشر بڑھ جائے گا یا کم ہو جائے گا لیکن اُس کا وجود برقرار رہے گا۔ آپ اِس رفتار کو ۱۵۰۰ میل گھنٹہ پر لے جائیں۔ یہ رفتار ہوائی جہاز سے ممکن ہے چونکہ ہوائی جہاز میں ہوا کا دباؤ مصنوعی طور پر برقرار رکھا جاتا ہے اِس لیے اُترتے چڑھتے وقت کچھ دباؤ محسوس ہوتا ہے مگر انسان کی مادی حالت تبدیل نہیں ہوتی۔ روشنی کی رفتار پر پہنچ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے محرکات

انسان اپنی مادی حالت کھو بیٹھتا ہے۔یعنی وہ مادی طور پر تحلیل ہونا شروع ہو جاتا ہے یا یوں کہیں کہ روشنی کی رفتار کے قریب پہنچ کر اُس کا وزن کم ہونا شروع ہو جائے گا۔اور عین روشنی کی رفتار پر اُس کا وزن صفر ہو جائے گا۔لیکن اُس کا مادی جسم صرف تحلیل ہی نہیں ہو گا بلکہ حرارت یا توانائی میں تبدیل ہو جائے گا۔ اُس کے جسم سے حرارت کا ایک سمندر نمودار ہو گا جس میں اُس کا مادی وجود تحلیل ہو گا۔یعنی روشنی کی رفتار کو پہنچ کر گوشت پوست کا انسان توانائی اور قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

روشنی کی اِن دو خوبیوں کے ذکر کے بعد ہم آتے ہیں نور کی طرف۔روشنی کی طرح نور بھی اپنے اندر یہ خوبی رکھتا ہے کہ اِس کا مشاہدہ کہیں سے بھی کریں وہ ایک سا ہو گا۔نور کی ہیئت تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ ہر عمر، ہر عقل، ہر ذوق کے انسان کو ایک سا نظر آئے گا۔ ہر مزاج اور ہر طبیعت کا فرد نور کو ویسا ہی پائے گا۔

روشنی کی طرح نور بھی انسان کے اندر زبردست قوت اور توانائی پیدا کرتا ہے۔لیکن چونکہ نور انسان کے نفسیاتی اور غیر مادی وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اِس لیے وہ قوت اور توانائی جو روشنی مادے کو تحلیل کر کے پیدا کرتی ہے نور انسانی وجود کو برقرار رکھتے ہوئے پیدا کر دیتا ہے۔لیکن نور کے کچھ خواص ایسے ہیں جو اُسے روشنی سے الگ کرتے ہیں۔نور ایک لطیف روشنی ہے۔اِس میں شدت اور حرارت نہیں۔نور اپنا وجود نفسیاتی سطح پر رکھتا ہے یہ نہ تو عام آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُسے ناپنے کا کوئی پیمانہ ایجاد ہوا ہے۔یہ نور کائنات میں ہر جگہ موجود ہوتے ہوئے بھی انسانی آنکھ سے اوجھل ہے۔یہی نور انسان کو ذہنی اور قلبی سطح پر آگے بڑھنے کے لیے توانائی مہیا کرتا ہے۔یہی نور انسان کو خیر و شر میں تمیز سکھاتا ہے اور اِسی نور کی بدولت انسان درست مشاہدہ کرتا ہے۔نہ صرف یہ کہ نور کے ماحول میں انسانی ترقی کی رفتار بڑھ جاتی ہے بلکہ نور انسان کی ذات میں سکون، راحت اور لذت کا باعث بنتا ہے۔اِس نور کی بدولت اُسے غم رہتا ہے نہ خوف۔ یہ نور اُسے پُر امید رکھتا ہے۔اُس کی عزتِ نفس بڑھ جاتی ہے۔نور سے متاثر ہونے والی عزتِ نفس نور کی طرح خالص اور پاکیزہ ہوتی ہے۔تمام مادی اور معاشرتی رغبتوں سے آزاد ہوتی ہے اور انسان کو زبردست نفسیاتی قوت بہم پہنچاتی ہے۔یہ توانائی انسان میں سے کمزور ہونے کا خوف ختم کر دیتی ہے۔

چونکہ نور کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اِس لیے آئے دن ہونے والے واقعات اور حادثات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے محرکات

انسانی نفسیات پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ نور کی پناہ میں آتے ہی انسان روزمرہ کے جھگڑوں اور مسئلوں سے خوف زدہ یا غمگین ہونا چھوڑ دیتا ہے اُس کی نگاہ بلند ہو جاتی ہے۔ اور اُس کے بعد اُسے چھوٹی چھوٹی باتیں اور محرومیاں ڈسنا چھوڑ دیتی ہیں۔

ٹھنڈک اور توانائی دونوں کا امتزاج نور کو ہر دوسری چیز سے ممتاز کرتا ہے۔ ایک طرف تو نور نفسیاتی سطح پر انسان کو وہ گرمی اور توانائی دیتا ہے جس کی بدولت انسان عمل کرنے کے قابل ہو جائے۔ دوسری طرف نور انسان کو اتنا لطیف اور ہلکا کر دیتا ہے کہ پھر اُسے مادی اور معاشرتی رغبتوں کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ نور انسانی فکر کو اتنی بلندی پر لے جاتا ہے کہ وہاں سے کیا گیا مشاہدہ انسان کو عام چیزوں اور واقعات کو نئے انداز میں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایسا ہونے سے انسان کو اپنی ذات، دوسرے لوگوں اور کائنات کا نئے انداز میں مشاہدہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور اِس مشاہدہ کی لذت ہر دوسری لذت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اِسی لیے نور کی بدولت جنم لینے والی رغبتیں بہت طاقتور ہوتے ہوئے بھی بہت لطیف ہوتی ہیں۔ انسان کی رغبتوں میں لطافت اور طاقت کے آتے ہی انسان فراخ دل ہو جاتا ہے اُس کے اندر سے حسد ختم ہو جاتا ہے لیکن عمل کی خواہش بڑھ جاتی ہے اور ہمدردی کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ نور معاشرتی رغبتوں کو صحیح سمت گامزن کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اور انسان گہرائی سے مزید گہرائی میں اترتا جاتا ہے۔ یوں کہیئے کہ پھر سے چھوٹی چھوٹی جڑیں مل کر ایک بڑی جڑ میں بدل جاتی ہیں۔ آخر کار ایک موٹی اور گہری جڑ جو بالکل سیدھی نیچے کو جا رہی ہوتی ہے وجود میں آتی ہے۔ قرآن اُسے خشیۃ الرحمٰن کا نام دیتا ہے۔ یہ جڑ ہے رحمٰن کے خوف کی۔ جو باقی تمام رغبتوں کو اپنے اندر سمو کر اُن پر حاوی ہو جاتی ہے اس کے بعد انسان رحمٰن کے خوف میں زندہ رہتا ہے۔

یہ جڑ صرف نور کے حصار میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اِس کے بغیر رحمٰن کے خوف کی جڑ کا وجود انسانی نفسیات میں ممکن نہیں ہے۔ ایک طرف تو انسان اپنے رحمٰن کی رحمانیت سے پُر اُمید ہوتا ہے اور رحمٰن کے بارے میں سوچ کر لذت محسوس کرتا ہے اور دوسری طرف مستقبل میں حاصل ہونے والا رحمٰن کا جلوہ اُسے نیک عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر رحمٰن کے خوف کی وجہ سے وہ کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو نور کے حصار سے باہر ہو۔ وہ نور سے باہر نکل کر مشاہدہ کرنے سے بھی خوف زدہ ہوتا ہے اُسے ماضی میں رحمٰن کو ناراض کرنے کا غم بھی ہوتا ہے۔ باقی ساری رغبتیں اِس ایک رغبت سے پھوٹتی ہیں۔ مثلاً اولاد کی رغبت کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے محرکات

لیجیے۔انسان کے دل میں خشیۃ الرحمٰن کی رغبت سے پھوٹنے والی اولاد کی رغبت اللہ سے تعلق کی بدولت ہوتی ہے۔انسان اپنی اولاد کی تربیت اللہ کی خوشی کے لیے کرتا ہے۔اُسے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اِس کی اولاد اللہ کی ناراضگی مول نہ لے لے۔اُسے اللہ کی عطا کردہ اولاد میں لذت محسوس ہوتی ہے۔اُسے اُن تمام مواقع کا سوچ کر غم ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی اولاد کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر نہ چلا سکا۔پھر اُسے اُمید ہوگی کہ اُس کی اولاد رحمٰن کے بتائے ہوئے طریقے پر چل کر جنت میں داخل ہوگی۔اس کی اولاد کے نیک اعمال اُس کے لیے انعام ہوں گے۔خشیۃ الرحمٰن کی رغبت صرف نور کے حصار میں ہی پیدا ہوسکتی ہے۔

اب ہم آتے ہیں اِس بات کی طرف کہ یہ نور آتا کہاں سے ہے؟ یہ نور اللہ کی ذات سے آتا ہے۔انسان میں اللہ نے خاص روح پھونکی ہے۔اِس روح کا تعلق خاص اللہ سے ہے۔ہم نہیں جانتے کہ روح کی کیفیت کیا ہے۔لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اِس روح کا تعلق براہ راست نور سے ہے۔نور ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان کی روح اللہ کے ساتھ رابطے میں رہتی ہے۔نور کے علاوہ روح کو اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔یہاں یہ بات اہم ہے کہ کائنات کے بننے سے پہلے اللہ نے معاشرتی روحوں سے ہی عہد لیا تھا اور روحوں نے ہی تصدیق کی تھی کہ بے شک اللہ ہی رب ہے۔اِس وقت روحیں اللہ کے سامنے سو فیصد خشی الرحمٰن کی رغبت میں کھڑی تھیں۔اُن کا خالق جو اُن سے بہت محبت کرتا ہے اُن کے سامنے تھا اور روحوں پر اللہ کا رحمٰن ہونا اُس وقت بالکل واضح تھا۔پھر اتنے طاقتور حکمران کا خوف بھی موجود تھا جو ''کُن'' کہہ کر اتنی بڑی کائنات تخلیق کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔جس کے پاس فرشتوں کی اتنی بڑی فوج ہے کہ شمار نہیں کی جاسکتی۔ظاہر ہے کہ اِس بے انتہا طاقت کے مالک کے سامنے خوف تو ہوگا۔اللہ کی محبت اور خوف نے مِل کر خشی الرحمٰن کی رغبت کو جنم دیا۔روح دنیا میں اِسی ایک رغبت کے ساتھ آتی ہے اور نور کی کیفیت میں ہوتی ہے۔کوئی بھی فرد جو خشی الرحمٰن کی رغبت رکھتا ہو چاہے وہ بچہ ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد نور کے حصار میں داخل ہوجاتا ہے۔بچے چونکہ فطرت سے قریب ہوتے ہیں اس لیے وہ خشی الرحمٰن کی رغبت اپنی روح میں موجود پاتے ہیں اور پیدائش کے وقت نور کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔اگر انسان فطرت سے قریب رہے اور اِس کی خشی الرحمٰن کی رغبت برقرار رہے اور اسی ایک رغبت سے باقی کی رغبتیں جنم لیں تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے محرکات

انسان نور کے دائرے سے کبھی بھی باہر نہ جائے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ خشی الرحمٰن کی رغبت کے ساتھ جوں جوں انسان آگے بڑھتا ہے اللہ کے قریب ہوتا جاتا ہے اور نور میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا عدل ہے۔ انسان جس قدر کوشش کرتا ہے اللہ اُس سے کئی گُنا زیادہ نور کی قوت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ نور کی طرف بڑھنے سے انسان کو لذت ملتی ہے اور وہ نور کے اور قریب ہو جاتا ہے۔ اُس کے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ اُس پر نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ وہ نئی نئی حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ اِس علم کی وجہ سے اُس کی خشی الرحمٰن کی رغبت اور بڑھتی ہے اور پھر وہ اچھے اعمال کی طرف راغب ہوتا ہے۔

نور کی طرف بڑھنے کی یہ خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ انسان کو نور میں آگے بڑھنے کی لذت ہر دفعہ پہلے سے زیادہ ملتی ہے وہ مزید شوق سے آگے بڑھتا ہے اِس اُمید پر کہ وہ اللہ کے نور سے قریب ہو جائے۔ اُسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ لذت ملنا ختم نہ ہو جائے کہیں وہ نور کے دائرے سے باہر نہ نکل جائے۔ اُسے غم ہوتا ہے کہ وہ اتنا کچھ کر نہیں پاتا جس کی بدولت نور کے پاس زیادہ تیزی سے جا سکے۔ اِسی کیفیت سے دوچار ہو کر علامہ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

انسان جانتا ہے کہ نور کی انتہا اللہ کی ذات ہے اِس لیے وہ مسلسل اللہ کی جانب سفر کرتا رہتا ہے۔ اللہ کا سفر نور کا سفر اور نور کا سفر اللہ کا سفر ہے۔ لیکن یہ نور بہر حال اللہ نہیں ہوتا اللہ کی ذات نور سے الگ ہوتی ہے۔ انسان اللہ کے نور کو پا کر ایسا سرشار ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی جانب اور تیزی سے سفر کرتا ہے۔ اللہ اُس کا ذوق وشوق دیکھ کر اُس کی طرف بھیجے گئے نور میں کئی گُنا اضافہ کر دیتا ہے۔ اِس نور کی لذت انسان کو آگے بڑھنے کے لیے بے چین کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اُسے موت آ جاتی ہے۔ کوئی انسان موت سے پہلے نور کے منبع تک نہیں پہنچ پایا۔ ہر انسان نور کے منبع کو دیکھنے کی فقط اُمید لے کر مرا ہے۔ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے جو معراج کی رات اِس نور کے منبع کے سامنے کھڑی ہوئی تھی لیکن نظر اُٹھا کر وہ بھی نہ دیکھ سکے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک انسان ہیں۔ اور اِس حالت میں اللہ کو جو نور کا منبع ہے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ خواہش صرف مرنے کے بعد پوری ہوگی۔ یہاں نور اور اللہ کی ذات کے حوالے سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے محرکات

کچھ باتیں وضاحت طلب ہیں۔معراج کے موقع پر تمام انسانوں میں سے صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی جن کے اندر یہ قوت اور علم تھے کہ وہ اللہ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی نور کے منبع کو دیکھ لینے کی خواہش پوری نہ کریں۔حالانکہ اللہ کا دیدار کرنے کی خواہش رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی اور فرد میں نہیں ہوسکتی تھی۔لیکن آمنا سامنا ہونے پر بھی اُنہوں نے آنکھ اُٹھا کر اللہ کو نہیں دیکھا۔کیونکہ وہ اُس وقت بشری حالت میں تھے اور اللہ کا دیدار کرنے کے لیے موت کا مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے۔یہ بات واضح کرنا اِس لیے ضروری ہے کہ بعض اوقات دنیا میں رہتے ہوئے انسان نور کی لذت سے ایسا مسحور، اتنا بے خود اور اتنا مدہوش ہوجاتا ہے کہ اللہ کے نور کو اللہ کی ذات سمجھ لیتا ہے۔اِسی مشکل کو علامہ اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

نور کے دائرے میں آئی عقل نور میں نہائی ہوتی ہے۔لیکن اِس کے بعد بھی نور کا مقصد منبع یعنی اللہ تک پہنچانا ہوتا ہے یہ نور بذاتِ خود راستہ دکھانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔اِس نور کی وجہ سے انسان کھجور کے درخت کے ماڈل کی صورت میں قائم رہ سکتا ہے۔جس کا تنا ایک ہی رہتا ہے۔پتے نور کے دائرے میں اُوپر کی طرف بڑھتے ہیں یعنی نور کے منبع کی طرف۔بالکل ایسے ہی جیسے کھجور کی گٹھلی سے چھوٹا سا پودا روشنی کی سمت بڑھتا ہے۔

اِس اُوپر کی طرف بڑھتے تنے سے خشی الرحمٰن کی رغبت پیدا ہوئی جو توازن قائم رکھتے ہوئے دوسری جانب زمین میں جڑ کی صورت اندر کی طرف بڑھتی ہے۔یہ تناسب ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔یہی وہ میزان ہے جسے اللہ نے انسان کی ذات سے لے کر کائنات میں موجود ''بلیک ہول'' تک ہر جگہ قائم کر رکھا ہے۔

جو لوگ ساری عمر اللہ کے نور کی جانب سفر کرتے ہیں وہ نور کے منبع کو دیکھنے کی خواہش لے کر قیامت کے دن اُٹھیں گے۔دنیا میں جو نور اُن کو راستہ دکھاتا تھا اب اُن کے آگے آگے چلے گا۔اُن کی زندگی میں اُن کا نور دوسروں سے چُھپا ہوا تھا۔لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ لوگ اِس قسم کے فیصلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیوں کرتے تھے۔ وہ ان کے اعمال کی وجہ نہیں جانتے تھے کیونکہ اُنہیں وہ نور نظر نہیں آتا تھا۔ قیامت کے دن اُن کو دنیا میں راستہ دکھانے والا لیکن نظر نہ آنے والا نور نظر آئے گا بالکل ویسے ہی جیسے فلش لائٹ کی روشنی نظر آتی ہے۔ وہ اِس روشنی میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔ یہ روشنی اُنہیں اللہ کے پاس لے جائے گی۔ جہاں جا کر وہ صرف ایک ہی لذت حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کریں گے۔ ''یا اللہ آج ہمیں نور کے منبع تک پہنچا دے۔ آج ہمیں اپنا دیدار کروا دے''۔

اِس کے ساتھ ہی ہم اِس باب کے آخری موضوع کی طرف آتے ہیں۔ نور کے دائرے میں آنے کے لیے انسان کیا کرے؟ اُس کی ترقی کس طرح ممکن ہو؟ وہ کس طرح پھلے پھولے کہ اُسے حقیقی راحت محسوس ہو؟ وہ کس طرح خوف اور غموں سے آزاد ہو؟ اور اپنی خواہشات پر قابو پا سکے؟ یہ سب کیسے ممکن ہو؟ یہ تب ہی ممکن ہے جب انسان نور کے دائرے میں آجائے۔ نور کے دائرے میں آنے کا مطلب ہے کھجور کے درخت کے ماڈل کے مطابق شخصیت کا سنور جانا۔

نور کے دائرے میں آنے کا سفر قرآن سے شروع ہوتا ہے۔ انسان سب سے پہلے تو قرآن کا مشاہدہ کرے گا۔ یعنی پڑھے گا۔ اُس کے بعد وہ قرآن کے متن میں دی گئی آیات کا تجزیہ کرے گا، اور اپنے نتائج اخذ کرے گا۔ اگر چہ نتیجہ وہی ہوگا جو قرآن نے دیا ہے۔ یہ ایک متضاد صورتِ حال ہے۔ اگر انسان کو وہی نتیجہ اخذ کرنا ہے جو قرآن نے دیا ہے تو مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ ہم ذہن کے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ جب ہم قرآن کی آیات کو من وعن تسلیم کرتے ہیں تو ہم قرآن کی فائل کے علاوہ اور کوئی فائل نہیں کھولتے۔ ضرورت اِس بات کی ہوتی ہے کہ انسان قرآن کی ہر آیت پر فرداً فرداً غور کر کے اُن کی الگ الگ فائل بنائے۔ قرآن کو تعظیماً پڑھنے سے صرف قرآن کی ایک فائل اپنا وجود برقرار رکھے گی۔ اِس سے کوئی اور فائل نہیں کُھل سکے گی لیکن اگر ہم قرآن کی ایک ایک آیت پر غور شروع کر دیں تو ہر آیت ایک نئی فائل کو جنم دے گی۔ قرآن کے ذریعے نور حاصل کرنے کے لیے اِس مشق کی ضرورت ہے۔ دوسرا مسئلہ اُن غیر مسلموں کا ہے جو قرآن کی ایک ایک آیت پر غور تو کرتے ہیں لیکن اُس کی مدد سے وہ نتائج اخذ نہیں کرتے جو قرآن میں بیان کیئے گئے ہیں۔ وہ قرآن کے مضامین پر تحقیق کرتے ہیں۔ بلکہ دنیا میں آج جو بھی ترقی ہوئی ہے وہ قرآن کی آیات پر تحقیق کی بدولت ہی ممکن ہوئی ہے۔ جو لوگ مغرب کی سائینسی ترقی پر نظر رکھتے ہیں جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ فرانس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے محرکات

بیکن سے شروع ہوتا ہے جس نے مغرب میں سائنسی تحقیق کی بنیاد رکھی۔ فرانسس بیکن کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ہمیں بتاتی ہے کہ اُس نے اندلس کے اسلامی کتب خانوں سے بھرپور استفادہ کیا اور یوں مغرب کی سائینسی ترقی کی اساس قرآن پر غور وفکر کی مرہونِ منت ہے۔ اِس کے علاوہ مغربی ماہرین کی ایک بڑی تعداد نے قرآن کے انگریزی ترجمے کئے ہیں اور مسلمانوں کو سمجھنے کے لیے اُن کی سب سے اہم دینی کتاب کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ لیکن اِس سارے مشاہدے اور تجزیے کے بعد اُنہوں نے وہ نتائج اخذ نہیں کئے جن کو اخذ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور یوں قرآن کا قاری جو قرآن کی آیات کا مشاہدہ اور تجزیہ کر کے قرآن کے مطلوب نتائج اخذ نہیں کرتا یا اپنی مرضی کے نتائج اخذ کرتا ہے وہ قرآن کی بدولت حاصل ہونے والے اللہ کے نور سے محروم رہتا ہے۔ نور حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ دل میں ایمان کو راسخ کرنا ہے۔ ہم ایمان کی تشریح کسی حد تک پہلے کر چکے ہیں۔ ایمان دراصل دل میں خشی الرحمٰن کو پیدا کرنے کا نام ہے۔ اِس کے بعد ہر جذبہ اور رغبت اِسی کے تابع ہو جاتی ہے۔ نور ایمان کا تیسرا طریقہ ہے سُنتِ رسول ﷺ کے مطابق عمل کرنا۔ انسان کے عمل اور اُس کے لیے درکار صلاحیتوں کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ نور کے دائرے میں داخل ہونے کے لیے انسان کا عمل رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے عین مطابق ہونا چاہئے۔ اِس طرح انسان معاشرتی، اقتصادی، حکومتی اور سیاسی طور پر نور کے حصار میں داخل ہو سکتا ہے۔

مثلاً رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے اعمال کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ دن کا ایک حصہ اپنے خاندان کے ساتھ گزارتے، دوسرا حصہ عوام کے ساتھ اور تیسرا حصہ اپنی ذات کے لیے مختص کرتے تھے۔ انسان کو دائرۂ نور میں داخل ہونے کے لیے اپنے اعمال کو انہی حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ یعنی اگر انسان اچھے اعمال کرے اور سارا وقت عوام کے لیے وقف کر دے اور اپنے لیے یا اپنے اہلِ خانہ کے لیے کوئی وقت نہ چھوڑے تو وہ دائرۂ نور میں داخل نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے ہر عمل پر رسول اللہ ﷺ کی سنت کو فوقیت ہے یہ فوقیت اتنی اہم ہے کہ سنت کی پیروی کیے بغیر انسان دائرۂ نور میں داخل ہونے کی صلاحیت سے محروم رہتا ہے۔

قرآن کی بنیاد پر مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کر کے، اپنی رغبتوں کو خشی الرحمٰن کے زیرِ اثر لا کر اور پھر اپنے اعمال کو سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ڈھال کر انسان نور کے دائرے میں داخل ہو جاتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ یہاں پہنچتا ہی وہ ہے جو کھجور کے درخت کے ماڈل کے عین مطابق ہو۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو اِس کتاب کے اگلے باب کا موضوع ہوگا۔ مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنا ایک فطری امر ہے انسان فطری طور پر کھجور کے درخت کے ماڈل پر ہوتا ہے۔ چونکہ وہ معصوم پیدا ہوتا ہے اِس لیے اُس میں خشی الرحمٰن کی رغبت بھی موجود ہوتی ہے پھر ہر انسان نور کے دائرے میں کیوں نہیں ہوتا؟

ابلیس بڑے گھمنڈ سے بولا ''میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور یہ مٹی سے۔ میں اِسے سجدہ

۲۱. ابدی جنگ

کیوں کروں؟'' ابلیس کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی ایک ابدی جنگ کی ابتداء ہوئی۔ ابلیس اور اُس کی فوج بمقابلہ انسان۔

جس دن یہ جنگ شروع ہوئی اُسی دن شیطان نے اپنی جنگی حکمتِ عملی کا بھی اعلان کر دیا۔ اُس نے بلند آواز میں اپنا جنگی پلان پیش کیا، ''میں انسان پر آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر طرف سے حملہ کروں گا۔'' انسان اور ابلیس دونوں دنیا میں بھیج دئے گئے انسان نے دنیا کو ایک میدانِ جنگ نہ سمجھا بلکہ اپنا گھر اور ٹھکانہ تصور کیا۔ شیطان جانتا تھا کہ دنیا ایک عارضی شے ہے۔ وہ دنیا سے پہلے کا وہ دور دیکھ چکا تھا جب وقت رُکا ہوا تھا۔ اُسے پتا تھا کہ اِس دنیا کو عارضی طور پر قائم رہنا ہے۔ وہ یہ خوبی جانتا تھا بلکہ دیکھ چکا تھا کہ اللہ نے ایک انتہائی خوبصورت جنت اور نہایت دردناک دوزخ بنائی ہوئی ہیں۔ دنیا شیطان کے لیے عمل کی جگہ ہے۔ اُس کا عمل کیا ہے اِس پر تو ہم بعد میں بات کریں گے۔ لیکن پہلے اُس رغبت اور جذبے کی بات ہو جائے جس کے زیرِ اثر ابلیس اپنا عمل کر رہا ہے۔ ابلیس میں ایک رغبت ہے اور وہ ہے دشمن کی۔ دشمن کی رغبت میں پانچوں جذبات موجود ہیں۔ اُسے غم ہے کہ انسان کو اُس پر فوقیت دی گئی۔ اُسے یہ بھی غم ہے کہ بہت سے انسانوں سے وہ بدلہ نہیں لے سکا اور وہ جنت میں چلے گئے۔ اُسے انسانوں کو دوزخ میں پہنچا کر لذت ملتی ہے۔ ہر بار جب ایک انسان کھجور کے درخت کے ماڈل کے مطابق نہیں رہتا، جب بھی انسان نور کے دائرے سے خارج ہوتا ہے یا جب انسان کسی ایک رغبت کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو اُس وقت شیطان کو لذت محسوس ہوتی ہے۔ شیطان کو لذت حاصل کرنے کی اُمید رہتی ہے وہ ہر وقت اِسی اُمید میں رہتا ہے کہ اُسے انسان کو بھٹکانے کی لذت ملے گی۔ شیطان انسانوں کو گِنتا ہے۔ وہ سب لوگوں کو دوزخ میں دیکھنے کی اُمید رکھتا ہے۔ اُن کو دوزخ میں پہنچانا اُس کا انعام ہے جسے حاصل کرنے کے لیے وہ عمل کرتا ہے۔ آخر میں صرف ایک جذبہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے خوف کا۔ شیطان کو کس کا خوف ہو سکتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شیطان کو بھی اللہ کا خوف ہے۔ شیطان اللہ سے ڈرتا ہے۔ لیکن انسان سے اُس کی دشمنی ایسی شدید ہے کہ اُس نے اللہ سے اپنی دشمنی نبھانے کی اجازت طلب کی اور اُسے وہ اجازت مل گئی۔ یہاں انسان اور ابلیس کے درمیان ایک فرق واضح ہے۔ ابلیس نے اللہ سے انسان کو بھٹکانے کی اجازت طلب کی۔ اللہ نے اجازت دے دی۔ اللہ اُسے اجازت نہ دیتے تو وہ اللہ کے خوف کے مارے شاید کچھ بھی نہ کر پاتا۔ یاد رہے کہ انسان کو سجدہ نہ کرنا انسان دشمنی کی رغبت کی بنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر ہوا تھا۔ اُس کی دشمنی کی یہ رغبت اُس پر اتنی حاوی ہوگئی کہ اُسے اللہ کا حکم نامناسب لگا۔ لیکن اُس کے دل میں اللہ کا خوف موجود ہے۔ انسان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں۔ ہر انسان اللہ کا خوف محسوس نہیں کرتا۔ انسانوں کی بڑی تعداد اللہ کے احکام سے سرکشی کرتی ہے۔ کیونکہ وہ اللہ سے خوف زدہ نہیں۔ شیطان کا خوف صرف اللہ کے حوالے سے ہے جبکہ اُس کے باقی جذبات دشمن یعنی انسان کے حوالے سے بنے ہوئے ہیں۔ اِس ایک رغبت کے علاوہ اُسے چونکہ اور کوئی رغبت نہیں اِس لیے اُس کا کوئی عمل اپنے دشمن انسان کو شکست دینے کے علاوہ کچھ نہیں۔

زمین پر پہنچ کر انسان نے تو زندگی گزارنے کا سامان پیدا کرنا شروع کیا۔ فصلیں اُگائیں، جانور قابو میں کیے اور خاندان آباد کیا۔ جبکہ شیطان نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ وہ زمین پر صرف انسان کو شکست دینے کے لیے آیا تھا۔ اُس نے زمین پر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ ایک فوج تیار کرنا شروع کی۔ زمین پر انسان کے آنے سے پہلے جنات کی ایک اچھی خاصی آبادی تھی۔ اُس نے اِن جنات میں سے کافر جنوں کو بھرتی کرنا شروع کیا اور پھر ہر ایک انسان کے ساتھ ایک جن کو منسلک کر دیا۔ اب ہر انسان کے پہلو میں شیطان کا ایک کارندہ کھڑا ہے جو انسان کو شکست دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہ جنگ بڑی عجیب ہے۔ اِس جنگ کے ایک حریف یعنی انسان نے اپنے دشمن کو کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کا شیطان سے دوبدو مقابلہ تو کُجا، انسان اُسے حملہ کرتے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ پھر ابلیس کی دشمنی انسان کی اہم رغبتوں میں سے نہیں۔ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کے لیے بہت سی مادی اور معاشرتی رغبتیں موجود ہیں۔ لیکن ابلیس کے لیے دنیا کی کوئی اور رغبت ہے ہی نہیں وہ دن کے ہر گھنٹے اور سال کے ہر دن اپنے دشمن کو شکست دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچتا۔

لیکن اصل کمزوری جو انسان کو شیطان کے مقابلے میں درپیش ہے وہ ہے اُس جگہ کے حوالے سے جہاں سے شیطان انسان پر حملہ کرتا ہے۔ شیطان کو انسان کے دل تک رسائی حاصل ہے۔ وہ کسی بھی وقت انسان کے دل میں داخل ہوسکتا ہے۔ شیطان نہ صرف انسان کے دل میں موجود ایک ایک رغبت، ایک ایک جذبے کو گن سکتا ہے بلکہ وہ موقع پا کر اُن کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ اُس کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ انسان کا خوف بڑھانے کے لیے کوئی چال چل دے یا اُمید دلانے میں کامیاب ہوجائے۔ وہ انعام کی رغبت کو بڑھانے کے لیے بھی کچھ کرسکتا ہے وہ لذت پر بھی اثر انداز ہونے کی

ابدی جنگ

اہلیت رکھتا ہے۔ وہ یہ کام براہِ راست نہیں کرتا نہ ہی وہ ایسا کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ وہ براہِ راست انسان کے دل میں کوئی نئی رغبت پیدا کرنے کے لیے وسوسہ ڈال دیتا ہے۔ یا کسی موجودہ رغبت کو کم یا زیادہ کرنے کا ماحول بنا سکتا ہے۔ وہ کسی ایک رغبت سے وابستہ جذبات میں تبدیلی لانے کے لیے بھی کوئی وسوسہ چھوڑ سکتا ہے۔

اِس تفصیل کے بعد ہم شیطان کے عمل کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں ہم تصور کرتے ہیں ایک ایسے فرد کا جو مکمل طور پر کھجور کے درخت کا ماڈل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کس طرح اِس ماڈل کو پہلے Bush ماڈل اور پھر Dead ماڈل میں تبدیل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ہمارا ماڈل اپنے سارے مشاہدات، تجزیے اور نتائج نور کے دائرے میں رکھتا ہے اُس کی تمام تر رغبتیں خشـــــــی الـرحـمٰـن کی رغبت سے پیدا ہوتی ہیں اور اُس کے بعد اُس کے تمام اعمال سنتِ رسول ﷺ کے عین مطابق ہیں۔ اِس صحت مند نفسیاتی حالت میں ہونے کے باوجود شیطان نے ہمارے ماڈل کا ساتھ نہیں چھوڑا وہ موقع کے انتظار میں ہے۔ موقع ملتے ہی وہ کوئی خیال، کوئی رغبت، کوئی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ تاکہ کسی بھی طرح ماڈل کا توازن خراب ہو۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا اب صورتِ حال یہ ہے کہ کئی سال سے ماڈل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن شیطان نے بھی ہار نہیں مانی۔

پھر ایک دن ماڈل جب وضو کر رہا ہوتا ہے تو شیطان کو موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ وضو کرتے کرتے شیطان ماڈل کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ یہ وسوسہ جسم کی رغبت سے متعلق ہے۔ شیطان جسم کی صفائی کے حوالے سے یہ خوف پیدا کر دیتا ہے کہ شاید اُس نے صحیح وضو نہیں کیا۔ پھر شیطان عمل بھی تجویز کرتا ہے۔ اُس کی تجویز بھی بڑی سادہ ہے۔ پانی زیادہ استعمال کیا جائے۔ اِس عمل کا خیال دماغ میں آتے ہی ماڈل پانی زیادہ کھول دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے کہ پانی بچاؤ چاہے تم نہر کنارے ہی کیوں نہ ہو۔ اِسی لیے پانی کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے سے ماڈل کا عمل نور کے دائرے سے خارج ہو گیا۔ یہ تبدیلی کا آغاز ہے۔ ہم اِسے Deviation یعنی نور سے اندھیرے کی طرف حرکت کہتے ہیں۔ خوف ختم ہونے کے بجائے راسخ ہو گیا۔ جڑ نور کے دائرے سے خارج ہو گئی۔ اب چونکہ توازن ہر حال میں برقرار رہتا ہے۔ اِس لیے جو Deviation ہوئی اُس کا اعادہ ہونے لگا۔ ممکن ہے کہ انسان کو جسم صاف نہ ہونے کا خوف ہو اور اُس کے ساتھ ہی اُسے پانی زیادہ استعمال کرنے کی لذت بھی محسوس ہو۔ اب دو

ابدی جنگ

جذبات جسم کی رغبت سے پیدا ہوئے، ایک صفائی نہ ہونے کا خوف اور دوسرا پانی زیادہ استعمال کرنے کی لذت۔ ممکن ہے کہ اِس کے بعد شیطان انسان کے دل میں یہ غم پیدا کر دے کہ دوسرے لوگ صحیح نہیں کرتے یا یہ کہ ماضی میں وہ وضو صحیح طریقے سے نہیں کرتا تھا۔ اب جسم کی رغبت کی جڑ خشی الرحمٰن کی جڑ سے الگ ہو جائے گی۔ یہ جڑ نور کے دائرے سے خارج ہو جائے گی۔ Deviation کا اعادہ ہوا اور یہاں سے تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا۔ اب شیطان کا کام ختم نہیں آسان ہو گیا ہے۔ یاد رہے کہ انسان کے ساتھ لگے شیطان کا کام انسان کی موت سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔ چونکہ اُسے انسان کو شکست دینے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں لہٰذا اُس کا ہر پل یہ سوچنے میں گزرتا ہے کہ اب وہ یہاں سے انسان کو کہاں لے جائے۔ اب ہمارے ماڈل کی حالت یہ ہے کہ جسم کی رغبت کی بدولت خوف کی Deviation ہوئی پھر اُس رغبت سے لذت کی جڑ نکلی اور ایک رغبت کی تکرار بھی ہو گئی۔ شیطان کے پاس انسان کی تمام رغبتوں کا علم ہے۔ وہ پانچ جذبات کو بھی بہ خوبی جانتا ہے۔ اب وہ حالات کا، انسان کی عادات اور اُس کے طور طریقے کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے گا کہ اگلی Deviation کیا ہو سکتی ہے۔ فرض کرتے ہیں کہ نور کے دائرہ سے باہر نکلے ہوئے اِس رغبت کو کچھ ہفتے یا مہینے گزر گئے۔ ایک دن شیطان نے ایک نیا خوف پیدا کیا ''میں تو اتنا پرہیز گار ہوں۔ کیا پتا میری نماز ٹھیک طریقے سے ادا ہوتی بھی ہے یا نہیں، کیا پتا اللہ میری نماز سے خوش ہے کہ نہیں''۔ یہاں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ شیطان اپنا نام استعمال نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ کہ شیطان نور کے دائرہ سے خارج کرنے کی ابتدا کسی قسم کی مادی یا معاشرتی رغبت سے نہیں کرواتا۔ وہ یہ کام مذہبی وجوہات سے کرواتا ہے اور رفتہ رفتہ جب اُسے یقین ہو جائے کہ انسان مذہب سے دور آ گیا ہے تو پھر مادی اور معاشرتی رغبتوں کی طرف مائل کرتا ہے۔ اِس صورتِ حال میں عزتِ نفس کی رغبت کارفرما ہے۔ یعنی یہ خیال عزتِ نفس کی رغبت میں خوف کا عنصر شامل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ زیادہ پانی استعمال کر کے ذرا سی عزتِ نفس تو بڑھ گئی اور پانی کے زیادہ استعمال کی وجہ سے اُس میں ذرا سی لذت بھی آئی اب اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اُس کے پاس پانی ہے، عقل ہے، وہ جسم کو صحیح طرح سے پاک بھی کرتا ہے۔ اب شیطان اِسی عزتِ نفس کو الگ جڑ بنا کر نور کے دائرے سے خارج کروانا چاہتا ہے لہٰذا اُس نے یہ وسوسہ پھونک دیا کہ شاید عزتِ نفس مجروح ہو رہی ہے اور وہ ٹھیک طرح سے نماز نہیں پڑھ رہا۔ اِس جڑ کے پیدا ہوتے ہی نماز لمبی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ نماز لمبی ہو گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابدی جنگ

سجدے طویل ہو گئے۔ اور یوں عزتِ نفس کی جڑ میں سے Deviation ہو گئی۔ عزتِ نفس کے خوف کی وجہ سے نماز لمبی ہوئی پھر اِس میں لذت آنے لگی۔ انسان کا عمل اُس کی ذات تک محدود ہو گیا اور سنتِ رسول ﷺ کے طریقے سے خارج ہو گیا یوں انسان نور کے دائرے سے باہر ہوتا چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت تھی کہ دن کے تین حصے کرو ایک اپنے لیے، ایک گھر والوں کے لیے اور ایک دنیا کے لیے لیکن اِس رغبت کی بدولت یہ توازن بگڑ گیا۔

اب ہمارا ماڈل کہاں کھڑا ہے؟ دو رغبتوں کا وجود نور کے دائرے سے باہر قائم ہو چکا۔ ایک جسم کی رغبت، ایک عزتِ نفس کی رغبت۔ ماڈل کی جڑ میں تبدیلی تنے میں تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ تنا توازن برقرار رکھنے کے لیے تین حصوں میں بٹ گیا۔ ایک تو موٹا تنا جو نور کے دائرے میں سیدھا کھڑا ہے لیکن ایک پتلی سی شاخ دائیں جانب سے تنے کو توڑتی ہوئی نکلی اور دائرۂ نور سے باہر اندھیرے میں چلی گئی۔ دوسری شاخ بائیں طرف سے تنے سے الگ ہوئی اور نور کے باہر اندھیرے میں بڑھ گئی۔ اِس عمل سے تنے کی طاقت میں کمی واقع ہو گئی۔ تجزیہ اور مشاہدہ دونوں کمزور ہو گئے۔ اب ہمارا ماڈل کھجور کے درخت کی طرح نظر نہیں آتا۔ اگر آپ اِس کا قریب سے بغور مشاہدہ کریں تو اُس کی دو شاخیں اور دو جڑیں آپ کو دائرۂ نور سے باہر جاتی دکھائی دیں گی۔

شیطان کا کام اب آسان ہوتا جائے گا۔ ماڈل کے گھر والے، خاندان اور دوست اُس کی اِس نئی روشنی کی کچھ مخالفت کریں گے تو شیطان کو نیا موقع ہاتھ آئے گا۔ وہ اب رتبے کی رغبت کو بڑھائے گا۔ لوگوں کی مخالفت میں انسان رتبے کی لذت محسوس کرتا ہے۔ اِس لذت سے خیال جنم لے گا۔ ''میں ان لوگوں سے بہتر ہوں۔ ان لوگوں کو میری قدر نہیں مجھے ان سے الگ رہنا چاہیے''۔ یہاں ایک بار پھر یہ وضاحت کر دی جائے کہ یہ احساس شیطان کی طرف سے ہے لیکن چونکہ وہ انسان کے سامنے نہیں بلکہ اُس کے دل میں چھپ کر ایسا کرنے کی طاقت رکھتا ہے لہٰذا وہ اسے انسان کی اپنی آواز بنا دیتا ہے۔ ایسا ہوتے ہی ماڈل کا رویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ لوگوں سے کٹ جاتا ہے۔ وہ اُن کی باتوں کو رد کرتا ہے۔ اُن سے تلخ کلامی کرتا ہے یا معاشرہ کو چھوڑ کر جنگلوں کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ایک بار پھر انسان نے اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے رستے سے انحراف کر لیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے خاندان، گھربار اور دوسری ذمہ داریوں کو نبھانے کا سختی سے حکم دیا تھا۔ اِن ذمہ داریوں سے چھوٹ صرف جہاد کے لیے تھی اور جہاد

بھی وہ جو قتال ہو یعنی کفار کے ساتھ جنگ۔ جہاد کے علاوہ انسان کو اپنے گھر بار کو چھوڑنے کا حکم نہیں تھا۔ لیکن شیطان کے وسوسے نے یہ عمل بھی نور کے دائرے سے خارج کر دیا۔انسان کو شیطان سے بچنے کے لیے اچھے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن انسان شیطان کی ترغیب پر اُنہی انسانوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمارا ماڈل اپنے علاقے میں لوگوں کو اچھائی کی طرف بلاتا تھا اور برائی سے روکتا تھا۔پھر لوگ اُسے اچھائی کی طرف بُلانے لگے۔اوراب وہ اُنہی لوگوں سے فرار اختیار کیے ہوئے ہے۔

کیا شیطان کا کام ختم ہو گیا؟ نہیں ابھی موت نہیں آئی۔لوگوں سے دور کر دیا۔کوئی اِس کی بات نہیں سُنتا لہٰذا اب اپنے اعمال کا جواز پیدا کرنے کے لیے شیطان انسان میں علم کی بے جا رغبت پیدا کر دے گا۔انسان میں غم پیدا کرے گا ''تمہارے پاس علم نہیں اس لیے یہ لوگ تم پر حاوی ہوتے ہیں۔تم علم حاصل کرو''۔اب انسان مختلف اقسام کی کتابیں پڑھنا شروع کرے گا جن میں قرآن بھی شامل ہے۔ لیکن یہ تمام مطالعہ مشاہدہ نہیں ہوگا۔یہ نور کے دائرے سے باہر نکلی ہوئی رغبتوں اور سنت رسول ﷺ سے منحرف اعمال کی دلیل کے لیے ہوگا۔انسان پڑھے گا اور پھر یا تو اُسے اپنی دلیل ثابت کرنے کے لیے مواد مل جائے گا یا پھر وہ کوئی نئی توجیہہ پیدا کر لے گا۔انسان کی اور خاص طور پر مسلمانوں کی تاریخ میں یہ بہت اہم مقام ہے۔اکثر فرقے اور جھوٹے مذاہب اِسی مقام سے شروع ہوئے ہیں۔ایک آدمی نے اپنی رغبت کی بدولت کوئی نیا فلسفہ گھڑا اور ایک نیا مذہب کھڑا ہو گیا۔عیسائیت کے مختلف فرقے اور اسلام سے قادیانیت اِسی مقام سے وجود میں آئے ہیں۔(اِس کی تفصیل آپ کو کتاب کے آخر میں ملے گی)

اُس فرد کو اب کھجور کے درخت کا ماڈل کہنا زیادتی ہوگی۔تقریباً ایک سال پہلے جو سلسلہ وضو کے لیے پانی زیادہ استعمال کرنے سے شروع ہوا وہ آج جہاں پہنچ گیا ہے وہاں ہمیں ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جو جسم کی ہر رغبت نور سے باہر رکھتا ہے۔اُس کی عزتِ نفس کی رغبت نور کے دائرے سے باہر ہے۔پھر اُس میں رتبہ کی رغبت بھی پیدا ہو چکی ہے۔اُس کے اندر علم کی رغبت بھی ایسی پیدا ہوئی کہ وہ نئے نئے نظریات پیش کر کے لذت محسوس کرتا ہے۔یہ صورتِ حال وہ ہے جہاں انسان تیزی سے Bush ماڈل میں تبدیل ہو کر Dead ماڈل کی طرف گامزن ہے۔ممکن ہے انسان اِس مقام سے آگے یوں بڑھے کہ اُسے اپنے کسی نظریئے کا جنوں ہو جائے اور وہ اِسی جنوں میں پاگل پن کی حد تک جا پہنچے۔یا پھر ممکن ہے کہ اُس کے رتبے کی رغبت ہی مرتے دم تک حاوی رہے۔اِس صورت میں اُس کے دو عمل ہو سکتے ہیں۔یا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابدی جنگ

تو وہ لوگوں سے کم ملے گا۔ زیادہ وقت ذکر اذکار میں گزارے گا۔ یا وہ مشاہدہ کرنے کی غرض سے لوگوں سے دور جا بیٹھے گا۔ یا وہ بہت شدت سے لوگوں میں اپنے نظریات پھیلائے گا۔ اُسے لوگوں کی خوشی یا غم کی کوئی فکر نہ ہوگی۔ وہ چاہے گا کہ ہر صورت اُس کے خیالات لوگوں پر مسلط ہو جائیں۔ رتبے کی رغبت سے پھر دشمن کی رغبت بھی جنم لے گی ہر وہ فرد یا گروہ جو اُس کی بات نہ مانے یا اُسے رتبہ نہ دے اُس کا دشمن ہو گا۔ پھر انسان یا تو اپنے دشمن سے دور بھاگے گا یا اُسے تکلیف دینے کی کوشش کرے گا۔ تاریخ میں بہت سے فرقوں نے فوج کی شکل اختیار کی اور دوسرے فرقوں کو اِسی جذبے کے تحت شکست دینے کی کوشش کی۔ بعض فرقوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ دوسرے فرقے پر حاوی نہیں ہو سکتے تو اُنہوں نے جنگلوں کی راہ لی۔ بعض گروہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے دشمنوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے جنگل میں جا کر خودکشی کر لی۔ اور یوں شیطان نے مرتے دم تک اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔

لیکن دل کی دھڑکن بند ہونا ہی موت کا آنا نہیں۔ اِس سے پہلے بھی موت واقع ہو سکتی ہے اور یہ موت وہ ہے جہاں انسان دائرۂ نور سے خارج ہو جاتا ہے اور نفسیاتی اور روحانی طور پر مر جاتا ہے صرف اُس کا جسم زندہ رہتا ہے۔ موت کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ انسان نماز ترک کر دیتا ہے۔ اِس کتاب کے لیے ہم نے مختلف فرقوں اور مذاہب کا جو بھی مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہمیں ہر بار ایک ہی واضح حقیقت نظر آئی۔ شیطان جو ایک عمل ختم کروانا چاہتا ہے وہ پانچ دفعہ نماز کی ادائیگی ہے۔ شیطان نہیں چاہتا کہ انسان نماز پڑھے۔ انسان کو نماز ادا کرتا دیکھ کر شیطان کو شکست کا احساس ہوتا ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ وہ بازی ہار گیا۔ انسان اور کوئی بھی نیک عمل کر لے وہ شیطان کے لیے تکلیف کا باعث نہیں ہوتا بشرطیکہ انسان وہ سارے نیک کام نماز کے بغیر کرے۔ شیطان کے اِن جذبات کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ ہے سجدہ۔ نماز کے دوران انسان کئی بار سجدہ کرتا ہے۔ سجدے کی حالت میں انسان مکمل طور پر دائرۂ نور میں ہوتا ہے لہٰذا نماز ہی وہ عمل ہے جس کی بدولت انسان نور میں چلا جاتا ہے۔ شیطان کو انسان کا نور میں داخل ہونا ہی گوارا نہیں۔ وہ ہر حال میں انسان کو سجدہ کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ اُس کا یہ ردِعمل قابلِ فہم ہے۔ آخر یہ سجدہ ہی تو تھا جس نے اُسے اُس کے رتبے سے گرایا تھا اور وہ چاہتا ہے کہ سجدہ نہ کر کے انسان بھی اپنے رتبے سے گر جائے۔ لہٰذا شیطان کی فتح اور شکست کا فیصلہ انسان کے سجدے پر ہوتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ جنگ ہے۔ انسان اور ابلیس کی جنگ سجدے سے شروع ہوئی اور قیامت تک اِس کا فیصلہ سجدے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر ہی ہوگا۔ نور کے دائرے سے باہر نکلنے کے بعد انسان سجدے سے دور ہو جاتا ہے اِس لیے شیطان کو کچھ سکون آ جاتا ہے۔

شیطان کے لیے ایک بڑی آسانی تب پیدا ہوتی ہے جب وہ کئی Multiple جڑیں دائرہ' نور سے باہر اندھیرے میں بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اُس کے جذبات نیچے گہرائی میں جانے کے بجائے اطراف میں نور سے باہر اندھیروں میں نکل جاتے ہیں۔ پھر اِن جذبات کو آگے بڑھنے کے لیے شیطان کی ضرورت نہیں رہتی۔ انسان کے خوف، غم، لذت، اُمید اور انعام خود بخود ہی آگے مزید اندھیرے میں بڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جڑیں سطح زمین میں اُوپر ہی رہ جاتی ہیں اُن میں کوئی طاقت نہیں ہوتی لیکن وہ زندہ رہتی ہیں۔ انسان جسمانی طور پر کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اب وہ جئے یا مرے اُس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یوں ہمارا کھجور کا ماڈل مردہ یعنی Dead ماڈل میں تبدیل ہوگیا۔ کیا اب یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہے؟ کیا انسان Dead ماڈل سے کھجور کے ماڈل میں تبدیل ہوسکتا ہے؟ ہم اب اِس سوال کا جواب ڈھونڈتے ہیں۔ اِس کا جواب دینے کے لیے ہم ایک عظیم شخصیت کا ذکر کریں گے جس نے یہ سفر کیا۔ وہ شخصیت ہیں شمالی امریکہ کے عظیم رہنما میلکم ایکس (Malcolm X)۔

میلکم ایکس (Malcolm X) سن 1925ء میں امریکہ کے شہر نبراسکا (Nebraska) میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب امریکہ کے سیاہ فام لوگوں کو نہ تو حقوق حاصل تھے نہ ہی معاشی آسودگی۔ اُن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اُن کے لیے تعلیم اور صحت کی سہولیات مفقود تھیں۔ انتہائی مفلسی، ناخواندگی اور بدحالی میں امریکہ کے سیاہ فام زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں اخلاقی قدریں ختم ہو جاتی ہیں۔ جنگل کا قانون لاگو ہوتا ہے اور زندگی مادی اور معاشرتی رغبتوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ میلکم ایکس نے بچپن سے ہی بُرے ماحول میں تعلیم پائی۔ جوانی تک پہنچتے پہنچتے وہ ڈاکہ زنی سے لے کر جوا خانہ چلانے تک ہر قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام میں ملوث ہو چکے تھے۔ اُن کی معاشرتی رغبتوں میں رتبہ، عورت، دشمن وغیرہ کی رغبتیں حاوی تھیں۔ مادی رغبتوں میں مال، نقدی، سونا اور اِس کے علاوہ مکان، سواری، لباس کی رغبتیں بھی موجود تھیں۔ کسی ایک ڈاکے کی سزا میں جیل بھیج دئے گئے اِس مرحلے تک میلکم ایکس Dead ٹائپ کے انسان تھے۔ جیل پہنچ کر اُن کی زندگی نے ایک پلٹا کھایا۔ یہ وہ دور تھا جب عالیجاہ محمد (Elijah Muhammad) سیاہ فام امریکیوں کو ایک جگہ جمع کر رہے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابدی جنگ

عالیجاہ محمد اسلام کی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ اُن کی تحریک سیاہ فام امریکیوں کی بیداری کی تحریک تو تھی لیکن یہ سفید فام امریکیوں سے نفرت پر مبنی تھی۔ جیل میں میلکم ایکس عالیجاہ محمد سے بیعت ہوئے اور اُن کی مال کی رغبتیں ختم ہونا شروع ہوگئیں۔ قید کے دوران ہی عورت کی رغبت بھی ختم ہوگئی۔ اُنہوں نے شراب نوشی سے توبہ کرلی۔ جیل میں انہوں نے عالیجاہ محمد (Elijah Muhammad) کے پیغام کا بغور مشاہدہ اور تجزیہ کیا۔ اور اِس نتیجہ پر پہنچے کہ علم بہت ضروری ہے اور علم ہی عزتِ نفس کا ذریعہ ہے۔ اِس نتیجے نے اُن کے دل میں علم کی رغبت پیدا کردی۔ یہ رغبت اتنی طاقتور ہوگئی کہ عالیجاہ محمد سے وابستگی کے بعد وہ Bush ٹائپ میں منتقل ہوگئے۔ جیل سے رہائی پر وہ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ گئے۔ اللہ کے گھر سے آنے کے بعد حقیقی معنوں میں Tree ٹائپ بن گئے۔ اُنہوں نے سفید فاموں سے دشمنی کی ترغیب ختم کردی۔ اِس کے بجائے انہوں نے دشمن اُن کو جانا جو اللہ کی مخلوق کو غلام بنا کر رکھتے ہیں اور غریبوں کا استحصال کرتے ہیں چاہے وہ گورے ہوں یا کالے۔ دوسری طرف اُنہوں نے اپنے قبیلے میں بلا امتیاز تمام مسلمانوں کو شامل کرلیا جبکہ پہلے اُن کے قبیلے میں صرف سیاہ فام تھے۔ اب دنیا بھر کے مسلمان اُن کا قبیلہ بن گئے۔

اِس رغبت کی بنیاد پر اُن کے اعمال میں انقلاب آگیا۔ میلکم ایکس ایک شعلہ بیان مقرر تھے۔ اُن کا زورِ خطابت ہر ہر قریہ سے لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا تھا۔ نہ صرف اُن کو بولنے پر ملکہ حاصل تھا بلکہ اُن کی تقاریر بڑی سادہ اور پُر مغز ہوتی تھیں۔ اُن کی آواز کے جادو نے امریکہ کے سیاہ فاموں کو امتِ مسلمہ کا حصہ بنانا شروع کردیا۔ یہ دیکھ کر ایوانِ اقتدار میں ہلچل پیدا ہوئی۔ میلکم ایکس کو ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اُنہیں ہر طرح کا لالچ بھی دیا گیا۔ جابر حکمرانوں نے نہ صرف میلکم ایکس کا پیچھا شروع کردیا بلکہ اُن کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہراساں کیا گیا۔ لیکن یہ تمام خوف میلکم ایکس کے اندر ایک بھی ایسی رغبت اور جذبہ پیدا نہ کرسکے جو اُن کو نور کے دائرے سے باہر نکال دیتے۔ وہ قرآن کی روشنی میں دماغ کو استعمال کرتے رہے۔ خشی الرحمٰن میں اپنی رغبتوں کو سموئے رہے اور سنتِ رسول ﷺ کے مطابق عمل کرتے رہے۔ بالآخر دورانِ تقریر اُن کو گولی مار کر شہید کردیا گیا۔ وہ توحید کے اتنے بڑے عاشق تھے کہ دورانِ تقریر بھی شہادت کی انگلی کو گھماتے رہتے تھے۔ عام طور پر بولنے والے اپنی انگلی کو اُوپر سے نیچے گھماتے ہیں۔ میلکم ایکس بولتے وقت اپنی شہادت کی انگلی کو دائرے میں گھماتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابدی جنگ

تھے جواُن کا اپنا منفرد انداز تھا جسے بعد میں آنے والے بہت سے مقررین نے اپنایا۔ گولی لگی تو اِس وقت وہ اپنی شہادت کی انگلی گُھما کر کوئی نکتہ سمجھا رہے تھے۔ بیہوش ہو کر نیچے گر گئے تو بھی اُن کی مٹھی نہ کھلی۔ بلکہ چشم دید گواہوں کے مطابق نزع کے عالم میں مٹھی اور سخت ہوگئی شہادت کی انگلی اکڑ گئی۔ انہوں نے کلمہ پڑھا اور روح پرواز کر گئی یوں جو سفر Dead ٹائپ سے شروع ہوا، نور کے دائرے میں ختم ہوا۔

یہ کھجور کے درخت کا ماڈل اور نور کا دائرہ بھی عجیب ہیں۔ اُن میں کیئے ہوئے اعمال فنا نہیں ہوتے۔ میلکم ایکس شہید ہو گئے لیکن آج بھی وہ پورے براعظم کے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے ایک مثال ہیں۔ بحرالکاہل سے بحراوقیانوس تک پھیلے ہوئے شمالی امریکہ میں ایک کھجور کے درخت کا ماڈل ہیں جس سے روشنی اب بھی پھوٹ رہی ہے اور لوگوں کو نور کے دائرہ میں آنے کا راستہ مل رہا ہے۔

کھجور کے درخت کا ماڈل بہت مفید ہے۔ ہم اِس ماڈل کے چار اہم فوائد کا ذکر کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ ماڈل کسی بھی فرد کی ذات کو بہتر بنانے کے لیے مفید ہے۔ ذاتی ترقی اور خوشی ہر فرد کا حق

۲۲. انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

ہے جسے حاصل کرنے کی اُسے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ترقی اور خوشی کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔معیار مختلف ہیں ورنہ ترقی اور خوشی کی جستجو تو جانوروں کو بھی ہوتی ہے۔ بہار کے موسم میں درخت کی ٹہنی پر بلبل خوشی سے چہچہاتی ہے۔بارہ سنگھوں کے ریوڑ میں ایک نوجوان بارہ سنگھا بوڑھے بارہ سنگھے سے سینگ لڑاتا ہے تاکہ وہ ترقی کر کے ریوڑ کا سردار بن سکے۔انسان کے لیے ترقی اور خوشی کے معیار مختلف ہیں ہر معاشرہ اِن دونوں کے لیے اپنے معیار مقرر کرتا ہے۔معیار طے ہونے سے فائدہ یا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اُس معاشرے کا ہر فرد تن دہی سے ترقی اور خوشی کے اِن معیاروں پر پورا اُترنے کی سعی میں لگ جاتا ہے۔اِس کوشش میں وہ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ورزش کرتا ہے۔سفر کرتا ہے اور دن رات مشقت کرتا نظر آتا ہے۔

اِس سعی کا ثمر لا حاصل نہیں اگر دو باتوں کا پتا ہو۔ترقی کیا ہے؟ خوشی کس کو کہتے ہیں؟ اور یہ دونوں کیسے ملتے ہیں؟ مثلاً لباس کو ہی لیجیے۔کیا ترقی اور خوشی تب ملتے ہیں جب انسان کپڑے مختصر پہنتا ہے یا پھر زیادہ پہنتا ہے؟ کیا رتبے میں ترقی حاصل کرنے کے لیے خاندان کی خوشی کو قربان کرنا ضروری ہے؟ ترقی اور خوشی کے یہ معیار کون طے کرتا ہے۔کیا ہر فرد کے لیے اِن معیاروں پر پورا اترنا ضروری ہے؟ ہیرے کی انگوٹھی حاصل کرنے کے لیے انسان کتنی سعی کرے؟ کیا اِس کو حاصل کر کے جو خوشی ملے گی وہ اِس کو حاصل کرنے کے لیے آنے والی دشواریوں کو بُھلانے میں مدد دے گی؟ یہ ترقی یہ خوشی، آج سے پانچ یا دس سال بعد بھی خوشی کا ذریعہ ہو گی؟ کیا جس ترقی کو حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ مل بھی جائے تو کہیں وہ دکھ اور خوف تو نہیں لائے گی؟ یہ سب سوال اُس فرد کے لیے اہم ہیں جو ترقی اور خوشی کے کسی معیار کو اپنا ہدف بنا کر کوشش کر رہا ہے۔جس فرد کے پاس ترقی اور خوشی کا کوئی معیار ہی نہیں وہ کیا کرے؟ کیا ہم اُسے ترقی اور خوشی کا کوئی معیار بتائیں؟ ہو سکتا ہے بلکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم ایک فرد کو ترقی کرتے نہیں دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ ترقی نہیں کر رہا لہٰذا یہ خوش بھی نہیں ہو سکتا۔

ایمازون (Amazon) کے جنگلوں میں رہنے والے ننگے لوگ ترقی کے کسی معیار پر پورا نہیں اُترتے تو کیا ہم یہ سمجھیں کہ وہ خوش نہیں ہیں؟ صحراؤں میں ہونے والی اکثر شادیوں میں عورتیں لپ اسٹک کے بغیر نظر آتی ہیں تو کیا وہ ترقی یافتہ نہیں؟ اگر وہ ترقی یافتہ نہیں تو کیا وہ خوش بھی نہیں؟ اسی طرح کا تضاد وہاں پایا جاتا ہے جہاں ترقی نظر آتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں خوشی بھی ہے۔دنیا کے امیر افراد اپنی دولت میں جس قدر ایک گھنٹے میں اضافہ کرتے ہیں اُتنی آمدن تو دنیا کے 90% افراد کی ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سال میں نہیں ہوتی۔تو کیا دولت میں اتنی تیزی سے اضافہ کرنے والے افراد خوش بھی ہیں۔ایک مسئلہ تو اُن کا ہے جو ترقی اور خوشی کا کوئی معیار نہیں رکھتے ،مگر دنیا میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو میڈیا اور تعلیم کی بدولت ترقی اور خوشی کے کچھ معیار (چاہے وہ غلط ہی ہوں) وضع کر لیتے ہیں۔لیکن اُن تک پہنچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

اِن سارے سوالوں کا جواب ہمیں کھجور کے ماڈل سے ملتا ہے۔اِس ماڈل سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ سچی خوشی ہی اصل ترقی کو جنم دیتی ہے۔اور ہر خوشی کے پیچھے ترقی کارفرما ہوتی ہے۔یہ ایک بڑا راز ہے جو چُھپا ہوا بھی نہیں لیکن نظر بھی نہیں آتا۔کھجور کا درخت اِس راز کو پانے کے لیے روشنی مہیا کرتا ہے۔ اِس ماڈل کو سامنے رکھ کر انسان خود کو بھی ڈھونڈ سکتا ہے اور اللہ کو بھی۔اِس ماڈل سے موازنہ کرنے کے بعد انسان کو اپنی شخصیت کا جو پہلو بھی کمزور نظر آئے وہ صرف اُسے ہی مضبوط بنا لے تو پوری شخصیت میں بہتری آجاتی ہے۔خود شناسی کے لیے کئے گئے سوالات مشاہدے سے شروع ہو کر عمل پر ختم ہوں گے۔یہاں ہم وہ سوال درج کر رہے ہیں۔ان کے علاوہ بھی بہت سے سوال انسان اِس ماڈل کو ذہن میں رکھ کر اپنی ذات سے کر سکتا ہے۔

☆مشاھدہ:

ا۔کیا میرا مشاہدہ پُرسکون ہوتا ہے؟

۲۔کیا میں مشاہدہ کرتے وقت ہر سمت اور ممکنہ ذرائع سے معلومات جمع کرتا ہوں / کرتی ہوں؟

۳۔کیا میں مشاہدہ کرتے وقت تمام تبدیلیوں کا انتظار کرتا ہوں / کرتی ہوں یا فوراً تجزیہ شروع کر دیتا ہوں؟

۴۔کیا میرا مشاہدہ جزو اور کُل دونوں کا احاطہ کرتا ہے؟

۵۔کیا میرے مشاہدے پر کوئی رغبت غالب تو نہیں آتی ؟

۶۔کیا میں اپنے مشاہدے میں اپنے حواسِ خمسہ زیادہ سے زیادہ مدت تک استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں / کرتی ہوں؟

۷۔کیا میں قرآن کی آیات کا مشاہدہ خصوصی طور پر کرتا ہوں / کرتی ہوں؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

۸۔کیا میں ظاہری طور پر نظر آنے والی معلومات کے کسی بھی سرچشمے تک پہنچ جاتا ہوں/ جاتی ہوں؟

☆تجزیہ:

۹۔کیا میں مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کر لیتا ہوں/ کر لیتی ہوں؟

۱۰۔کیا میں مختلف اوقات اور حالات میں کیے گئے مشاہدے کو یکجا کر لیتا ہوں/ کر لیتی ہوں؟

۱۱۔کیا میں تمام معلومات کو اپنے ذہن میں ایک تصویر میں تبدیل کر لیتا ہوں/ کر لیتی ہوں؟

۱۲۔کیا میں واقعات کو ایک لڑی میں پرو لیتا ہوں/ لیتی ہوں؟

۱۳۔کیا میں معلومات کا موازنہ پہلے سے موجود معلومات سے کر لیتا ہوں/ کر لیتی ہوں؟

☆نتیجہ:

۱۴۔کیا میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے جلدی تو نہیں کرتا/ کرتی؟

۱۵۔کیا میرا فیصلہ بہت دیر سے تو نہیں ہوتا؟

۱۶۔کہیں میرا ہر نتیجہ پچھلے نتیجے سے ملتا جلتا تو نہیں ہوتا؟ (یعنی میں نئے نتائج اخذ نہیں کرتا/ کرتی)

۱۷۔کیا میں ہر بار نئے فیصلے تو نہیں کرتا / کرتی یا یہ کہ میں ہر وقت نئے نئے فیصلے کرتا رہتا ہوں/ کرتی رہتی ہوں؟

۱۸۔کیا میں نئی معلومات کی روشنی میں فیصلہ تبدیل کرنے کی ہمت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۱۹۔کہیں میرا ایک اچھا فیصلہ کسی جذبے کی بدولت تبدیل تو نہیں ہو جاتا یعنی خوف، اُمید، غم، لذت یا انعام میرے فیصلے پر اثر انداز تو نہیں ہوتے؟

☆رغبتیں:

۲۰۔میرے اندر کون کون سی رغبتیں موجود ہیں؟

۲۱۔یہ رغبتیں میرے اندر کیسے پیدا ہوئیں؟

۲۲۔اِن میں سے کون کون سی رغبتیں میرے ماں باپ کی وجہ سے پیدا ہوئیں؟

۲۳۔کون سی رغبتیں میرے ماحول، میڈیا اور دوستوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں؟

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

۲۴۔کن رغبتوں کو میں نے خود پیدا کیا؟

۲۵۔میں خشی الرحمٰن کی رغبت پیدا کرنے سے کتنا/ کتنی دور ہوں؟

۲۶۔اگر میرے اندر خشی الرحمٰن کی رغبت موجود ہے تو اُس سے اور کون کون سی رغبتیں وجود میں آ رہی ہیں؟

۲۷۔کہیں میری خشی الرحمٰن کی رغبت سے کوئی ایسی رغبت تو نہیں پھوٹ رہی جو مجھے آگے چل کر دائرۂ نور سے خارج کر دے؟

۲۸۔اگر میرے اندر خشی الرحمٰن کی جڑ موجود نہیں تو پھر مجھے یہ جڑ پیدا کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ یعنی کیسے جڑ کو قابو میں کرنا ہوگا؟

۲۹۔میری کون سی جڑ دائرۂ نور سے خارج ہے؟

۳۰۔میرے زیادہ تر اعمال اور مشاہدے پر کون سی ترغیب حاوی رہتی ہے؟

☆جذبات:

۳۱۔میرے اندر پانچ جذبات میں سے سب سے زیادہ شدید جذبہ کون سا ہے؟

۳۲۔اِس جذبے کی شدت کب ہوئی۔کس واقعہ، حادثے یا ماحول کی وجہ سے میرے اندر یہ جذبہ شدید ہوا؟

۳۳۔کیا میرے کسی جذبے کی وجہ سے جسمانی امراض تو جنم نہیں لے رہے؟

۳۴۔میرے اندر کون سا جذبہ کم ہے؟

۳۵۔کیا میرا کوئی ایک جذبہ جنون پیدا تو نہیں کر رہا؟

۳۶۔میرا کمزور جذبہ کب کمزور ہوا؟

۳۷۔میرے کمزور جذبہ کو کمزور کرنے میں کون کون سے عوامل کارفرما تھے؟

۳۸۔کیا میرے جذبات خیال کو جنم دیتے ہیں؟

☆اعمال:

۳۹۔کیا میں اپنے دماغ میں خیال پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

۴۰۔ کیا میرا خیال واضح ہوتا ہے؟

۴۱۔ کیا میں اپنی رغبتوں کو ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۴۲۔ کیا میں اپنے جذبات میں توازن پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۴۳۔ کیا میں اپنے مشاہدے، تجزیے اور نتیجے اخذ کرنے کی صلاحیتوں کو مزید بہتر بنا سکتا ہوں/ سکتی ہوں؟

۴۴۔ کیا میں سنتِ رسول ﷺ پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۴۵۔ کیا میں نے اچھے اعمال کرنے کا منصوبہ بنایا ہے؟

۴۶۔ میں کس قسم کے اعمال سے انسانیت کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں/ سکتی ہوں؟

۴۷۔ کیا میں دوسروں کو اپنی بات واضح طور پر سمجھانے کی صلاحیت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۴۸۔ کیا میں موسم، درخت اور جانوروں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۴۹۔ کیا میرے پاس زبان کی گیارہ اصناف کو سُننے، پڑھنے، بولنے اور لکھنے کی صلاحیت موجود ہے؟

۵۰۔ کیا میں بنیادی حساب کتاب کی صلاحیت رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۵۱۔ کیا میں تیز اور سُست ورزش کے ذریعے اپنے جسم کا توازن برقرار رکھتا ہوں/ رکھتی ہوں؟

۵۲۔ کیا میں دوسروں کی مجبوری اور تکلیف کو سمجھ لیتا ہوں/ لیتی ہوں؟

یہ سوالنامہ ہر فرد کی ترقی اور خوشی میں معاون ہے۔ کھجور کے ماڈل کو ذہن میں رکھ کر ایک فرد ایسے مزید سوال تیار کرسکتا ہے جو اُس کے ماحول سے مطابقت رکھتے ہوں۔

کھجور کے ماڈل کا دوسرا استعمال ایک اچھا نظامِ تعلیم وضع کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ایسے سکولوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو اپنے ہاں اسلامی تعلیم دینے کا دعویٰ کرتے ہیں یا اُس کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانی شخصیت کی بناوٹ اور اُس کی تعمیر میں درپیش مشکلات سے عدم واقفیت بظاہر تعلیم کو ایک آسان کام بنا دیتی ہے۔ ہر ایسا فرد جو کسی کاروبار یا تنظیمی امور میں کامیاب ہو گیا ہو۔ بچوں کی تعلیم سہل کام سمجھتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی زندگی میں اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اِس لیے وہ نظامِ تعلیم میں تبدیلی بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اِس احساس کے ساتھ کہ سکول کا موجودہ نظام ایک اچھا مسلمان بنانے سے قاصر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

ہے وہ سکول کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور اِس نیک کام کے لیے تن، من، دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نیت ضرور اچھی ہو گی لیکن جب ہم اِس صورتِ حال کو بھی کھجور کے ماڈل کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں بہت سے ایسے نیک نیت مسلمان نظر آئیں گے جنہوں نے مشاہدہ کیا، تجزیہ کیا، نتیجہ اخذ کیا اور اُس کی بنیاد پر عزتِ نفس کی رغبت پیدا کی۔ ایسی عزتِ نفس جو تعلیم دینے سے سکون محسوس کرتی ہو یا پھر اُنہوں نے رتبہ کی رغبت پیدا کی۔ رتبے کی ایسی رغبت جو بچوں کا استاد بن کر یا کسی سکول کا نگران بن کر پوری ہوتی ہو۔ تعلیمی اداروں کے ایسے سرپرست اور معلم بھی موجود ہیں جنہیں غیر مسلم نظامِ تعلیم کی دشمنی کی رغبت تعلیم کے شعبہ میں لے آئی۔ اور پھر ایسے لوگوں نے بھی اسلامی سکول قائم کیے جنہوں نے قوم کے لیے اپنے خاندان کی رغبت پیدا کی اور وہ اِس غم میں مبتلا ہوئے کہ اُن کے خاندان کے بچوں کو اچھی تعلیم میسر نہیں ہے۔

سکول قائم کرنے کی رغبت کچھ بھی ہو وہ درست ہے اور اِس سے نئی نسل کی اصلاح ہی مطلوب ہے۔ لیکن سکول ایک پیچیدہ نظام ہے۔ چونکہ انسانی شخصیت کائنات کا پیچیدہ ترین نظام ہے اِس لیے اِس کی تعمیر اور ترقی بھی نہایت پیچیدہ ہے۔ ایک تعلیمی ادارے میں بچے کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اُس کی جسمانی نشوونما بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ کائنات کے تین پیچیدہ مگر طاقتور ترین نظام ایک ہی احاطے میں فروغ پا رہے ہوتے ہیں۔ انسانی شخصیت کی نشوونما ایک فن بھی ہے اور سائینس بھی۔ یہ آرٹ بھی ہے اور حساب بھی۔ اِس عمل میں دوست بھی بنانے پڑتے ہیں اور نگہبان بھی۔ کبھی بات سُننی پڑتی ہے، کبھی بات سُنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سکول کا اسلامی نام اُسے اسلامی سکول نہیں بناتا۔ نہ ہی دیواروں پر قرانی آیتیں چسپاں کرنے سے یا با حجاب معلمات اور باریش معلمین سے بات بنتی ہے۔ نہ ہی سکول کے اغراض و مقاصد کو اسلامی نظریات پر مرتب کرنے سے تعلیم اسلامی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ صرف قرآن حفظ کروانے اور فقہ پڑھانے سے بھی اسلامی نظامِ تعلیم نافذ نہیں ہوتا۔

دراصل سکول کھولنے سے پہلے اسلام کو مطلوب مردِ مومن کا مطالعہ ضروری ہے جو اکثر سربراہانِ ادارہ کے ہاں نظر نہیں آتا۔ دوسرا مسئلہ ہے پہلے اپنی ذات کو مردِ مومن بنانا۔ پھر شروع ہوتا ہے بچوں کو مومن بنانے کا سلسلہ جس کے لیے بچوں کی نفسیات سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن بیشتر تعلیمی اداروں کے سربراہ مردِ مومن کے خدوخال کا مطالعہ نہیں کرتے اور پھر اپنی ذات کو اِن خدوخال کے مطابق

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

مکمل طور پر ڈھالنے اور بچوں کو مردِ مومن بنانے کے لیے درست نہج کی تربیت سے نابلد نظر آتے ہیں۔ کھجور کے ماڈل کا مطالعہ اُن ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اِس ماڈل کا مطالعہ کر کے ایک سکول کی روح اور جسم دونوں کو اسلامی رنگ میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو سکول کے اغراض و مقاصد آتے ہیں۔ ہم یہاں ایک اسلامی سکول کے لیے کھجور کے ماڈل کی روشنی میں ترتیب دیے گئے کچھ اغراض و مقاصد پیش کرتے ہیں۔ ایک سکول کی انتظامیہ اِن میں سے کچھ یا سارے مقاصد اپنے سکول کے لیے منتخب کر سکتی ہے۔

۱۔ ہماری درسگاہ میں مومن تخلیق ہوتے ہیں۔ ایسے مومن جو کھجور کے درخت کی مانند ہیں جس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے۔

۲۔ ہم اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے بچوں کو دائرہ نور میں لاتے ہیں۔ اِس دائرے میں آتے ہی ہمارے طالب علموں کا مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ قرآن سے متصادم نہیں رہتا۔

۳۔ وہ خشی الرحمٰن کی رغبت پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اُن کا ہر عمل رسول اللہ ﷺ کی سُنت کے مطابق ہو جاتا ہے۔

۴۔ ہم اپنے تعلیمی ادارے میں آنے والے ہر طالب علم کو اپنی رغبتیں خشی الرحمٰن کی رغبت کے زیر اثر لانے میں معاون اور مددگار رہوں گے۔

۵۔ ہم اپنے طالب علموں کی ذہنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے نشوونما پانے کا موقع دیتے ہیں تا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے عین مطابق عمل کر سکیں۔

۶۔ اِس تعلیمی ادارے کا ہر طالب علم کسی رغبت کے زیرِ اثر آئے بغیر نہایت عمدہ طریقے سے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کرے گا۔

۷۔ سکول کا ہر طالب علم اپنا محاسبہ کر کے اپنی ذات کو دائرۂ نور سے باہر نکلنے والی رغبتوں سے آزاد رکھ سکے گا۔

۸۔ ہمارا طالب علم معاشرہ میں ایک مثال ہو گا جو دوسروں کو مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنا سکھائے گا۔

۹۔ ہر طالب علم لوگوں کو انسانی اور مادی رغبتوں سے آزاد کرے گا اور اُن میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

خشی الرحمٰن کی رغبت پیدا کرے گا۔

۱۰۔ ہمارا طالب علم اپنی قوم کی صلاحیتوں کو بیدار کرے گا تا کہ وہ ایک پاکیزہ اور کار آمد زندگی گزار سکے۔

اچھے تعلیمی ادارے نہ صرف اغراض ومقاصد کا تعین کرنے میں اپنی بھرپور توانائیوں کا استعمال کرتے ہیں بلکہ وہاں مہینے میں ایک دفعہ چپراسی سے لے کر منتظمِ اعلیٰ تک سب کام کرنے والے اغراض ومقاصد کا اعادہ بھی کرتے ہیں۔ اغراض ومقاصد کا تعین اور اعادہ ایک لمبے تدریسی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اب ایک کمرۂ جماعت میں نصاب کے ذریعہ استاد کو اغراض ومقاصد حاصل کرنا ہوتے ہیں۔ اِن کو حاصل کرنے کے لیے ایک تربیت یافتہ ماہر تعلیم کھجور کے ماڈل کی ضرورت ہے جو بچوں کو کھجور کا ماڈل بنا سکے۔ اسی طرح ایک ایسے نصاب کی ضرورت ہے جس کو اِس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ استاد اور نصاب مل کر کھجور کا وہ بیج بنتے ہیں جس کی بدولت سکول کی زمین سے کھجور کے ننھے مُنے ماڈل جنم لیتے ہیں۔ کھجور کا ماڈل سکول کے نظام تدریس کو یکسر بدل دیتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ جس سکول میں نظام تدریس کھجور کے ماڈل پر تراشا نہ گیا ہو وہاں بچوں کو اِس ماڈل کے مطابق ڈھالنا ناممکن ہے۔ کھجور کے ماڈل سکول میں معلومات کو یاد کروانے پر زور نہیں دیا جا سکتا کیونکہ معلومات کو یاد کرنا، معلومات پر غور یعنی تجزیہ کر کے نتیجہ اخذ کرنے کے عمل کی نفی کر دیتا ہے۔ معلومات رٹوانا بچے کو کھجور کے ماڈل کے برعکس سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ دراصل رٹنے کا نظام سُنتِ نبوی کے خلاف ہے اور اسلام کے نام پر جو لوگ اِس طریقۂ کار میں ملوث ہیں وہ اپنی نادانی سے اللہ کے نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ تعلیم کے منافی عمل کر رہے ہیں۔

مثلاً آپ قرآن حکیم کی تدریس کو ہی لیجیے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس نے دس آیتیں پڑھ لیں وہ اُس دن کے لیے جاہل نہ رہا۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک اسلامی سکول میں بلا ناغہ بہت سا قرآن رٹنے کے علاوہ دس آیات پر غور وفکر ہوگا۔ جس کی بدولت بچے اپنے نتائج اخذ کرنے کے قابل ہو جائیں۔

پھر اِنہی دس آیات سے اخذ کردہ نتائج اُن کی رغبتوں میں تبدیلی کا باعث بنیں گے۔ یہ نتائج اُن کی دائرۂ نور سے خارج ہونے والی رغبتوں کو ختم کر کے خشی الرحمٰن کی رغبت پیدا کرنے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

کلیدی کردار ادا کریں گے۔ اور بچے نیک اعمال کی طرف راغب ہو جائیں گے۔ اِس مرحلے پر سکول کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ بچوں میں سب سے پہلے خیالات کو جنم دینے کی صلاحیت پیدا کر دے۔ ایسا کرنے سے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ ملے گا۔ پھر مرحلہ آئے گا بچوں میں زبان کی صلاحیت پیدا کرنے کا۔ سکول کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو پانچویں جماعت کے اختتام تک گیارہ اصناف کے ساتھ ساتھ سُننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا سکھا دے۔ اور حساب اور سائنسی تجربوں کا شوق پیدا کر دے۔ نہ صرف اُنہیں فطرت کے اسرار و رموز سمجھائے بلکہ جسمانی نشوونما کی رفتار بھی تیز کر دے۔ اگر اللہ کے نبی ﷺ نے مضبوط اور تندرست مومن کو کمزور پر ترجیح دی ہے تو پھر جسمانی صحت سکول کی اولین ذمہ داری ہے۔ ایسا نہ کرنا نبی ﷺ کے احکامات سے انحراف ہے۔ بد قسمتی سے جسمانی صحت کی تعلیم جو رسول اللہ ﷺ کے نزدیک بہت اہم تھی آج کے اکثر اسلامی سکولوں کے منتظمین کی نظر میں غیر اہم ہے۔ ورنہ وہ خود اُس کی نگرانی کرتے اور ایسا کرتے ہوئے وہ نبی ﷺ کی سُنت کا اتباع کر رہے ہوتے۔

آخر میں آتے ہیں طریقۂ امتحان کی طرف۔ طریقۂ امتحان بچے کے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی اہلیت کا جائزہ ہے۔ جہاں تک رغبتوں کا تعلق ہے تو اُن کا اندازہ لگانا مشکل کام ہے۔ لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بچوں کے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت طاقتور ہو اور بچے اپنی خوشی سے نیک اعمال کی طرف مائل ہوں تو یقیناً وہ اچھی رغبتوں کو جنم دے رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایک بچے کا دوسرے بچے سے موازنہ کرنا اور پھر اِن کی درجہ بندی کرنا ایک انتہائی غیر اسلامی طریقۂ کار ہے۔ وہ تمام سکول جو اسلامی طرزِ تعلیم کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن سال کے آخر میں پہلی، دوسری، تیسری پوزیشن دیتے نظر آتے ہیں شدید تضاد کا شکار ہیں۔

کھجور کے ماڈل کے مطابق رتبہ اللہ کے نزدیک ہوتا ہے اللہ کا قرب انسان کے رتبے کو بلند کرتا ہے۔ انسان کے انسان پر فوقیت لے جانے سے جو رتبہ پیدا ہوتا ہے وہ بچے کو نور کے دائرے سے خارج کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ کتنی بد قسمتی ہے کہ اللہ سے قریب لانے کی بجائے ایک اسلامی سکول بچوں کو دوسرے بچوں سے دور کر دیتا ہے۔ سکول کا درس جس بچے نے اچھا یاد کیا اُس سے دوسروں کو حسد ہو گیا۔ اور خود اُس میں رٹنے کی رغبت پیدا ہو گئی۔ سکول نے نبی ﷺ کی اُمت کو بانٹ دیا اُن میں درجہ بندی پیدا کر دی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

کھجور ماڈل کا تیسرا فائدہ ماہرینِ نفسیات اور مشیروں کو ہوتا ہے جو لوگوں کا نفسیاتی علاج کرتے ہیں۔ جس تیزی سے انسان کھجور کے ماڈل سے مخالف سمت میں سفر کررہا ہے اُسی تیزی سے نفسیاتی امراض بڑھ رہے ہیں اور اُسی تیزی سے جسمانی امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ شوگر، بلڈ پریشر، کینسر کا بڑھتا ہوا رُجحان نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے ہے۔ آج کے بہت سے جسمانی امراض کا علاج نفسیاتی امراض کا علاج کیے بغیر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اکثر جسمانی امراض جن میں سب سے عام خارش ہے وقتی طور پر تو ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن تھوڑے عرصے بعد پھر عود کر آتے ہیں۔ اِن امراض کو قابو میں رکھنے کے لیے ساری زندگی دوائیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اِن دوائیوں کی مدد سے مرض قابو میں رہتا ہے ختم نہیں ہوتا۔ نہ ختم ہونے کی وجہ مرض کا مرکز انسانی نفسیات ہے جبکہ طبیب صرف جسمانی علاج کرتا رہتا ہے۔

نفسیاتی علاج کے جتنے طریقے رائج ہیں وہ تمام غیر مسلموں نے وضع کیے ہیں اس لیے وہ انسانی شخصیت کا مکمل احاطہ نہیں کرتے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی شخصیت کی مکمل تصویر بننے سے رہ گئی ہے۔ یہ ادھورا پن اُس وقت اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب مرض کی تشخیص ہونے کے بعد بھی مشورہ دینے کا موثر طریقہ وضع نہیں ہو پاتا۔

یہاں پر کھجور کے درخت کا ماڈل نہ صرف نفسیاتی پہلو سے انسانی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتا ہے بلکہ یہ مریض کو مشورہ دینے میں بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ڈپریشن کی ہی مثال لے لیجیے۔ ڈپریشن انسانی نفس میں غم کی مقدار بڑھ جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ خوف، اُمید، لذت، انعام کم ہوتے جاتے ہیں جبکہ غم بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو غم میں لذت محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ غم اولاد کی موت یا ناکامی سے شروع ہو۔ یا یہ غم والدین کی موت سے لاحق ہوا ہو۔ اگر تین مہینے تک یہ غم کم ہو کر دوسرے جذبات کے برابر نہ آجائے تو پھر اُس کا کم ہونا مشکل ہو جاتا ہے اور اگر غم کو بڑھتے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر جائے تو پھر انسان طبّی اور نفسیاتی مدد کے بغیر ٹھیک ہی نہیں ہوتا۔ غم کی اِس کیفیت میں انسان رغبتیں تو پیدا کرتا ہے لیکن اُن سے متعلق جذبہ ایک ہی جنم لیتا ہے اور وہ ہے غم کا۔ اُسے رتبہ ملے گا لیکن وہ اپنے رتبے میں بھی غم کا پہلو تلاش کر لے گا۔ اُسے مکان مل جائے گا اور اُس مکان کی وجہ سے مکان کی رغبت پیدا ہوگی لیکن جذبہ صرف غم کا پیدا ہوگا۔ اُس مقام پر انسان کو اگر اللہ سے بھی رغبت ہے تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

وہ بھی غم کا رشتہ ہے جہاں وہ خود کو گناہ گار تصور کرتا رہتا ہے۔

یہاں پر مشورہ دینے والے کو غم کا جذبہ کم کر کے اُمید، انعام اور لذت کو پیدا کرنا ہے۔ وہ سب سے پہلے تو یہ دیکھتا ہے کہ مریض کے دل میں کون کون سی رغبتیں موجود ہیں جن سے غم وابستہ ہے۔ پھر وہ دیکھتا ہے غم سے وابستہ سب سے طاقتور رغبتیں کون سی ہیں۔ اُس کے بعد وہ ایسی رغبت کو تلاش کرتا ہے جس کے حوالے سے لذت اور اُمید پیدا کرنا آسان ہو۔ وہ مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کو استعمال کر کے مریض کو اپنے دل کا بگڑا ہوا توازن دیکھنے کا موقع دیتا ہے۔ وہ مریض کو ایسے اعمال کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن سے مریض کے دل میں لذت بیدار ہو۔ جوں جوں اُمید، انعام اور لذت بڑھتے ہیں غم کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں پر بھی مشورہ دینے والے کا یہی ہدف ہوتا ہے کہ مریض خشی الرحمٰن کی رغبت کو بیدار کرلے کیونکہ اُس ایک رغبت میں تمام پانچ جذبات انتہائی توازن کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور یہ سب سے گہری اور طاقتور رغبت ہے۔

کھجور کے درخت کا چوتھا فائدہ تنظیموں کو ہے جو اپنا اندرونی ماحول بہتر بنانے اور بطور تنظیم ترقی کرنے کی خواہاں ہیں۔ اِس کے لیے تنظیم کے اکابرین اپنے ساتھیوں کو اُن حالات کا مشاہدہ کروائیں گے جن میں تنظیم کام کررہی ہے۔ پھر وہ تجزیہ کر کے نتیجہ اخذ کریں گے کہ تنظیم کی اہمیت کیا ہے؟ تنظیم کیا اچھے کام کررہی ہے؟ تنظیم کے ساتھ وابستہ رہنا کیوں ضروری ہے؟ اُنہیں یقین ہو جائے گا کہ حالات اور واقعات کی روشنی میں وہ ایک بہترین تنظیم سے وابستہ ہیں۔ اور اُن کی تنظیم معاشرے کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ یہ نتائج تنظیم کو ایک قبیلہ کی رغبت میں تبدیل کردیں گے۔ اِس تنظیم سے وابستہ لوگ تنظیم کو اپنا خاندان تصور کریں گے۔ تنظیم سے وابستہ لوگ ایک دوسرے کے لیے دوست کی طرح ہو جائیں گے۔ تنظیم کے مخالفین کے لیے اُن میں دشمن کی رغبت پیدا ہو جائے گی۔ اب اگر یہ تنظیم کاروباری نوعیت کی ہے تو اُس سے وابستہ لوگ اپنی تنظیم کے لیے محنت کریں گے کیونکہ اُنہوں نے اپنی عزتِ نفس کو اپنی تنظیم کی عزت سے جوڑ دیا ہوگا۔ وہ اپنی کمپنی کے رتبے اور مالی حالت میں اضافے کو اپنے رتبے اور مالی رغبت کے طور پر دیکھیں گے۔ وہ اپنی کمپنی کی حریف کمپنی کو دشمن کی رغبت سے منسوب کردیں گے۔ وہ چاہیں گے کہ اُن کی اپنی کمپنی حریف کمپنی سے زیادہ کاروبار کرے۔ اِسی طرح اگر یہ کوئی مذہبی یا فلاحی تنظیم ہے تو اِس سے وابستہ لوگ چاہیں گے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُن کی تنظیم سے وابستہ ہو جائیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی ماڈل کے فوائد کا تجزیہ

معاشرے میں اُن کی تنظیم کو بلند مقام ملے۔ اُن کی تنظیم کی عزتِ نفس میں اضافہ ہو۔

دونوں صورتوں میں کارکنان کی دماغی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو تنظیم کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ وہ یہ تعین کریں کہ اُن کے کارکنان کون سی دماغی صلاحیتیں زیادہ رکھتے ہیں۔ اِس کے بعد وہ اپنے ہر کارکن کی تربیت اُس کی دماغی صلاحیت کے مطابق کریں۔ اگر اُن کی اپنی تنظیم میں اُن کے کارکنان کی دماغی صلاحیتوں کے مطابق لوگ موجود نہ ہوں تو وہ اپنی تنظیم سے باہر ایسے لوگ تلاش کریں جو اُن کے کارکنان کی تربیت کر سکیں۔ اِس موقع پر بہت سے سربراہان باہر سے ایسے افراد کو اپنی تنظیم سے وابستہ کر لیتے ہیں جن کی رغبتیں تو اُن کی تنظیم سے مطابقت نہیں رکھتیں لیکن اُن کے پاس وہ دماغی صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کی تنظیم کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال تنظیم کو وقتی طور پر تو فائدہ دیتی ہے لیکن آگے چل کر نفاق کا باعث بنتی ہے۔ بہتر یہی ہوتا ہے کہ اپنے وسائل سے تنظیم میں موجود لوگوں کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ پھر ہر کارکن کی صلاحیت کے عین مطابق کام تلاش کیا جائے تاکہ تنظیم ترقی کر سکے۔

کھجور کے ماڈل کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے یا پہلو پر اِس حوالے سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ اگر صرف قرآن اور احادیث کا مطالعہ ہی اِس غرض سے کیا جائے تو بہت سے نئے طریقہ ہائے کار اور معلومات منظرِ عام پر لائی جا سکتی ہیں۔ اِس کتاب میں ہم نے اِس علم کا ایک عمومی خاکہ پیش کیا ہے۔ قاری جوں جوں گہرائی میں جا کر سوچے گا اُس کے سامنے نئی نئی باتیں آشکار ہوں گی۔ اُسے دنیا میں ہونے والے واقعات کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ زندگی کو ایک ترتیب اور نہج پر لانے میں مدد ملے گی۔ اِس ماڈل سے مستقبل میں کئی تحقیقات جنم لیں گی اور یقیناً بہت سی کتابیں اِس ماڈل کے بارے میں لکھی جائیں گی۔ اِن ساری تحقیقات سے انسانی شخصیت کو بہتر انداز سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ جات

ضمیمہ ۱

باب ۳: سیکھنا

معدنیات کا توازن

معدنیات کی صحیح مقدار انسانی جسم میں توازن قائم رکھنے کے کام آتی ہیں۔ جس طرح لوہے کی سلاخیں ریت اور سیمنٹ کو ایک مینار میں پکڑ کر رکھتی ہیں ویسے ہی لوہے کی ایک مناسب مقدار انسانی جسم میں مضبوطی اور ٹھہراؤ کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن ان معدنیات کی کمی یا زیادتی جسم میں عدم توازن کا سبب بنتی ہے جسم میں موجود ہر معدنی جسم کے کسی نہ کسی مخصوص حصے کو نہ صرف پکڑ کر رکھتا ہے بلکہ اُسے قوت بھی دیتا ہے مثلاً چونا یعنی کیلشیم انسانی جسم میں ہڈی بنتا ہے جو انسان کے پٹھوں کو پکڑ کر رکھتی ہے۔ جبکہ لوہا انسانی خون کے خلیات کو مضبوطی دیتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنی ساخت برقرار رکھتے ہیں۔ کسی بھی وقت اگر چونے اور لوہے کی کمی یا زیادتی ہو جائے تو انسانی جسم توازن برقرار نہیں رکھ سکتا اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔

جسم میں موجود معدنیات کی کمی یا زیادتی دو طریقوں سے ہوتی ہے یا تو انسان کی خوراک، ورزش یا روزمرہ کی تربیت میں کوئی خلل واقع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اِن معدنیات کی صحیح مقدار جسم میں نہیں رہتی مثلاً اگر سبزیاں نہ کھائی جائیں تو جسم میں لوہے کی کمی واقع ہو جائے گی۔ خوراک، ورزش اور دن کی ترتیب میں خرابی پہلے جسمانی امراض کو دعوت دیتی ہے پھر ذہنی امراض کا موجب بنتی ہے۔ بعض اوقات امراض کے جنم لینے کی ترتیب الٹ جاتی ہے۔ انسان کسی ذہنی پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اُسے کوئی جذباتی دھچکا اتنا شدید لگتا ہے کہ وہ اپنا جذباتی اور ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ پاتا۔ ایسا ہونے کی صورت میں انسان جسمانی بیماریوں کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔

جسم میں موجود اہم معدنیات کے عدم توازن سے جو نفسیاتی امراض پیدا ہوتے ہیں اُن میں کچھ مشترک ہیں۔ یعنی ہر ایک معدنی کی کمی بیشی سے پیدا ہونے والی خرابی جسم میں موجود دوسری معدنیات سے منسلک ہے معدنیات کے عدم توازن سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں وہ قرآن حکیم میں بھی انسانی کمزوریوں کے طور پر گنوائے گئے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معدنیات کے عدم توازن کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریاں:

۱۔نروس، بزدل اور بے چین	۲۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرے اور ناراض ہو
۳۔مال پرست	۴۔خودغرض (جوشکر کرنا بھول جائے)
۵۔خیالی پلاؤ پکانا، بڑے خواب دیکھنا	۶۔مستقل مزاجی کی کمی، غیر ذمہ داری
۷۔جذباتی پن	۸۔سطحی سا علم
۹۔منفی سوچ	۱۰۔کاہلی

قرآن میں موجود انسانی کمزوریاں:

۱۔جلد باز	۲۔جھگڑالو
۳۔تنگ دل	۴۔ناشکرا
۵۔حیثیت سے بڑھ کر ذمہ داری	۶۔بُھلکڑ، کمزور یادداشت
۷۔سوچ پر جذبات کا حاوی ہونا	۸۔کم علم جو خود کو عالم سمجھے
۹۔وسوسہ	۱۰۔ضعف

اِن کمزوریوں کو ذہن میں رکھ کر انسان خود اپنا توازن برقرار رکھ سکتا ہے۔ذہنی پریشانی بڑھنے کے نتیجے میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ پریشانیاں ان دس کمزوریوں میں سے کس کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔مثلاً عین ممکن ہے کہ ڈپریشن حیثیت سے بڑھ کر نظر آنے یا ذمہ داری لینے کی وجہ سے پیدا ہوا اور اُس صورت میں انسانی جسم میں فاسفورس کا عدم توازن ہوگا۔یا یہ کہ ایک فرد دوسروں کو گھٹیا سمجھے اور خود کو عالم فاضل تصور کرے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اُس کے جسم میں سلفر کا توازن بگڑ گیا ہے۔یا یہ کہ کسی فرد میں تنگ نظری یا تنگ دلی آگئی ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرتا اور اُن سے گھبراتا رہتا ہے۔اس صورت میں اِس کے اندر کیلشیم کا عدم توازن پیدا ہو چکا ہوگا۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ۲

باب ۳: سیکھنا

زبان: بارہ صلاحیتوں کا حصول

زبان انسانی سوچ کو منتقل کرنے اور انسان کو انسان سے جوڑنے کا اہم ذریعہ ہے۔ چونکہ خیالات کے تبادلے سے نئے خیالات جنم لیتے ہیں، اِس لیے زبان علم کو وسعت بھی دیتی ہے۔ زبان کے چار بنیادی اجزا ہیں۔ ان میں سے اول تو سُننا ہے جو کہ انسان ماں کے پیٹ سے ہی شروع کر دیتا ہے۔ بچہ جو زبان کافی دن تک سُنتا رہتا ہے تھوڑی سی زبان کی روانی آنے پر بولنا شروع کر دیتا ہے۔ اگلا مرحلہ پڑھنے کا آتا ہے۔ بچہ کہانیوں اور قصوں سے پڑھنے کی ابتدا کرتا ہے اور آگے چل کر کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ زبان کا تیسرا اور سب سے اہم مرحلہ لکھنے کا ہوتا ہے۔ اِس مرحلے پر انسان اپنی سوچ کو کاغذ پر منتقل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اپنے خیالات کا لکھ کر اظہار کرنے کی خاطر انسان کو زبان کی پہلی تین صلاحیتوں کو بھی استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان کی اِن چار صلاحیتوں میں سے دو کا تعلق مشاہدے سے اور دو کا عمل سے ہوتا ہے۔ چونکہ سُننا اور پڑھنا معلومات جمع کرنے سے متعلق ہیں اِس لیے یہ مشاہدے کے زمرے میں آتے ہیں۔ ہم جو بھی سُنتے یا پڑھتے ہیں وہ ہمارا مشاہدہ ہوتا ہے جس کا ہم تجزیہ کر کے نتائج میں تبدیل کرتے ہیں سُننے اور پڑھنے سے جو نتائج ہم اخذ کرتے ہیں۔ اُن میں سے ٹھوس معلومات تو دماغ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جبکہ دل سے تعلق رکھنے والے نتائج رغبتوں سے متعلق جذبات کا محرک بنتے ہیں اور پھر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں۔ اب اگر سُننے اور پڑھنے کے بعد انسان کا عمل زبان سے متعلق ہو تو پھر یا تو یہ عمل بولنے کی صورت میں نمودار ہو گا یا پھر لکھنے کی صورت میں۔ علامہ اقبال کا شعر ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لاالٰہ الااللہ

ہماری رسائی اِس شعر تک دو طریقوں سے ہی ہو سکتی ہے۔ یا تو ہم یہ شعر سُنیں گے یا پڑھیں گے۔ اِس کے بعد ہم تجزیہ کرنا شروع کر دیں گے۔ اِس کے لیے ہم اِس شعر کے اہم الفاظ اور تصورات یا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اصطلاحات پر غور کریں گے۔ مثلاً دور سے کیا مُراد ہے اور اِس دور کے خاص خاص خدوخال کیا ہیں۔ پھر یہ کہ اُس دور کے خدوخال ماضی کے ادوار سے کیسے مختلف ہیں۔ دوسرا لفظ ہے ابراہیم۔ ابراہیم ایک اصطلاح ہے جس سے مراد ہے ایک ایسا فرد جو بے خوف ہو اور جرأت سے سچ بات کہنے کی ہمت رکھتا ہو۔ اُس میں مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی عظیم قوتیں موجود ہوں۔ اور پھر یہ کہ آج کے دور میں ایسے فرد کی ضرورت کیوں ہے؟ اِس لیے کہ آج کا دور صنم کدہ ہے۔ اب یہاں صنم کدہ سے کیا مراد ہے؟ اِس سارے تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اِس دور میں انسان اپنی خواہشات کا پجاری ہے اور ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو خواہشات کے بُتوں کو توڑ سکیں۔ اِس نتیجہ کی بدولت دل میں رغبتوں کے لیے جذبات نے جنم لیا۔ انسان کو ابراہیمی کام کرنے میں عزتِ نفس مِلی۔ عزتِ نفس کی جولذت محسوس ہوئی اُسی نے اُسے عمل پر آمادہ کیا۔ ممکن ہے کہ یہ فرد مبلغ بن جائے وہ لوگوں کو اپنی تقریر کے ذریعہ قائل کرے کہ وہ خواہشات کے بت ریزہ ریزہ کر دیں۔ یا پھر وہ اپنی تقریر کے ذریعہ سے لوگوں کو انقلابی اقدام کرنے پر کمر بستہ کرے۔ وہ خواہشات میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو اپنے زورِ تحریر سے ایک نئے انداز میں سوچنے پر تیار کر دے۔ اِس طرزِ تحریر کا ہم جب بھی ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو شخصیات آتی ہیں جنہوں نے اپنی تحریر کے ذریعہ ابراہیمی کردار ادا کرنے کی کوشش کی اور لوگوں کی رغبتوں کے بتوں کو اپنے قلم کی نوک سے ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ دو شخصیات ہیں سید قطبؒ اور سید مودودیؒ۔

اِن دونوں کی تحریر علامہ اقبالؒ کے شعر سے پیدا ہونے والی رغبت کا انقلابی عمل ہے۔ اِن کی کوئی کتاب بھی اُٹھالیں چند صفحات میں ہی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اسلامی روح سے عاری مادہ پرستانہ نظام کے شدید دشمن ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ اُن کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ بُتوں پر کُلہاڑے کی طرح گرے۔ وہ دونوں مفکر حضرت ابراہیمؑ کی طرح انسانی مشاہدے کو اپنی تحریر کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں تاکہ انسان معاشرے کی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک نئی نہج پر سوچے اور بہتر رغبتوں کو جنم دے۔

وہ دونوں اپنی تحریر سے انسانی سوچ کو بدلنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے اِس کا اندازہ فلپائن سے لے کر امریکہ تک اُبھرتی ہوئی اسلامی تحریکوں کی قوت سے لگایا جاسکتا ہے۔ زیادہ تر انقلابی تحریکوں کے پیچھے سید مودودیؒ اور سید قطبؒ کی تحریروں کا اثر ضرور ملے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زبان کے بارے میں ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ انسان کی سب سے پہلے نشو ونما پانے والی دماغی صلاحیت خیال ہے۔یعنی انسان اپنی زبان میں خیال کو جنم دینے کی صلاحیت سب سے پہلے پیدا کرتا ہے۔خیال کے بعد دوسری دماغی صلاحیت ہے زبان۔زبان اوائل عمر سے نشو ونما پانا شروع ہو جاتی ہے اور اُس کی بنیادی صلاحیت دس سے گیارہ برس کی عمر تک پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں۔بشرطیکہ اُس کی تربیت پر توجہ دی جائے۔گیارہ برس کی عمر تک سُننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا سکھانا بہت آسان ہے۔زبان کی اِن چاروں صلاحیتوں پر عبور حاصل کرنا انتہائی سہل ہوتا ہے جو کہ ایک قدرتی امر بن جاتا ہے۔گیارہ برس کی عمر کے بعد زبان پر دسترس حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔وہی کام جو گیارہ برس کی عمر تک فطری طور پر ہو رہے تھے اب اُن کا حصول ایک کٹھن جد وجہد بن جاتا ہے۔

ماہرینِ تعلیم نے زبان کی بارہ اصناف یا اقسام کو شناخت کیا ہے جن پر عبور حاصل کر کے زبان میں وسعت پیدا کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔یہ بارہ اصناف دنیا میں لکھی جانے والی ۹۵ فیصد زبانوں کا احاطہ کرتی ہیں اِن کو سُننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے سے ایک بچے کو زبان پر عبور حاصل ہو جاتا ہے جو ساری زندگی کارآمد رہتا ہے۔وہ بارہ اصناف یہ ہیں۔

ا۔کہانی،۲۔مضمون،۳۔خط،۴۔ڈائری،۵۔آپ بیتی،۶۔روداد،۷۔نظم،۸۔انٹرویو،۹۔ڈرامہ،۱۰۔خبر،۱۱۔اشتہار،۱۲۔تحقیقی مقالہ۔زبان کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ ایک فرد اِن اصناف سے واقف ہو اور اِن میں سے کچھ اصناف لکھنے کے قابل بھی ہو۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ۳

باب ۳: سیکھنا

جسمانی صلاحیت : ورزش اور اُس کی اقسام

خیال اور زبان کے ساتھ ساتھ جسمانی صلاحیت بھی انسانی عمل میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جسمانی قوت کے بغیر انسان اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے قابل نہیں ہوتا۔ کم سے کم جسمانی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے کچھ جسمانی ورزش ضروری ہوتی ہے۔ یہ ورزش جسم کو توانا بناتی ہے۔ جسمانی صلاحیت مشاہدہ سے لے کر خیال تک کی تخلیق میں انسانی نفسیات کے ہر مرحلے کو بہتر کر دیتی ہے۔ جذبات میں توازن لانے کے لیے ورزش کا عمل دخل بہت واضح ہے۔ ڈپریشن اور خوف کی حالت میں تو ورزش کا کردار اور اہم ہو جاتا ہے۔ ورزش کو ہم دو اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جس میں زیادہ سے زیادہ ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے۔ دوسری وہ جس کی بدولت جسم کے توازن اور ہم آہنگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی ورزش دوڑ، چلنا اور تیراکی جیسے اعمال پر مشتمل ہیں۔ اِن کی بدولت ٹانگیں اور کمر مضبوط ہوتی ہیں۔ اِس کے علاوہ زیادہ سے زیادہ ہوا پھیپھڑوں سے ہوتی ہوئی جسم کے مختلف حصوں تک پہنچتی ہے۔ ایسی ورزشوں سے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہوتا ہے سانس پھولتی ہے اور پسینہ آتا ہے۔

دوسری قسم کی ورزش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا عمل نہیں ہوتا۔ یہ پُرسکون قسم کی ورزشیں ہوتی ہیں اِن ورزشوں میں نہ تو دل کی دھڑکن بڑھتی ہے اور نہ ہی سانس پھولتی ہے۔ اِن ورزشوں میں شامل ہیں یوگا جس کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ اِسی قسم کی دوسری کارآمد ورزش تائی چی کہلاتی ہے اور اِس کا تعلق چین سے ہے۔ اِن دونوں ورزشوں میں بہت زیادہ چلنا نہیں پڑتا۔ یہ جسم اور ذہن کا ربط مضبوط کرتی ہیں۔ اِن کی بدولت جسم میں ایک توازن آتا ہے اور ذہن پُرسکون ہو جاتا ہے۔ یہ ورزشیں انسان کے اندر چُھپے ہوئے مثبت جذبات کو ابھارتی ہیں اور منفی خیالات کو گھٹاتی ہیں۔ یوگا اور تائی چی کے خاندان میں ایک اور ورزش کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے تیراندازی۔ یوں تو تیراندازی کی جگہ پستول اور بندوق نے لے لی ہے لیکن تیراندازی بہرحال انسان کے اندر چھپی مثبت قوتوں کو ابھارنے اور جسم کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دماغ کے ساتھ ربط بہتر بنانے میں بہت مددگار ہے۔ اِس کی بدولت انسان میں صبر پیدا ہوتا ہے اور طبیعت کو سکون آتا ہے۔ نماز جہاں انسان کے جذبات کو اعتدال پر لانے کا ذریعہ ہے وہیں نماز میں کی جانے والی جسمانی حرکتیں ہمارے جسم کی طاقت اور صحت کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہیں۔ نماز کو بہتر طریقے سے ادا کرنے کے لیے اُن دونوں اقسام کی ورزشوں کی ضرورت ہے جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ ہم نماز کے ذریعہ کی جانے والی دونوں قسم کی ورزشوں کے اثرات کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

سجدے میں جاتے وقت انسان اپنے گھٹنے موڑتا ہے پھر اپنی ایڑی اُٹھاتا ہے اُس کے بعد وہ اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک کر سجدے میں جاتا ہے۔ اِس سارے عمل میں گھٹنے ٹیکنے تک نمازی کی کمر سیدھی رہنی چاہیئے۔ کمر کا آگے کی طرف جھکنے کا عمل صرف گھٹنے ٹیکنے کے بعد شروع ہونا چاہیئے۔ اسی طرح سجدہ ادا کرنے کے بعد دوبارہ کھڑے ہوتے وقت نمازی سب سے پہلے اپنی کمر سیدھی کرے گا۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے گھٹنے سیدھے کرتا ہوا اپنا پاؤں زمین پر لگائے گا۔ اُوپر اُٹھتے وقت اُس کے پاؤں نیچے جائیں گے اور گھٹنے کھلتے جائیں گے۔ لیکن ایسا کرتے وقت کمر سیدھی رہنی چاہیئے۔

سجدہ میں جاتے وقت اور سجدہ سے واپس کھڑے ہوتے وقت کمر کو بالکل سیدھا رکھنا تقریباً ناممکن ہے اگر پہلی قسم کی ورزش نہ کی گئی ہو۔ یعنی دوڑ، چلنا یا تیراکی کے بغیر انسان کی ٹانگوں اور کمر میں اتنی توانائی نہیں ہوتی کہ وہ کمر کو سیدھا رکھتے ہوئے کھڑا ہو سکے یا بیٹھ سکے۔

اِسی طرح سجدہ کرتے ہوئے انسان بیٹھ جانے کے بعد پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھتا ہے اور پھر اپنی ناک اور اُس کے بعد اپنی پیشانی۔ اِسی طرح سجدے سے اُٹھتے وقت ایک نمازی پہلے ہاتھ اُٹھائے گا پھر پیشانی اور آخر میں ناک۔

یوگا اور تائی چی اِس عمل کو بہتر بنانے میں بہت معاون ہوتی ہیں۔ ہاتھ رکھتے ہوئے پہلے ہتھیلی رکھی جائے گی اور آہستہ آہستہ پورا ہاتھ رکھا جائے گا۔ ایسا کرتے وقت پہلے انگوٹھا زمین سے لگے گا پھر چھوٹی انگلی اُس کے بعد شہادت کی انگلی اور سب سے آخر میں درمیان والی سب سے لمبی انگلی۔ اِسی طرح انگلیاں اُٹھاتے وقت پہلے سب سے لمبی اُنگلی اُٹھے گی اور سب سے آخر میں انگوٹھا۔ پھر نمازی کی پیشانی اور آخر میں ناک۔

یہ سارا عمل ایک نہایت ہی نفیس عمل ہے۔ اِس سارے عمل میں ایک ربط ہے۔ ایک تسلسل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔اِس سارے عمل کے دوران کسی قسم کا جھٹکا یا تیزی نہیں آنی چاہیے۔ بہتے پانی کی سی روانی ہونا ضروری ہے۔نماز میں اِس طرح اپنے جسم کو حرکت دینے کے لیے یوگا اور تائی چی جیسی ورزشیں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔

نماز چونکہ انسانی عبادت کا منتہا ہے اِس لیے اِس کو عمدہ اور نفیس بنانے کے لیے انسانی جسم کا صحیح انداز بہت ضروری ہے۔جسم کی حرکت کو بہتر بنانے کے لیے دونوں قسم کی ورزشیں درکار ہیں اور اگر نماز میں نمازی اپنے جسم کو بتائے ہوئے طریقے کے مطابق حرکت نہ دے سکے تو ظاہر ہے کہ جسمانی صلاحیتیں کمزور ہوگئی ہیں۔آخر میں ہم ایک ایسی ورزش کا ذکر کرتے ہیں جو کسی نہ کسی حد تک دونوں قسم کی ورزشوں کو سموئے ہوئے ہے اور یہ ہے تلوار بازی۔تلوار بازی ایک طرف تو دوڑنے کی طرح دل کی حرکت کو تیز کرتی ہے تو دوسری طرف جسم اور ذہن کے ربط کو مضبوط کرتے ہوئے انسان کو پُرسکون بناتی ہے۔شاید اِسی لیے مسلمان جب تک اچھے تلوار باز رہے اچھے نمازی بھی رہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ٤

باب ۳: سیکھنا

طبی صلاحیت: ٥٠ بنیادی امراض

طب کی بنیادی صلاحیت رکھنا ہر فرد کے لیے ویسے ہی ضروری ہے جیسے لکھنا پڑھنا۔ چونکہ کامیاب زندگی کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تندرست رہنا ضروری ہے۔ اِس لیے طب کے حوالے سے کچھ نہ کچھ صلاحیت چھوٹی عمر سے ہی پیدا کی جانی چاہئے۔ طب کی صلاحیتوں کو ہم تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی تو فوری نوعیت کی بیماریاں ہیں کہ جن میں چوٹوں کا ذکر آتا ہے مثلاً خون کا بہنا، ہڈی کا ٹوٹنا وغیرہ۔ دوسری قسم موسمی اور وبائی امراض کی ہے مثلاً نزلہ، زکام، پیٹ درد وغیرہ۔ اتنی بنیادی طبی مہارت ہونی چاہئے کہ انسان عارضی مرض کی نوعیت کو جانچ سکے۔ دوسری صلاحیت یہ ہے کہ انسان کو احساس ہو جائے کہ کب عارضی مرض Chronic میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مثلاً گھٹنے میں ایک آدھ دن کا درد تو عارضی ہوگا۔ لیکن اگر یہی درد اکثر اور کئی مہینے تک چلے تو مستقل نوعیت کا بن جائے گا جو شاید گنٹھیا کا مرض ہو۔ اسی طرح پیٹ کے اُوپر والے حصے میں کبھی کبھی کا درد تو عارضی ہے لیکن اگر یہی درد مستقل رہنے لگے تو غالباً السر کا درد ہوگا۔ طب کی تیسری صلاحیت ذہنی یا جذباتی مرض کی ابتدائی شناخت ہے۔ آج کے دور میں جسمانی امراض کے حامل لوگوں کی تعداد نفسیاتی امراض رکھنے والے لوگوں سے کم ہے۔ بلکہ بہت سے جسمانی امراض نفسیاتی مسائل کا شاخسانہ ہیں۔ ایسے میں انسان کو نفسیاتی مسائل کی چیدہ چیدہ نشانیوں کی پہچان ہونا ضروری ہے۔ کسی بھی نفسیاتی مسئلہ کی بروقت شناخت سے اُسے بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے نفسیاتی مسائل اگر حد سے بڑھ جائیں تو انسان گہرے کنوئیں میں گر جاتا ہے، جہاں سے نکلنا اُس کے لیے ناممکن ہوگا۔ اِن تین اقسام کی طبی معلومات بنیادی تعلیم کا حصہ ہونا چاہئے تاکہ انسان بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

آخر میں ہم اُن ٥٠ عارضی امراض کی فہرست مہیا کر رہے ہیں کہ جو انسانی امراض کا ٨٠ فیصد ہیں۔ باقی ٢٠ فیصد امراض اصل میں اِن ٨٠ فیصد امراض کی بگڑی ہوئی صورت ہوتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۔یادداشت کی کمزوری
۲۔جذباتی مسائل
۳۔بے خوابی
۴۔دماغی کمزوری
۵۔ سردرد
۶۔چکر
۷۔دردِشقیقہ
۸۔گوہانجنی
۹۔ آنکھ دُکھنا
۱۰۔کان درد
۱۱۔سائی نس
۱۲۔انفلوئنزا
۱۳۔ٹھنڈ،نزلہ،زکام
۱۴۔منہ میں چھالے
۱۵۔مسوڑھوں سے خون آنا
۱۶۔دانت درد
۱۷۔دانت نکلنے کے امراض
۱۸۔ٹانسلز
۱۹۔کان پیڑے (Mumps)
۲۰۔آواز بیٹھنا
۲۱۔کھانسی
۲۲۔نمونیا
۲۳۔دمہ
۲۴۔پیٹ درد
۲۵۔متلی اور قے
۲۶۔ڈائیریا
۲۷۔یرقان
۲۸۔قبض
۲۹۔ تیزابیت
۳۰۔خارش
۳۱۔ایگزیما
۳۲۔چکن پاکس
۳۳۔ڈائپر ریش
۳۴۔پھوڑے، پھنسیاں
۳۵۔کیل، مہاسے
۳۶۔عام بخار
۳۷۔ٹائفائیڈ
۳۸۔خسرہ
۳۹۔ملیریا
۴۰۔درد کے ساتھ ماہواری
۴۱۔رحم کا انفیکشن
۴۲۔لیکوریا
۴۳۔کثرتِ احتلام
۴۴۔نامردگی
۴۵۔پیشاب میں جلن
۴۶۔بستر پر پیشاب کرنا
۴۷۔کمر درد
۴۸۔جسم درد
۴۹۔جسمانی تھکن
۵۰۔چوٹ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ۵

باب ۴ : مشاہدہ

٦ سال میں ۸۰ فی صد

رسول اللہ ﷺ نے مشاہدے کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا ہے۔ قرآن میں انسان کو مشاہدے کی دعوت بہت سی جگہوں پر ملی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشاہدہ کرنا انسان کی بنیادی صلاحیتوں میں سے ایک ہے۔ بلکہ ایک اچھا مشاہدہ انسان کو فطری طور پر تجزیہ اور نتیجہ کی طرف لے جاتا ہے۔ جو کہ آگے چل کر اُسے جذباتی استحکام عطا کرتے ہیں۔ مغربی دنیا نے مشاہدے کی اس اہمیت کو سمجھا اور یہی اُن کی نشاۃِ ثانیہ کا موجب بنا۔ مغرب کے ماہرینِ تعلیم نے اُسے تعلیم کا حصہ بنایا۔ بیسویں صدی کے شروع میں چھ سال سے کم عمر بچوں میں مشاہدہ کی قوت پیدا کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ رجحان اس تحقیق کا نتیجہ تھا جس کے مطابق انسانی ذہن کی ۸۰ فیصد صلاحیتیں ٦ سال کی عمر تک مکمل ہو جاتی ہیں۔ یعنی مشاہدے کی جو قوت ہم آج رکھتے ہیں اُس کا ۸۰ فیصد ٦ سال کی عمر میں پیدا ہو گیا تھا۔

اِس تحقیق کا سہرا اطالوی ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ماریہ مانٹیسوری (Maria Montessori) کے سر جاتا ہے۔ اُنھوں نے پہلی دفعہ بچوں پر سائنسی انداز میں تحقیق کی جس کی بدولت اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ انسان کے اندر دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا بہترین وقت ٦ سال کی عمر سے پہلے کا ہے۔ ماریہ مانٹیسوری نے بچوں میں مشاہدے کی قوت کو جلا بخشنے کے لیے کئی کھلونے متعارف کروائے جو آج مانٹیسوری آپریٹس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ہم یہاں ڈاکٹر ماریہ مانٹیسوری آپریٹس کو ذہن میں رکھ کر کچھ ایسے طریقے پیش کرتے ہیں جن کو عملی جامہ پہنا کر آپ اپنے بچوں کی ذہنی صلاحیتوں میں تین گُنا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اِن سرگرمیوں کی بدولت آپ کے بچے میں اعتماد پیدا ہو گا۔ اُس میں خود سے بات کو سمجھنے اور سوچ کر جواب دینے کی صلاحیت پیدا ہو گی اور وہ برائیوں سے دور رہنے میں کامیاب ہو گا۔ ہم یہ سرگرمیاں پانچوں حواسِ خمسہ کے حوالے سے الگ الگ تحریر کر رہے ہیں۔

چھونے کی حس (ہاتھ) : درجہ حرارت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دیگچی میں چار کپ پانی ڈال کر چولہے پر ایک منٹ کے لیے گرم ہونے کو چڑھا دیں۔ دیگچی کے پاس ہی ۴ خالی گلاس رکھ لیں۔ ایک منٹ پورا ہونے پر ایک گلاس کو پانی سے بھریں۔ ۳۰ سیکنڈ مزید گزرنے پر دوسرا گلاس بھریں اسی طرح تیس تیس سیکنڈ کے وقفے سے تیسرا اور چوتھا گلاس بھی بھر لیں۔ اب بچے سے کہیں کہ وہ پانی کے گلاسوں کو درجۂ حرارت کی ترتیب سے رکھے یعنی سب سے ٹھنڈا سیدھے ہاتھ پر۔ پھر اُلٹے ہاتھ پر اُس سے گرم، پھر اُس سے گرم اور سب سے بائیں ہاتھ پر سب سے گرم۔ ایسا کرنے کے لیے وہ پہلے ہر گلاس کو صرف دو انگلیوں سے چھوئے اگر اُسے فیصلہ کرنے میں دشواری ہو تو دونوں ہاتھوں سے گلاس پکڑ کر محسوس کرے اور اگر پھر بھی فیصلہ نہ ہو سکے تو گلاس میں دو انگلیاں ڈال کر محسوس کرے اِس تجربے کو کرواتے وقت خیال رکھیں کہ بچہ گرم گلاس کو پہلے باہر سے چھو کر محسوس کرے اور دوسری بات یہ کہ گلاس بچے کے سامنے میز پر پڑے ہوں بچہ اُن کو اُٹھائے نہیں۔

چُھونے کی حس (ہاتھ): کُھردرا پن

پانچ مختلف نوعیت کے پتھر اور کپڑے کے ٹکڑے جمع کر لیں۔ پہلے ۵ پتھروں کو بچے کے سامنے رکھ دیں۔ اُسے کہیں کہ وہ دو انگلیوں سے ہر پتھر کی سطح کو محسوس کرے اور پھر سب سے چکنے پتھر کو دائیں ہاتھ پر رکھ دے۔ اِس کے بعد وہ اُس سے زیادہ کُھردرے پتھر کو پہلے پتھر کی بائیں جانب رکھے۔ اِس طرح کرتے کرتے پانچوں پتھروں کو ترتیب سے لگا دے۔ اِس سرگرمی کے بعد بچے کو پانچ مختلف کپڑوں کے ٹکڑے دے دیں اور اُسے یہ کپڑے بھی ویسے ہی ترتیب سے رکھنے کو کہیں۔ آپ کو کپڑے کے یہ ٹکڑے کسی بھی درزی کی کچرے کی ٹوکری سے با آسانی مل سکتے ہیں۔ یہی سرگرمی آپ پتوں اور مختلف قسم کے کاغذ کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں۔

دیکھنے کی حس (آنکھیں): رنگ

بچے کے سامنے ۵ مختلف پتے رکھ دیں۔ اب بچے کو پتے ترتیب سے رکھنے کو کہیں۔ یہ ترتیب ویسی ہی ہو گی، ہلکے رنگ سے گہرے رنگ کی طرف۔ اسی طرح ۴ پانی بھرے گلاسوں میں ایک ہی رنگ مختلف مقداروں میں ڈال کر بھی یہ کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔

دیکھنے کی حس (آنکھیں): مقدار

اب چار گلاسوں میں مختلف مقدار میں چاول ڈال دیں بچوں سے کہیں کہ وہ چاول کی مقدار کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اندازہ کریں اور چاول کو ترتیب سے رکھیں۔ یہی کھیل آپ چاولوں کے چار ڈھیر لگا کر بھی کر سکتے ہیں۔ اگر چاول میسر نہ ہوں تو یہ کھیل ریت بوتلوں میں بھر کر یا ریت کی ڈھیریاں لگا کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

سننے کی حس (کان): مقدار

پانچ بوتلوں میں تھوڑی تھوڑی کنکریاں ڈال دیں۔ بوتلوں کو باہر سے کاغذ کے ساتھ لپیٹ دیں۔ اب بچوں کو ہر بوتل ہلانے کو کہیں۔ انہیں ہدایت کریں کہ وہ آواز سے اندازہ لگائیں کہ کس بوتل میں زیادہ کنکریاں ہیں اور کس میں کم۔ پھر ویسے ہی ان پانچ بوتلوں کو ترتیب سے رکھیں جیسے ہم پچھلی سرگرمیوں میں رکھتے آ رہے ہیں۔

سننے کی حس (کان): خاموشی

بچوں سے کہیں کہ آنکھیں بند کر کے اپنے آس پاس سے آنے والی آوازوں کو پہچانیں اور اُن کے بارے میں بتائیں کہ وہ کہاں سے آ رہی ہیں۔ بچے کو آنکھیں بند کرنے کو کہیں اور پھر مختلف چیزوں کو ٹھونکیں مثلاً کرسی، گلاس، دیوار وغیرہ ہر دفعہ ٹھونکنے کے بعد بچے کو آواز کی شناخت کرنے کو کہیں۔ بہت چھوٹے بچے کو آپ پہلے دکھائیں کہ کس چیز کو ٹھونکنے سے کیسی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی کھیل کسی ایک چیز مثلاً پتھر کو مختلف چیزوں پر رگڑنے سے بھی کھیلا جا سکتا ہے۔

چکھنے کی حس (زبان): حرارت

ہم نے شروع میں گرم پانی کو محسوس کرنے کی سرگرمی بیان کی تھی۔ جب وہی پانی ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو گلاسوں کو گھما پھرا دیں۔ اب بچے سے پانی کو چکھ کر درجۂ حرارت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے کو کہیں۔ یہی کھیل گرم اور ٹھنڈے پانی کو مکس کرنے سے بھی کھیلا جا سکتا ہے یعنی ایک گلاس میں بالکل سادہ پانی ہو۔ ایک گلاس میں یخ ٹھنڈا پانی اور باقی کے دو گلاسوں میں مکس اب بچے سے کہیں کہ وہ اُن گلاسوں کو درجۂ حرارت کی ترتیب سے ویسے ہی رکھے جیسے وہ پہلے گرم پانی کو رکھ چُکا ہے۔

چکھنے کی حس (زبان): ذائقہ

چار گلاسوں میں پانی ڈال کر مختلف مقدار میں نمک ملا دیں۔ اب بچوں کو چکھا کر نمک کی مقدار کی ترتیب سے لگانے کو کہیں۔ یہی کھیل چینی کو پانی میں ملا کر بھی کھیلا جا سکتا ہے۔

آخر میں ہم چار ایسی چیزوں کا ذکر کرنا چاہیں گے جن کی مدد سے ہماری قوتِ مشاہدہ بہت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیزی سے بڑھتی ہے۔اِن میں سب سے پہلے ریت یا مٹی۔بچوں کا ریت یا مٹی سے کھیلنا اُن کی قوتِ مشاہدہ کو تیزی سے بڑھاتا ہے۔بچوں کو ریت میں کھیلنے کے لیے پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے کھلونے دیں۔اُن کے ساتھ بیٹھ کر گھروندے بنانے سے لے کر شکلیں بنانے تک بہت سی سرگرمیاں کریں۔

مشاہدہ بڑھانے میں پانی کا بھی بہت بڑا کردار ہے۔ایک بڑے سے ٹب میں پانی بھر دیں۔اب بچوں کو اس پانی میں چھوٹے چھوٹے کھلونے ڈال دیں۔بچہ اس پانی کے ساتھ گھنٹوں مصروف رہتا ہے۔بہت سی مائیں اس کو وقت کا ضیاع سمجھتی ہیں لیکن یہ اصل میں مشاہدہ بڑھانے کی نہایت موثر مشق ہے۔

اس کے بعد ہم ذکر کرتے ہیں پالتو جانوروں کا۔اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو اپنے گھر میں کوئی ایک پالتو جانور ضرور رکھیں۔اپنے بچے کی دوستی اُس پالتو جانور سے کرائیں۔اُسے جانور کو کھانا کھلانا سکھائیں۔

مشاہدہ بڑھانے میں چوتھا بڑا کردار رنگوں کا ہے۔بچے جتنا رنگوں سے کھیلتے ہیں اُتنا ہی اُن کی قوتِ مشاہدہ بڑھتی ہے۔رنگوں کا یہ کھیل کئی طرح کھیلا جا سکتا ہے۔دو سے تین سال کی عمر کے بچوں کو صرف Crayon دے دیں اُس کے بعد رنگ والی پینسل متعارف کرائیں۔اور پانچ برس کی عمر کے قریب بچوں کو واٹر کلر بھی دے سکتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ٦

باب ۷ : حلقۂ ذہن کی خرابیاں

ہومیو پیتھی، صحت اور نفسیات

ہومیوپیتھی طریقۂ علاج کے موجد ڈاکٹر ہانیمن (Dr.Hahneman) ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ایک نظام وضع کیا اور اپنی زندگی میں ہی اس کو عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ ڈاکٹر ہانیمن نے علاج کا ایک ایسا طریقہ پیش کیا جو مروجہ طریقے سے مختلف نہیں بلکہ متضاد تھا اور پھر اپنی زندگی ہی میں اپنے نظریے کو عملی صورت میں یورپ اور امریکہ میں پھیلانے کے قابل ہو گئے۔

یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر ہانیمن توحید پرست تھے اور اللہ کی ذات پر مکمل یقین رکھتے تھے، شاید اسی وجہ سے اُن کا طریقۂ علاج اسلام اور قرآن کے نظریات سے بہت قریب ہے۔ ڈاکٹر ہانیمن کے اللہ پر یقین کا اندازہ آپ اُس بیان سے لگا سکتے ہیں جو اُنہوں نے بسترِ مرگ پر دیا۔ جب وہ آخری دنوں میں شدید بیمار ہوئے اور درد سے حالت غیر ہوئی تو اُن کی بیوی سے اُن کی حالت دیکھی نہ گئی۔ شدتِ غم میں اُن کی بیوی کے منہ سے نکلا ''خدا آپ کو اتنی تکلیف کیوں دے رہا ہے آپ نے تمام عمر انسانیت کی اتنی خدمت کی ہے''۔ یہ سُن کر ڈاکٹر ہانیمن غصے میں آ گئے۔ اور جواب دیا ''جو میں نے کیا وہ اللہ کی توفیق تھی جو اُس نے مجھے دی۔ میں شکر گزار ہوں اللہ کا کہ اُس نے مجھے یہ توفیق بخشی''۔

قرآن میں ہم پڑھتے ہیں کہ انسان کے کرتوتوں کی وجہ سے بحر و بر اور آسمان میں فساد برپا ہوا ہے۔ تقریباً یہی بات ڈاکٹر ہانیمن نے انسان کی ذات کے حوالے سے کہی۔ اُن کے نزدیک ذہنی اور روحانی فساد، جسمانی بیماریوں کو جنم دیتا ہے۔ بیشتر جسمانی امراض کی جڑ وہ نفسیاتی اور روحانی علت ہوتی ہے جو کسی جسمانی مرض کے نمودار ہونے سے کافی عرصہ پہلے ہمارے دل و دماغ میں پھیلتی رہتی ہے۔ یہ بات بہت سے لوگوں نے کہی ہے لیکن جس تفصیل سے اور سائنسی بنیادوں پر ڈاکٹر ہانیمن نے مختلف جسمانی امراض کا تعلق ذہنی امراض سے جوڑا ہے وہ کام کم از کم ہماری تحقیق کے مطابق کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔

ڈاکٹر ہانیمن کی اِس تحقیق کو آگے بڑھانے میں امریکی ہومیو پیتھک ڈاکٹر کینٹ Kent کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑا ہاتھ ہے۔ڈاکٹر کینٹ ایک ایلوپیتھک ڈاکٹر تھے جو ہومیوپیتھی کی طرف متوجہ ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ہومیوپیتھی میں سند کہلائے۔اُنہوں نے جس انداز سے جسمانی عارضوں کو دماغی عارضوں سے جوڑا ہے وہ اِس کتاب کے قاری کے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اُنہوں نے بتایا کہ ذہن دو کام کرتا ہے ایک تو تجزیہ کرتا ہے اور دوسرا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔تجزیہ کرنے کو اُنہوں نے حق و باطل کو الگ کرنے کا نام دیا۔مشاہدات سے ملنے والی معلومات کچھ حقیقت ہوتی ہیں اور کچھ افسانہ۔سب معلومات پر سو فیصد یقین نہیں کیا جا سکتا۔نتیجہ اخذ کرنے سے بہت پہلے بلکہ تجزیہ شروع کرنے سے بھی پہلے ہمیں جمع کی ہوئی معلومات میں سے سچ اور جھوٹ کو الگ کرنا ہوتا ہے۔

ایسا کرنے کے بعد ہم حقائق کو تو نتیجہ اخذ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔جبکہ غیر حقیقی یا باطل مشاہدات کو حذف کر دیتے ہیں نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ڈاکٹر کینٹ کے مطابق انسان کو تخلیقی صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے جو انسان کی قوتِ ارادی سے نمو پذیر ہوتی ہے جس کے لیے انسان میں قوتِ ارادی اور اعتماد ہونا ضروری ہے۔ڈاکٹر کینٹ کے مطابق مضبوط قوتِ ارادی کے بغیر انسان تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ تجزیہ کرنے کے باوجود فیصلہ نہیں کر پاتا۔

اب یہاں سے ڈاکٹر کینٹ کی معرکہ آرا تخلیق کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ڈاکٹر کینٹ کے مطابق انسانی جسم کے مختلف اندرونی اعضاء بھی کچھ اِسی قسم کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔انسان کے تین اعضاء پھیپھڑے،انتڑیاں اور گردے ہیں۔اب ہم ہر ایک عضو کے کام پر الگ الگ بات کرتے ہیں۔

پھیپھڑے

پھیپھڑے تازہ اور اچھی ہوا کو جسم میں داخل کرتے اور خراب ہوا کو جسم سے خارج کرتے ہیں۔ہوا ناک سے ہوتی ہوئی پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے جہاں وہ مختلف نالیوں میں سے گزرتی ہوئی اِس قابل ہو جاتی ہے کہ خون میں داخل ہو جائے،خون میں داخل ہونے کے بعد یہ ہوا ہمارے جسم کا حصہ بنتی ہے۔

گردے

گردے انسانی جسم میں موجود پانی میں سے فاسد مادے الگ کرتے ہیں۔پانی گردوں میں آکر صاف اور گندے پانی میں تقسیم ہوتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے ہوا پھیپھڑوں میں آکر تقسیم ہو جاتی ہے۔

پھیپھڑوں کی طرح گردوں کا کام پانی کو جمع کرنا نہیں۔ نہ ہی پانی کو استعمال کرنا ہے۔ گردے تو فقط پانی کو ایک طرف سے لیتے ہیں اور صاف پانی کو گندے پانی سے الگ کر دیتے ہیں۔ اُس کے بعد صاف پانی تو جسم کا حصہ بن جاتا ہے جبکہ گندہ پانی پیشاب کے ذریعے خارج ہو جاتا ہے۔ یعنی گردے ایک طرح کا 'واٹر فلٹر پلانٹ' ہیں جن کا کام اچھے پانی کو گندگی سے صاف کرنا ہے۔ گردوں میں داخل ہونے والے پانی کا استعمال گردوں میں نہیں ہوتا وہاں تو صرف وہ صاف ہونے کو آتا ہے اور گردے اپنے اس کام میں اتنے یکتا ہیں کہ یہ پانی کو نہایت مستعدی اور انتہائی باریک بینی سے صاف کر دیتے ہیں۔

انتڑیاں

انتڑیوں کا مقصد خوراک میں سے غذائیت کو الگ کرنا ہے۔ معدے سے خوراک جب انتڑیوں میں داخل ہوتی ہے تو وہ انتہائی باریک ذرات میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ معدہ ایک هاون دستہ ہے جو مختلف اقسام کی خوراک کو تیزاب کی مدد سے پیس ڈالتا ہے لیکن خوراک میں سے مختلف غذائی مادوں کو الگ کرنا معدے کا کام نہیں یہ کام انتڑیاں کرتی ہیں۔ معدے میں پسنے کے بعد جب خوراک انتڑیوں میں داخل ہوتی ہے تو اِس پسے ہوئے مرکب میں سے وہ قوت بخش مادے الگ کئے جاتے ہیں جن کے بغیر ہم صحت مند زندگی نہیں گزار سکتے۔ غذا کے صحت بخش مرکب انتڑیوں میں سے نکل کر خون کا حصہ بن جاتے ہیں اور باقی فضلے کے ذریعے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔ گردوں اور پھیپھڑوں کی طرح انتڑیاں بھی نہ تو کسی چیز کو جمع کرتی ہیں اور نہ ہی یہ اُن کے اندر داخل ہونے والے مواد کی آخری منزل ہوتی ہیں۔

یہ تینوں اعضا صاف، عمدہ اور مفید مواد سے نقصان دہ اور فالتو مادے الگ کرتے ہیں۔ اور وہ مواد اپنی منزل پر پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اِن تینوں میں خرابی کی صورت میں دو باتیں ممکن ہیں۔ یا تو اُن میں داخل ہونے والے مادے وہیں رُک جائیں اور صفائی کا عمل معطل ہو جائے اُس صورت میں اِن اعضا کے اندر داخل ہونے والے مرکبات اپنی منزل پر نہیں پہنچیں گے اور موت واقع ہو جائے گی۔
دوسری صورت میں یہ اعضا صفائی کا کام مناسب طریقے پر سر انجام نہ دیں گے اور اِن میں داخل ہونے والے مرکبات صفائی کے بغیر ہی آگے چلے جائیں گے۔ یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے تو ہمارے جسم میں مختلف قسم کے امراض جنم لیں گے جو آگے چل کر انسان کو موت کے منہ میں دھکیل سکتے ہیں۔ انسانی دماغ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا وہ حصہ جو تجزیہ کرنے کے کام آتا ہے اِسی انداز میں کام کرتا ہے۔ حواسِ خمسہ سے حاصل ہونے والی معلومات یہاں پہنچتی ہیں تو دماغ کا یہ حصہ اُن میں سے سچ اور جھوٹ، حقیقت اور فسانے کو الگ کر دیتا ہے۔ اِس کے بعد سچ اور حقیقت آگے چلے جاتے ہیں اور ہمارے نتائج کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ جھوٹ اور فسانہ ہمارے دماغ سے خارج ہو جاتے ہیں یعنی ہم اُنہیں بھول جاتے ہیں۔ اب اگر تجزیہ کے مرحلے پر معلومات پھنس جائیں تو وہ صاف ہو کر نتائج کی شکل اختیار نہیں کرتیں نتیجتاً ہماری شخصیت کی نشوونما رُک جاتی ہے اور ہم جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یا پھر تجزیہ کے مرحلے پر ہم حق کو باطل سے جُدا نہیں کر پاتے اور تمام معلومات کو سچ جان کر آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اِس صورت میں ہمارے نتائج غلط معلومات پر مبنی ہوتے ہیں جو آگے چل کر ہمارے ذہن کی خرابی کا باعث بنتے ہیں۔

اب ہم چلتے ہیں دماغ کے دوسرے حصے کی طرف جہاں ہم حاصل کی ہوئی معلومات کو نتائج کی شکل دیتے ہیں ہم نے پہلے ذکر کیا کہ نتائج کو حتمی شکل دینا ایک تخلیقی عمل ہے فیصلہ کر لینے کے بعد ہم ایسے نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں جو ہمارے لئے ایک نئی چیز ہوتی ہے۔ جسم میں بھی دو جگہوں پر تخلیق ہوتی ہے۔ ایک جگر اور دوسرے جنسی اعضاء۔

جگر

جگر خون پیدا کرتا ہے۔ جگر میں خون کی پیدائش جگر میں پہنچنے والے مختلف مرکبات کی مدد سے ہوتی ہے۔ یہ تخلیق ایک نئی چیز ہوتی ہے۔ خون کا ہر خلیہ اہمیت رکھتا ہے اور اُس کی تخلیق ہمارے جگر میں ہوتی ہے۔ جگر کی خرابی کی صورت میں خون کی تخلیق رُک جاتی ہے۔ اور انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

جنسی اعضا

جسمانی سطح پر دوسری تخلیق مردوں میں Sperm اور عورتوں میں Egg کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک خاص وقت سے پہلے اپنا وجود نہیں رکھتیں۔ ہوا، خوراک اور پانی ہی ان کو تخلیق کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں لیکن Sperm یا Egg اِن تینوں میں سے کسی ایک سے نہیں ملتے۔

ڈاکٹر کینٹ کی تحقیق کے مطابق دماغی تجزیہ کی کمزور قوت کی صورت میں انسان کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھیپھڑوں، گردوں اور انتڑیوں میں خرابی نمودار ہوتی ہے۔ اِس طرح قوتِ ارادی کی کمی سے انسان میں نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت یا تو کم ہو جاتی ہے یا پھر سرے سے مفقود ہو جاتی ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو انسان کے Sperm یا Egg پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ اِس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی فرد کے پھیپھڑے، گردے یا انتڑیاں متاثر ہوں تو لامحالہ اُس کے دماغ میں تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی متاثر ہو گی۔ اِسی طرح اگر کسی فرد کے جگر یا جنسی اعضاء میں نقص ہو تو یقینی طور پر اُس کی قوتِ ارادی اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں خلل واقع ہو گا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ چونکہ ہومیو پیتھی میں ذہنی امراض کو جسمانی امراض کی جڑ سمجھا جاتا ہے اِس لیے ڈاکٹر کینٹ پھیپھڑے، گردے یا انتڑیوں کی بیماریوں سے متاثر لوگوں کے دماغ کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت کا علاج کرتے تھے۔ جبکہ بانجھ لوگوں اور خون کے عارضے میں مبتلا مریضوں کے فیصلہ کرنے کی دماغی صلاحیت میں اضافہ کرتے تھے۔ اور دماغی عارضوں سے شفاء پاتے ہی لوگ جسمانی عارضوں سے چھٹکارا پا لیتے تھے۔ مثلاً ایک بانجھ فرد کا وہ تفصیلی انٹرویو لیتے اور اُس کی قوتِ ارادی میں کمی کا حساب لگاتے تھے۔ اِس کے بعد وہ ہر دفعہ مریض سے دریافت کرتے تھے کہ اُس کی قوتِ ارادی یعنی فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ قوتِ ارادی کے نارمل ہونے کے ۳ ہفتے کے اندر اندر عام طور پر مریض اپنے بانجھ پن سے چھٹکارا حاصل کر لیتا تھا۔

یہی طریقہ کار پھیپھڑوں، گردوں اور انتڑیوں کے مریضوں کے علاج میں بھی اختیار جاتا تھا۔ ان مریضوں کے متعلق اندازہ لگایا جاتا کہ اُن کی تجزیہ کرنے کی صلاحیت کس قدر کمزور ہو چکی تھی، پھر اُن کو وہ دوائی دی جاتی تھی جس کی مدد سے اُن کے ذہن کی یہ کمزوری دور ہو سکے۔ تجزیہ کرنے کی صلاحیت کے بحال ہونے کے کچھ ہفتے بعد ہی پھیپھڑوں، گردوں یا انتڑیوں کو لاحق امراض بھی ٹھیک ہو جاتے تھے۔

ڈاکٹر کینٹ کا طریقۂ علاج دشوار ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اِس کی اہمیت اُن موذی امراض کے علاج میں تو بہت ہی زیادہ ہے جو کسی بھی قسم کے علاج سے ٹھیک نہ ہو رہے ہوں۔ بدقسمتی سے ایسے ڈاکٹر کم ہیں جو اِس طریقے کو استعمال کرتے ہوں۔ جو ڈاکٹر اس فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے مریض کا علاج کرتے ہیں اُن کی کامیابی کا ریٹ اُن ڈاکٹروں سے کہیں زیادہ ہے جو اِس طریقے پر عمل نہیں کرتے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ۷

باب ۸ : حلقۂ قلب

راجر بیکن سے ڈینیل گولمین تک

مغربی دنیا عیسائیت کے غلاف میں بند ہو چکی تھی یونانی اور رومن تہذیبیں اپنی چکا چوند کھو بیٹھی تھیں۔اور ذہنی پسماندگی نے مغربی ذہن کو نکما کر دیا تھا اِس کی وجہ عیسائیت کے نا قابلِ فہم عقائد تھے۔ہم ذہنی پسماندگی سے مراد مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کے فقدان کو ہی کہیں گے۔ذہن کی یہ تین صلاحیتیں چونکہ انسان کو مفروضہ عقائد ماننے سے روکتی ہیں اِس لیے عیسائیت نے مذہب کے نام پر اُن سے استفادہ کرنے پر پابندی عائد کر دی۔قرآن کے آنے تک اِس پابندی کو کئی سو سال بیت چکے تھے۔قرآن نے آ کر سوچ کا احیاء کیا۔بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ دنیا کو تمام تر مفادات، خواہشات اور خدشات سے بالاتر ہو کر مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنا سکھایا۔

اِس صلاحیت کی بدولت مسلمانوں نے سائنس اور صنعت میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کی اور بامِ عروج پر پہنچ گئے۔عباسی دورِ حکومت میں مسلمان یونانی فلسفے سے متعارف ہوئے۔یونانی فلسفہ مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے کے طریقہ کار سے مختلف تھا، اُن کے یہاں ایک مفروضہ قائم کر کے اُس مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے شواہد کی تلاش کی جاتی تھی۔انسان اگر مفروضہ قائم کر کے نشانیاں تلاش کرلے جن کی مدد سے اُس کے مفروضہ کے سچ ہونے کا ثبوت مل سکے تو لامحالہ اُسے اپنی بات سچی ثابت کرنے کا کچھ نہ کچھ مواد نظر آنا شروع ہو ہی جاتا ہے۔اِسی وجہ سے بہت سا یونانی فلسفہ مفروضوں پر قائم تھا۔دوسرا مسئلہ یونانی فلسفے کا یہ تھا کہ وہ توحید سے عاری تھا۔اُن کے یہاں دیوتاؤں کے دیو مالائی قصوں پر تہذیب کی بنیاد تھی۔اِس لیے اُن کا فلسفہ بھی اُن کے مشرکانہ مذہب کی بنیاد پر کھڑا تھا۔قرآن کے نزول کے تقریباً ۶۰۰ سال کے بعد سے مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کے نتائج کو من و عن تسلیم کرنا شروع کر دیا یعنی اُن کو اپنے مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ کی کسوٹی پر پرکھنا چھوڑ دیا۔ایسا کرتے ہی مسلمانوں کا ذہنی اور فکری زوال شروع ہو گیا۔

دوسری طرف مغرب جہاں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی قرآن کے پیش کردہ دماغی استعمال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے متعارف ہوا۔انہیں پتا چلا کہ کس طرح انسانی دماغ ہر قسم کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر جب سوچتا ہے تو بہتر نتائج اخذ کرتا ہے اور ایسا کرنے سے سائنسی اور صنعتی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔اِس دریافت نے مغرب کی تمام دریافتوں کی بنیاد رکھی۔اس دریافت کا سہرا راجر بیکن Roger Becon نامی سائنس دان کے سر ہے۔راجر بیکن Roger Becon کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔اُس نے مسلمانوں کی کتابوں اور قرآن کے ترجمے کا بغور مطالعہ کیا اور مغرب کو سائنسی سوچ سے متعارف کرایا جو قرآن کے پیش کردہ مشاہدہ، تجزیہ اور نتیجہ کا دوسرا نام ہے۔لیکن چونکہ اُس وقت تک مغرب مذہبی جذبات کی بالادستی سے کافی نقصان اُٹھا چکا تھا اِس لیے دل اور اِس میں موج زن جذبات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔کئی سو سال سے کلیسا لوگوں کا جذباتی استحصال کر کے اپنی دکان چمکا رہا تھا۔وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر لوگوں کو قابو کرنے کے لیے دل کا سہارا لیتا تھا۔اُس کی اپیل سراسر جذباتی ہوتی تھی جس میں سوچ کو کوئی دخل نہ تھا۔راجر بیکن Roger Becon نے قرآن سے دماغی صلاحیت کو بیدار کرنے کا طریقہ لیا اور اُسے دل پر ترجیح دی۔اِس کے بعد مغرب کو احساس ہوا کہ کلیسا نے اُن کے ذہنوں کو دل کی زنجیر میں قید کر رکھا تھا۔اب لازم تھا کہ وہ اپنی سوچ کو دل کی قید سے آزاد کریں۔چونکہ مذہب دل سے وابستہ تھا اور آج بھی ہے۔اِس لیے دل کے خلاف بغاوت جذبات، احساسات اور مذہب غرض ہر چیز کو جو دل سے وابستہ تھی تنکوں کی طرح بہا لے گئی۔نتیجتاً جذبات سے عاری مغربی معاشرے نے سائنس اور صنعت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی شروع کی۔۱۹۰۰ء کے شروع میں تو ذہنی صلاحیتوں کا استعمال اتنی اہمیت کا حامل ہو گیا کہ انسان کی شخصیت میں صلاحیت کو ناپنے کا جو طریقہ کار وضع ہوا وہ کلیتاً دماغی صلاحیتوں کو پرکھتا تھا۔یعنی انسان کی ذات کی قدر و قیمت اُس کے ذہن کی صلاحیت کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔وہ جذباتی طور پر کتنا مستحکم ہے اُس کی سوچ کتنی مثبت ہے اِس بات کی اہمیت قطعی طور پر ختم ہو گئی۔

انسانی شخصیت میں صلاحیت کو ناپنے کے اس طریقہ کار کا نام ہے آئی کیو Intelligence Quotient اِس کی تخلیق کا سہرا ایک فرانسیسی ماہر Binet کے سر ہے۔اُس نے ایسے سوالات ترتیب دیئے جن کا جواب دینے سے اور پھر اُن جوابات کے نتائج کو جانچنے سے کسی بھی فرد کی ذہانت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔دنیا ایک ایسے پیمانے کی تلاش میں تھی جس کی مدد سے لوگوں کو تولا جا سکے۔لہٰذا آئی کیو کا طریقہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔اور یوں انسان نے جذبات کا گلا گھونٹ کر ذہنی صلاحیتوں کو مقدم کر دیا۔۱۹۶۰ء تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس غلطی نے انسان کوایک نئے مسئلہ سے دوچار کیا۔ جذبات کونظرانداز کرنے اور صرف عقل کوانسانی معیار بنالینے کی وجہ سے بے شمار نفسیاتی عارضوں نے جنم لیا۔ جن کے تجزیہ کے لیے American Phychological Association کا وجود عمل میں آیا اور انہوں نے ایک باقاعدہ گائیڈ شائع کی جس میں اُس وقت تک کے تمام ذہنی عارضوں کی تفصیل تھی۔ اس گائیڈ کو DMV کہتے ہیں اور یہ اپنے اندر عجیب وغریب عارضوں کی تفصیلات رکھتی ہے۔ عجیب وغریب اِس لیے کہ جس کواُن میں سے کوئی ایک یاایک سے زیادہ عوارض لاحق ہوں وہ تمام تر ذہنی صلاحیتوں کے باوجود نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ ۱۹۸۰ء تک مغربی دنیاایک عجیب مخمصے کا شکار تھی وہاں بہت سے ذہین لوگ تھے جو دنیا میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے تھے اُن کے پاس زبردست ذہنی صلاحیتیں تھیں انہوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت بے پناہ دولت بھی کمائی لیکن اگر اُن کے ذہن سے ہٹ کر دیکھیں تو وہ شدید قسم کے نفسیاتی عارضوں میں مبتلا تھے۔

اِس سلسلے میں ایک بہت اچھی مثال Howard Hughes نامی صنعت کار کی ہے۔ اگر Howard Hughes کا شمار اس صدی کے ذہین ترین انسانوں میں کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اُس نے ایک ساتھ کئی صنعتوں میں نہ صرف سرمایہ کاری کی بلکہ نئی نئی تحقیقات بھی کیں جن کی بدولت اُس نے بے پناہ دولت کمائی۔ لیکن وہ نفسیاتی عارضوں سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ اُسے یہ وہم ہوگیا کہ کوئی خطرناک بیماری اُسے لگ جائے گی اور وہ مرجائے گا۔ وہ بیماری کے انجانے خوف سے بچنے کے لیے ہر وقت دستانے پہنے رہتا۔ لوگوں سے کم ملتا اور اپنی زندگی کے آخری دور میں تو وہ ایک ہوٹل میں منتقل ہوگیا جہاں اُس کی موت واقع ہوگئی۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ ۱۹۸۰ء تک مغربی دنیا دماغی صلاحیتوں کے استعمال سے ترقی کی اُن بلندیوں پر پہنچ گئی جس کا پہلے کبھی تصور بھی محال تھا۔ لیکن اسی دوران میں جتنے ذہنی عارضے مغرب میں پھیلے ہیں اُس دور سے پہلے اُن کا وجود تک نہ تھا۔ ۱۹۸۰ء تک دس میں سے سات انسان کسی نہ کسی ذہنی عارضے میں مبتلا تھے۔ جبکہ ایسے ایسے Phobias، Syndromes اور Illusions سامنے آئے جن سے پہلے کبھی انسان کو واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ بالآخر ۱۹۸۰ء کے قریب ایک کتاب آئی جس نے پہلی دفعہ یہ مقدمہ پیش کیا کہ انسان کی نفسیاتی صلاحیتیں بھی اتنی ہی اہم ہیں جتنی اُس کی ذہنی صلاحیتیں، اِس کتاب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے مصنف David Goleman نے ایک نئی اصطلاح دریافت کی جس کو انہوں نے Emotional Intelligence(EI) کا نام دیا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے David Goleman نے انسان کے جذبات کے استحکام کو EI سے منسوب کیا یعنی کسی بھی انسان کا EI اُتنا ہی زیادہ ہوگا جتنا اُس کے جذبات میں استحکام ہوگا۔اور انسان اپنی زندگی میں اُتنی ہی ترقی کرے گا جتنا اُس کا EI زیادہ ہوگا۔انسانی جذبات جو پہلے تحقیق کے حصار سے باہر تھے آج اہمیت اختیار کر چکے ہیں اور آج انسان کا EI اس کے IQ سے تین گُنا زیادہ اہم ہوتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ۸

باب ۹ : لذت

روحانی لذت : طریقۂ کار کا فرق

اسلام میں روحانی لذت حاصل کرنے کا طریقہ کار غیر اسلامی طریقوں سے کافی مختلف ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ قطعی مختلف ہے تو بے جا نہ ہوگا اسلام میں روحانی لذت حاصل کرنے کے ذرائع ہمیں قرآن اور سنت سے ملتے ہیں۔ جبکہ غیر اسلامی طریقوں میں یہ ذرائع دو شخصیات سے منسوب ہیں ان میں سے ایک حضرت عیسیٰؑ ہیں جن کی مختصر زندگی کا کوئی خاص ریکارڈ محفوظ نہیں اور جو محفوظ ہے اُس میں بھی بعد والوں نے تحریف کر دی ہے۔ اِس لیے اُس میں روحانی لذت حاصل کرنے کے چند غیر فطری طریقے شامل ہو چکے ہیں۔ دوسری شخصیت مہاتما بدھ ہیں جو دنیا میں روحانی لذت حاصل کرنے کے بیشتر طریقوں کا منبع ہیں۔ روحانی لذت یا سکون حاصل کرنے کی بات ہو اور مہاتما بُدھ کا ذکر نہ آئے یہ ممکن نہیں۔ دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مہاتما بُدھ کا پیروکار ہے۔ اُس کے علاوہ مغربی نفسیات کے گرو بھی مہاتما بدھ سے متاثر ہوئے ہیں۔

مہاتما بدھ حقیقت کی تلاش میں جوانی میں اپنا محل چھوڑ گئے اور ایک عرصے تک دنیاوی لذتوں کے خلاف جنگل میں جنگ کرتے رہے۔ بالآخر برسوں کی تلاش کے بعد اُن کو حقیقت کا ادراک ہوگیا۔ اب اِس ادراک میں اللہ کی ذات سے شناسائی بھی شامل تھی یا نہیں اس کا جواب اثبات میں تو نہیں ملتا اور نہ ہی کوئی آسمانی صحیفہ اُن سے منسوب ہے۔ اِس ادراک کے بعد جب وہ واپس اپنے محل میں آئے تو ان کے والدین اور بیوی نے اُن کی شخصیت کے اس نئے روپ کو تسلیم کیا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے بعد بھی اُنہوں نے اپنی خاندانی ذمہ داریاں نہ نبھائیں اور آبادی سے دور رہبانیت کی زندگی اپنالی۔ اِس کے برعکس اللہ کے آخری نبی ﷺ نے غارِ حرا میں ایک عرصے تک حق کی تلاش میں وقت گزارا۔ جہاں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ آپ اِس حق شناسی کے بعد پہاڑ سے نیچے اُتر کر اپنے خاندان کے پاس آئے جہاں اُنہیں ویسی پذیرائی نہ ملی جیسی گوتم بُدھ کو ملی تھی بلکہ اُلٹا اُن کے خاندان کے لوگ اُن کی جان کے درپے ہو گئے اِس کے باوجود آپ لوٹ کر دوبارہ غارِ حرا کو نہ گئے، بلکہ مکہ میں رہ کر ہی حالات کا مقابلہ کیا۔ اور یہی فرق اسلام میں تلاشِ سکون کے رستے کو دوسرے تمام رستوں سے جُدا کرتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مندرجہ ذیل چارٹ میں یہ فرق واضح کیا گیا ہے۔

غیر اسلام

☆ غیر اسلامی لذت یا تو مکمل طور پر عبادت گاہ میں آبادی سے دور رہنے سے ملتی ہے یا پھر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور آپ یہ لذت گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔

☆ بعض فرقوں میں شادی کی مکمل ممانعت ہے جبکہ بعض جنسی لذت کے کسی بھی طریقے کو بُرا نہیں سمجھتے۔

☆ سکون حاصل کرنے کے لیے ایک خاص ماحول اور لباس کی ضرورت ہے جو کہ ہر جگہ میسر نہیں۔ اس کے لیے بعض اوقات لمبا سفر کر کے ایک مخصوص مقام تک پہنچنا پڑتا ہے۔

☆ اچھی خوراک اور لباس حرام ہو گئے۔ صرف مخصوص خوراک مخصوص مواقع پر ہی کھائی جا سکتی ہے۔

☆ لذت لوگوں سے دور خود میں ڈوبنے کا نام ہے جس میں کسی بھی قسم کی عملی جدوجہد کا نشان نہیں ملتا۔

☆ یا تو چہرہ بالوں کے بالکل بغیر یعنی کلین شیو ہو یا پھر سارے چہرے کے بال بڑھے ہوں یعنی داڑھی اور مونچھ دونوں۔

اسلام

☆ اسلام میں کچھ عبادت مسجد میں اور کچھ گھر میں کرنے کا حکم ہے۔ ایک طرف تو اللہ کے رسول ﷺ نے سختی سے نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا جبکہ دوسری طرف نوافل گھر میں ادا کرنے کو کہا۔ آپ کا قول ہے۔ ''اپنے گھروں کو مردہ خانہ نہ بناؤ'' یعنی فرض کے علاوہ نفلی نمازیں گھر میں پڑھو۔

☆ اسلام میں چار شادیوں تک کی اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان بیٹھ کر لذت محسوس کرتے تھے۔ دوسری طرف عورتوں سے خبردار رہنے کو بھی کہا گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے رسول اللہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ﷺ ایک دفعہ بیویوں سے الگ ہو بیٹھے تھے۔

☆ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے پوری زمین مسجد بنادی۔آپ کہیں بھی نماز ادا کر سکتے ہیں اِس لیے اسلام کے پیروکاروں کے لیے زندگی میں ایک دفعہ حج کرنا فرض ہوگیا۔مکہ میں حج پر جانے سے ایک خاص روحانی لذت ملتی ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں بھی اعتدال کی ہدایت کی انہوں نے روزہ بھی رکھا اور اچھی خوراک کے میسر آنے پر اس سے لطف اندوز بھی ہوئے۔

☆ لوگوں کی خدمت کو روحانی لذت کا ذریعہ قرار دیا گیا۔جہاد روحانی لذت حاصل کرنے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ قرار پایا جس میں عملی جدوجہد کرتے کرتے انسان اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔

☆ داڑھی بڑی ہو اور مونچھیں چھوٹی لیکن چہرے اور سر کے بال ترتیب سے ہوں کنگھی کی گئی ہو اور ایک سلیقہ نظر آئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ۹

باب ۱۴:ترغیبات

عیسائیت: پال Paul کی رغبت

حضرت عیسیٰؑ کے آنے تک یہودی قوم نہ صرف رومی حکومت کے زیرِ اثر آ چکی تھی بلکہ وہ اِس مشرک قوم کی ثقافت بھی اپنا چکی تھی۔ اپنی بقاء کے لیے کسی طاقتور تہذیب کو اپنا لینا ہمیشہ سے ہی بزدل قوموں کا شیوہ رہا ہے۔ یہودی قوم کے رہنما جن میں مذہبی پیشوا بھی شامل تھے رومیوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں کسی طرح پیچھے نہیں رہتے تھے۔ رتبہ کی رغبت میں پیچیدگی یہ ہے کہ انسان کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب اُس کی یہ رغبت خشیّ الرحمٰن کی جڑ سے الگ ہوگئی ہے۔ جب تک رتبہ کی رغبت اللہ کے لیے ہوتی ہے انسان کو عزت میں لذت ملتی ہے اور نہ ہی ذلت کا ڈر ہوتا ہے۔ انسان رتبہ صرف اللہ سے چاہتا ہے۔ لیکن انسان میں رتبے کی رغبت پیدا ہوتے ہی 'ضرورت' 'تقاضا' 'مجبوری' اور 'عوامی مفاد' جیسے الفاظ اعمال کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ مذہبی پیشوا جس شدت سے رتبے کی رغبت میں اِس تبدیلی کا شکار ہوتے ہیں کوئی اور نہیں ہوتا۔ اُنہیں رتبہ اللہ سے چاہیے ہوتا ہے اور وہ کام لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات اُنہیں خود بھی پتا نہیں چلتا کہ کب وہ کام کے ساتھ ساتھ رتبہ بھی لوگوں ہی سے چاہنے لگ جاتے ہیں۔ رومی غلامی کے دور میں یہودی قوم کے مذہبی پیشوا اِسی صورتِ حال کا شکار تھے۔ مثلاً زنا کو ہی لیجیے رومی سلطنت میں زنا عام تھا اور اُسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اِس لیے یہی مرض یہودیوں میں بھی آ گیا۔ یہودی مذہبی پیشوا رومی عتاب کے خوف اور اُن کا مقام اور رتبہ چھن جانے کے ڈر سے اِس بارے میں کچھ نہ بولتے اور اپنی قوم میں پھیلے اِس مرض سے آنکھیں بند کیے رکھتے۔

انہی حالات میں اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو بھیجا۔ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے وقت یہودی قوم تین اہم رغبتوں کا شکار ہو چکی تھی۔ جسمانی لذت، مال اور رتبہ۔ اِن تینوں رغبتوں کی جڑیں بہت دور تک پھیل چکی تھیں۔ اِن کی وجہ سے یہودی قوم میں طرح طرح کی برائیاں در آئی تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے اِن برائیوں کے خلاف آواز بلند کی تو یہودی مذہبی پیشوا اور دوسرے لوگ جو رومی حکومت میں کوئی رتبہ رکھتے تھے حکمرانوں کو خوش کرنے اور اپنی قدر و منزلت بڑھانے کی خاطر حضرت عیسیٰؑ کی جان کے درپے ہو گئے۔ اِس دوران اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو اُوپر اُٹھا لیا۔ دمشق اُس وقت رومی سلطنت کا ایک اہم شہر تھا جہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہودیوں کی بھی کثیر آبادی رہتی تھی یہ یہودی رومی سلطنت کے قریب ہونے کی وجہ سے نہ صرف اثر ورسوخ میں فلسطینی یہودیوں سے آگے تھے بلکہ رومی طرز زندگی کو بھی زیادہ شدت سے اپنائے ہوئے تھے۔

حضرت عیسیٰؑ کی آواز دمشق پہنچی تو وہاں کے ربّائی اعظم نے ایک قابل نوجوان کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ یروشلم جائے اور رومی فوج کی مدد سے اُس باغی کے ساتھیوں کا سر کچل دے۔ اِس خدمت کے بدلے، اُس نوجوان کو اعلیٰ رتبے کا وعدہ ملا۔ لیکن اُس سے بھی اہم ترغیب یہ تھی کہ ربّائِ اعظم اپنی خوبصورت بیٹی اُس نوجوان کے عقد میں دے دے گا۔ اُس باصلاحیت نوجوان کا نام تھا پال Paul۔ ربائِ اعظم کی طرف سے کئے گئے دونوں وعدوں میں سے پال Paul کے لیے عورت کا وعدہ اُس وقت بہت اہم ہوگیا جب اُس نے ربّائِ اعظم کی بیٹی کے حسن کا جلوہ دیکھا۔ یہاں سے پال Paul کے دل میں عورت کی رغبت شدید طریقے سے پیدا ہوگئی۔ جسے پورا کرنے کے لیے پال کو صرف ایک عمل کرنا تھا اور وہ تھا یروشلم کے باغی عیسیٰؑ کے ساتھیوں کا خاتمہ۔ پال Paul دل میں عورت کی رغبت کو سموئے یروشلم پہنچا اور رومی فوج کے ساتھ مل کر حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ پال Paul چاہتا تھا کہ اِس بغاوت سے جلد سے جلد جان چھڑائی جائے تاکہ وہ عورت کی رغبت کو پورا کر سکے۔ اُس نے رومی فوج کو مشورہ دیا کہ باغی کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ فلسطین کے رومی گورنر نے پال Paul کا مشورہ فوری طور پر ماننے سے انکار کردیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں باغی کے ساتھی مرکرامر نہ ہوجائیں اور کہیں اُس باغی کے پیروکار اُن کی موت پر پہلے سے زیادہ تیزی سے بڑھنے شروع نہ ہوجائیں۔ پال Paul اِس مہم کے سلسلے میں اپنے وقت کا بڑا حصہ یروشلم میں گزارتا۔ کچھ مہینے بعد وہ دمشق واپس جاتا جہاں وہ اپنی ہونے والی بیوی سے ملتا۔ یہ ملاقات اُس کے دل میں رغبت کو اور طاقتور کردیتی۔ وہ اور قوت کے ساتھ جلد از جلد بغاوت کو کچلنے کے ارادے سے واپس یروشلم پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ آخرکار اُس نے اپنی منگیتر سے وعدہ کیا کہ اِس دفعہ وہ واپس جاکر رومی گورنر کو قائل کرلے گا کہ وہ باغی کے ساتھیوں کو پھانسی دے دیں تاکہ وہ واپس آکر ربّائِ اعظم سے بیٹی کی شادی کا وعدہ پورا کرواسکے۔ پال Paul کا مشن کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا اِس دفعہ اُس نے یروشلم میں کئی مہینے گزارے وہ خوش وخرم واپس دمشق پہنچا۔ دمشق پہنچ کر وہ سیدھا ربّائی اعظم کے گھر گیا۔ یہ جان کر اُس کی حیرت اور غصے کی انتہا نہ رہی کہ اُس کی منگیتر ایک رومی جرنیل سے بیاہ کرجا چکی تھی۔ یہ سب کچھ ربّائی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لڑکی کی رضامندی سے ہوا تھا اور ربّائی کو اِس وعدہ خلافی پر کوئی افسوس نہ تھا۔ پال Paul عورت کی رغبت سے پیدا ہونے والے شدید غم میں ربّائی اعظم کے گھر سے نکلا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا۔ دمشق کے تمام معززین پال Paul کو بھول چکے تھے۔ کیونکہ اُنہیں اُس کی ضرورت نہیں تھی۔

پال Paul کی عورت کی رغبت پوری نہ ہونے کی وجہ سے دشمن کی رغبت پیدا ہوگئی۔ اُس نے تمام لوگوں کے خلاف دشمن کی رغبت پیدا کر لی جنہوں نے اُس کی عورت کی رغبت پوری نہ ہونے دی تھی۔ اِس عالم میں پال دمشق سے نکلا اور واپس یروشلم کے راستے پر ہولیا۔ اِس سے آگے جو ہوا اُس سے پہلے رغبتوں کی اچانک تبدیلی یا جذبات سے پیدا ہونے والے اثرات کے بارے میں کچھ تفصیل۔

رغبتوں کی اچانک پیدائش یا موت اور جذبات کی شدت میں اچانک اضافہ انسان کے دل میں طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ بلڈ پریشر میں شدید تبدیلی آ جاتی ہے۔ انسان کے ہارمونز ہیجان کا شکار ہو کر منہ کھول دیتے ہیں اِن ہارمونز میں سے نکلنے والا مواد انسان کی پوری طبعی حالت کو متاثر کرتا ہے۔ دل میں یہ تبدیلی انسان کو بہت سے ایسے اعمال کرنے پر اُکساتی ہے جس کا وہ نارمل حالت میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ انسان اِس حالت میں شدید ردِعمل کا مظاہرہ کرتا ہے اُس کی آنکھیں باہر کو آ جاتی ہیں۔ جسم تن جاتا ہے اور آواز بے قابو ہو جاتی ہے۔ یا پھر وہ نڈھال ہو کر گر جاتا ہے۔ کسی سے آنکھ نہیں ملاتا اور سسکیاں لیتا ہے۔ ایک بات دونوں کیفیات میں مشترک ہوتی ہے۔ انسان کے خیالات اور تصورات میں تیزی آ جاتی ہے۔ وہم پیدا ہوتے ہیں۔ وسوسے جنم لیتے ہیں انسان کو ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو اُس نے کبھی نہیں دیکھے ہوتے۔ وہ جنوں، چڑیلوں کی آوازیں سُننے لگتا ہے۔ کبھی اُسے لگتا ہے کہ وہ خدا کے قریب ہو گیا ہے۔ کبھی اُسے محسوس ہوتا ہے کہ شیطان اُس کے قریب آ گیا ہے۔ ایسی ہی کیفیات پال Paul پر طاری ہو گئیں۔

وہ واپس یروشلم پہنچا اور حضرت عیسیٰؑ کے بچے کھچے حواریوں کو ڈھونڈتا ہوا ایک تہہ خانے میں پہنچ گیا جہاں اُنہوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اِن حواریوں میں سے بارنابس Barnabas اور پیٹر Peter قابلِ ذکر ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے بچ جانے والے قریب ترین حواریوں میں سے تھے۔ پال Paul جیسے کٹر دشمن کو دیکھ کر یہ حواری ڈر گئے۔ پال Paul نے اُنہیں تسلی دی اور ایک عجیب بات کہی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُس نے اُنہیں بتایا کہ دمشق سے یروشلم کے راستے میں حضرت عیسیٰؑ اُس کے خواب میں آئے تھے۔ اور اب وہ بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ پال Paul کا یہ دعویٰ سُن کر حواری حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوئے۔ پال Paul جیسے دشمن کا اچانک حمایتی بن جانا ناقابلِ یقین تھا۔ پال Paul نے حواریوں کے ساتھ مل کر حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا بھرپور پرچار کرنے کا اعلان کیا۔ چونکہ وہ رومی حکومت سے قریب تھا اِس لیے اُس نے حواریوں کو بتایا کہ اب وہ رومیوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا پرچار کرے گا۔ غریب حواری چونکہ صاحبِ حیثیت نہ تھے، اِس لیے انہوں نے اپنے علاقے کے غریب عوام تک ہی حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ پال Paul حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو لے کر اُن رومیوں کے پاس گیا جن کے ساتھ مل کر وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کا قلع قمع کرنے میں مشغول تھا۔ لیکن اُس نے رومیوں کو جو بتایا وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے بالکل مختلف تھا۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ نے سور کھانے کی اجازت کبھی نہیں دی تھی۔ وہ پہلے سے ہی شریعتِ موسیٰؑ کے مطابق حرام تھا۔ پال Paul نے رومیوں سے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ نے خود اُسے بتایا تھا کہ سور کھانا حرام نہیں۔ یوں پال Paul نے وہ تمام تبدیلیاں کر دیں جو رومیوں کو پسند تھیں اور انہیں نئے مذہب سے قریب لانے کے لیے ضروری تھیں۔ رفتہ رفتہ رومی پال Paul کی تعلیمات سے متاثر ہو کر عیسائیت قبول کرنے لگے۔ دوسری طرف بارنابس Barnabas اور پیٹر Peter حضرت عیسیٰ کی صحیح تعلیمات کو عام کر رہے تھے جن کے مطابق سور حرام تھا۔ اللہ کے ایک ہونے پر ایمان تھا اور سب سے اہم یہ کہ اِن تعلیمات کے مطابق لوگوں کو ایک ہادیٔ برحق کا انتظار کرنا تھا جو حضرت عیسیٰؑ کے کام کو مکمل کرنے کے لیے کچھ عرصہ بعد آنے والا تھا۔

پال Paul نے رفتہ رفتہ رومیوں کو عیسائی بنا کر عیسائی یہودی دشمنی کی بنیاد رکھ دی۔ عیسائی مذہب کو یہودی تعلیمات سے جدا کر دیا۔ اور ایک نئے مذہب کا ڈول ڈال دیا۔ اُس کا تصنیف کردہ نیا مذہب شمال کی سمت پھیلنا شروع ہو گیا۔ یہ مذہب ترکی کے شہر قسطنطنیہ سے ہوتا ہوا روم اور پیرس جا پہنچا، دوسری طرف حضرت عیسیٰؑ کے حواری اپنے پیغام کو لے کر شمالی افریقہ میں وارد ہوئے۔ جہاں اُن کی تعلیمات مصر سے ہوتی ہوئی افریقہ کے اُن ممالک میں پھیل گئیں جو آج بالائی افریقہ ہے۔ تقریباً چھ سو سال بعد رسول اللہ حضرت محمد ﷺ تشریف لے آئے اور وہ تمام علاقے جہاں پر بارنابس Barnabas

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور پیٹر Peter نے چھ صدیاں پہلے تبلیغ کی تھی اور ہادئ برحق کے انتظار میں تھے مسلمان ہو گئے۔ جب کہ پورا یورپ جو پال Paul کے بنائے ہوئے عیسائی مذہب کا پیرو کار بن چکا تھا رسولِ عربی ﷺ کا دشمن بن گیا۔ تاریخ میں اتنی بڑی تبدیلی جس کی بنیاد پر تاریخ کی آخری جنگ ''الملحمتہ العظمہ'' The Armagadon ابھی لڑی جانی ہے پال Paul کی عورت کی رغبت کے باعث پیدا ہونے والے غم کی وجہ سے لڑی جائے گی، یا اِس کی وجہ پال Paul کے دل میں یہودی قوم کی دشمنی کی رغبت ہوگی؟ شاید ہم کبھی بھی اِس سوال کا جواب نہ دے سکیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضمیمہ ۱۰

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۲۰ : انسانی ماڈل کے محرکات

بلیک ہول

کھجور کے درخت کا ماڈل ہمیں کائنات میں ایک اور جگہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بلیک ہول Black Hole اپنی شکل وشباہت میں تقریباً کھجور کے درخت سے مشابہ ہے۔ کھجور کے درخت کی طرح بلیک ہول میں بھی دو نظام کام کر رہے ہیں۔ کھجور کے درخت میں ایک سسٹم تنے، شاخ اور پتے کو یکجا کرنے سے بنتا ہے۔ دوسرا سسٹم جڑوں کا ہے جہاں سے پانی اور معدنیات جمع ہو کر اُوپر کی طرف بڑھتے ہیں۔ بلیک ہول کا ایک حصہ تو درخت کے تنے کی طرح لمبوترا اور ٹھوس ہوتا ہے۔ پھر اِس کے اُوپر طشتری کی طرح کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ بلیک ہول اِس طشتری والی سطح سے جسے Event Horizon کہتے ہیں روشنی اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ روشنی یا کوئی اور مادہ Event Horizon سے ٹکرانے کے بعد واپس نہیں مڑ سکتا۔ فرض کریں کہ ایک خلاباز بلیک ہول کے Event Horizon کے پاس جائے اور پھر ریورس گیئر لگا کر اُس سے دور ہونا چاہے تو وہ ایسا کرنے میں ناکام ہوگا۔ اُس کا خلائی جہاز بلیک ہول کے Event Horizon کی طرف کھنچتا ہی چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ خلائی جہاز کو بلیک ہول اپنے اندر جذب کر لے گا۔

Event Horizon سے اندر داخل ہونے کے بعد Spaceship کی کیا صورت ہوگی یہ کوئی نہیں جانتا۔ کیونکہ بلیک ہول کی انتہائی شدید کششِ ثقل سے بچ کر آج تک کوئی چیز واپس نہیں آئی۔ یہاں تک کہ روشنی بھی بلیک ہول کی کششِ ثقل سے محفوظ نہیں۔ روشنی بلیک ہول کی طرف یوں کھنچ جاتی ہے جیسے سوئی کسی طاقتور مقناطیس کی طرف۔ جیسے جیسے خلا میں گھومتے اجسام بلیک ہول کے Event Horizon سے ہوتے ہوئے اُس کے تنے میں داخل ہوتے جاتے ہیں بلیک ہول کا تنا لمبائی میں بڑھتا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ ساتھ بلیک ہول کا Event Horizon بھی چاروں طرف دائرے کی صورت میں پھیلتا جاتا ہے۔ بلیک ہول کے نیچے کی طرف جہاں پر تنا ختم ہوتا ہے ایک ستارہ بلیک ہول کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ ستارہ بلیک ہول کا حصہ ہے۔ یہ ستارہ چمک دار ہوتا ہے جبکہ بلیک ہول سیاہ ہے اصل میں بلیک ہول روشنی کو اپنے اندر جذب کرنے کی وجہ سے تاریکی میں چھپ جاتا ہے جبکہ اُس سے منسلک ستارہ روشن رہتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلیک ہول اوراُس سے ملحقہ ستارہ اپنی ساخت اور مزاج میں بہت مختلف ہیں لیکن یہ جڑواں ہیں یہ دونوں مل کر کھجور کے تنے اور جڑ کی طرح ایک نظام بناتے ہیں۔اور اگر اسی طرز پر انسان کے بارے میں سوچا جائے تو ذہن اور قلب مل کر ایک جڑواں نظام بناتے ہیں۔ یہ جڑواں نظام ہی اپنے اندر تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے۔درخت کا جڑواں نظام Binary System پھل کو جنم دیتا ہے۔جبکہ انسان کا جڑواں نظام عمل کو۔انسان ابھی تک بلیک ہول کے جڑواں نظام کے عمل سے ناواقف ہے۔لیکن انسان اور درخت کے جڑواں نظاموں کو ذہن میں رکھ کر سوچا جائے تو بلیک ہول کے جڑواں نظام کا بھی کوئی مفید مصرف ہونا چاہیے۔مزید تحقیق سے کائنات میں بلیک ہول کے عمل پر نئی باتیں دریافت ہوں گی۔کھجور کے درخت کا جڑواں نظام ہمیشہ توازن میں رہتا ہے۔اسی طرح بلیک ہول کا توازن ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔یعنی یہ دونوں ہمیشہ حالتِ اطاعت میں رہتے ہیں۔بالکل ویسے ہی جیسے انسان سجدے کی حالت میں رہتا ہے۔

سورۃ رحمٰن میں درختوں اور ستاروں کے حالتِ سجدہ میں ہونے سے یہی دو نظام مراد ہیں جو ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں اور ہمیشہ توازن میں رہتے ہیں۔اِس سے پہلی آیت میں چاند اور سورج کے مدار میں چلنے کا ذکر ہے۔یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اجرامِ فلکی یا تو مدار میں گردش کرتے ہیں یا پھر وہ جڑواں نظام پر مبنی ہیں۔سمندر، پہاڑ یا زمیں غرض کسی بھی چیز کو دیکھیں وہ یا تو ایک دائرے کا حصہ محسوس ہوں گے یا پھر جڑواں نظام کا مثلاً پہاڑ زیرِ زمین ایک جڑ رکھتا ہے جس کی مدد سے یہ زمین پر میخ کی طرح ٹھُکا ہوا ہے۔جبکہ دریا گردش میں ہے۔سمندر سے پانی اُٹھتا ہے، پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے اور دریا وہ پانی سمندر تک پہنچا دیتا ہے۔انسانی تاریخ بھی گردش میں ہے۔واقعات اور حادثات ایک دائرے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com